اُن مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی معاشرے میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔

غلامانِ اسلام

تالیف:

مولانا سعید احمدؒ

BEACON

غلامانِ اسلام

اُن مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات وفضائل بڑی تحقیق وجستجو سے یکجا کیے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی معاشرے میں عظمت واقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔

تالیف: مولانا سعید احمد

بِیکن بُکس

BEACON BOOKS

• غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37320030

• گلگشت کالونی، ملتان فون: 061-6520790-6520791

E-mail:info@beaconbooks.com.pk

Web: www.beaconbooks.com.pk

اشاعت : 2010ء

عبدالجبار نے
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/390 روپے

ISBN : 978 - 969 - 534 - 173 - 5

انتساب

ان مقدس، پاکیزہ روحوں کے نام جن میں سے ہر ایک
زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرّۂ آفتاب تابانیم

فہرست

مقدمہ	13
اسلام میں غلامی کا تصور	13
آزاد کردہ غلام کی حیثیت	14
ولاء کا تعلق	15
آزاد کردہ غلام کے مدنی حقوق	15
قیادتِ لشکر	16
امامت	16
شادی	17
حفظِ ناموس	18
تحصیل علم وفضل	19

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

حضرت بلالِ بن رَبَاح رضی اللہ تعالیٰ عنہ	25
حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ	28
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	32
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	40
حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ	51

حضرت سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ	60
حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ	63
حضرت اَبُو فُکَیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	64
حضرت عامر بن فُہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	65
حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ	68
حضرت شقران صالح رضی اللہ تعالیٰ عنہ	71
حضرت خبّاب بن اَرَت رضی اللہ تعالیٰ عنہ	72
حضرت خباب مولائے عتبہ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ	76
حضرت خباب مولائے فاطمہ بنت عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	77
حضرت ابو کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	77
حضرت زید بن بولی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	78
حضرت زید الدیلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	78
حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	78
حضرت ابورافع ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	84
حضرت نافع بن کاؤس رضی اللہ تعالیٰ عنہ	84

تابعین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

سعید بن جبیرؒ	88
سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	101
حضرت مجاہد بن جبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	104
عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	108
طاؤس بن کیسانؒ	116
سلیمان بن مہرانؒ (اعمش)	124

ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	131
حضرت مکحول الدمشقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	138
منصور بن زاذان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	142
میمون بن مہران رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	145
سلمہ بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	149
عبداللہ بن عون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	153
عمرو بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	160
سلیمان بن طرخان تیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	164
حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	167
محمد بن سیرین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	174
ابو العالیۃ الریاحی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	180
عطاء بن یسار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	185
ابوبکر بن عیاش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	187
زید بن اسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	189
یزید بن ابی حبیب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	192
ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	195
ربیعۃ الرائ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	197
محمد بن عجلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	205
محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ	207

اتباعِ تابعینؒ وغیرہم

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 215
محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 232
سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 243
یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 249
یحییٰ بن ابی زائدہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 256
یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 260
یزید بن ہارون السلمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 271
لیث بن سعد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 278
عبداللہ بن وہب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 286
عبدالرحمٰن بن مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 291
ولید بن مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 301
حماد بن زید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 304
ابن جریج القرشی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 307
علی بن مسہر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 311
ابو معشر السندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 313
عبدالعزیز بن عبداللہ الماجشون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 315
علی بن المدینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 320
محمد بن یحییٰ الذہلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 328
ابو محمد یحییٰ بن یحییٰ اللیثی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 335
محمد بن عمر الواقدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 339

محمد بن سعد الزہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 349

قتیبہ بن سعید الثقفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 351

ابوزرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 355

شعبۃ بن الحجاج بن الورد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 365

اسماعیل بن علیۃ الہروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 376

یحیٰی بن محمد بن صاعد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 383

ارباب کشف وکرامات اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ

ابویحییٰ مالک بن دینار البصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 387

ابومحفوظ معروف بن فیروز الکرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 395

ابوبشر صالح بن بشیر المری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 405

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 410

علماء شعروادب

ابودلامۃ زند بن الجون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 422

احمد بن محمد بن عبد ربہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 431

ابوعبداللہ یاقوت الحموی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 438

ابوالدُّر یاقوت بن عبد اللہ الرومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ 447

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اسلام کی تاریخ اور اس کے اولین معاشرتی نظام کے حوالہ سے ''غلامی'' کا عنوان بڑا اہم ہے۔ اس لیے کہ اسلام پر تحقیق کرنے والے غیر مسلم محققین نے غلام و باندیوں کے مسئلہ کو سہارا بنا کر اسلام پر اعتراضات کرنے اور اس کے منفی تعارف کرانے کی راہ نکالی اور اب کے حالات میں جبکہ اسلامی لٹریچر کے سنجیدہ مطالعہ کا فقدان ہوتا چلا جا رہا ہے، اس موضوع کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے کیونکہ خود مسلمان طلبۂ علم کو اس مسئلہ پر پریشانی میں مبتلا دیکھا جاتا ہے صحیح راہنمائی اور مسئلہ کی صحیح تفہیم نہ ملنے کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں شاید واقعی غلام و باندی کا تصور اسلام فلسفۂ زندگی کا کوئی نقص ہے۔

حالانکہ حقیقت یوں ہے کہ غلام و باندی کا مسئلہ اسلام کو قبل از اسلام کے معاشرہ سے وراثت میں ملا اور اسلام نے اسے حل کیا، انسانوں کا وہ طبقہ جسے اسلام سے پہلے جمادات کے درجہ پر رکھا جاتا رہا اسلام نے اسے انسانی حقوق عطا کیئے۔ انہیں معاشرہ کے نچلے طبقہ سے اُٹھا کر اسلام کے برادرانہ نظامِ معاشرت کا حصہ بنا دیا اور ان پر ترقی و عزت حاصل کرنے کے دروازے کھولے یعنی حقیقت کے لحاظ سے غلام و باندی کا حوالہ تو اسلام کی تعلیمات کے انسانیت نواز ہونے کی بہترین مثال و دلیل ہے۔ اگر ہمارے نوجوان کو اس موضوع پر حقیقت کی ترجمانی کرنے والا لٹریچر دستیاب ہو تو وہ اپنی تاریخ کے بارے میں حیرت و پریشانی اور احساسِ پسپائی کے بجائے اس کی اعلیٰ روایات و اقدار کا داعی بن جائے۔

اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ''بیکن بکس'' نے پیشِ نظر کتاب ''غلامانِ اسلام'' کی اشاعت کا اہتمام کیا جس میں تقریباً (۷۹) ایسی شخصیات کے مفصل حالات ہیں جنہیں اسلام نے غلامی کی پستیوں سے اٹھا کر علم و فضل کے میدان میں پیشوائی کے منصب پر فائز کر دیا۔ یہ کتاب اِس کارنامہ کا ایک نمونہ ہے مکمل دستاویز نہیں ہے کیونکہ اس کے احاطہ کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں صفحات درکار ہوں گے۔

یہ کتاب پہلے بھی متعدد بار شائع ہوتی رہی مگر اب ناپید تھی۔ ''بیکن بکس'' نے اس متاعِ گم گشتہ کو دستیاب کر کے اپنی اشاعتِ علم کی ذمہ داری ادا کی ہے اب ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کا فرض ہے کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے میں اپنے حصہ کا کردار ادا کریں۔

اللہ تعالیٰ ان اہلِ علم کو جزائے خیر عطا فرمائیں جنہوں نے محنت کر کے یہ اہم کام کیا۔

یہ کتاب دراصل ایک حصہ ہے، اس کا پہلا حصہ جو غلامی کی حقیقت سے متعلق ہے، اگر وہ دستیاب ہو سکا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ادارہ اس کی اشاعت کا بھی اہتمام کرے گا۔

والسلام

زاہد محمود قاسمی

مقدمہ

اس کتاب کے پہلے حصہ میں جو ''اسلام میں غلامی کی حقیقت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو کس مصلحت سے یک قلم ممنوع قرار نہیں دیا اور اس نے اس رواج کو باقی رکھا بھی تو کن اصلاحات و ترمیمات کے ساتھ جس کی وجہ سے غلامی غلامی نہیں بلکہ برادری بن گئی۔ اب اس دوسرے حصہ میں تاریخی شہادتوں کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات پر کس طرح عمل کیا، غلاموں سے متعلق ان کی ذہنیتوں میں اسلام نے کیسا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس انقلاب سے مسلمانوں کی اجتماعی و تمدنی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی۔ قبل اس کے کہ آپ اصل کتاب کا مطالعہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ میں اختصار کے ساتھ اُن عظیم الشان نتائج واثرات کا تذکرہ کر دیا جائے جو غلامی اور غلاموں سے متعلق اسلام کی روشن تعلیمات اور اس کے بلند نقطۂ نظر پر مرتب ہوئے اور جن کا ثبوت آپ کو اصل کتاب کے ہر صفحہ میں ملے گا۔

اسلام میں غلامی کا تصور:

اسلام سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں تک نے غلامی کو نوعِ انسانی کی ایک مستقل صفت قرار دے کر عام انسانوں کو آزاد اور غلام کی دو قسموں پر تقسیم کر رکھا تھا اور پھر جتنے تمدنی اور معاشرتی حقوق تھے وہ سب آزاد لوگوں کے لئے مخصوص تھے۔ غلام ان سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے تھے ان قوموں کی اس ذہنیت کا اثر یہ ہوا کہ غلام کو سوسائٹی کی نگاہ میں ذلیل سمجھا جاتا تھا، سوشل زندگی میں اُس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ پھر اس کی بیوی بچے اور اولاد اُن سب کے ساتھ اسی نفرت وحقارت کا معاملہ ہوتا تھا۔ لیکن اسلام نے غلامی کو اس زمانہ کے آئینِ جنگ کے مطابق محض ایک قسم کی سزا قرار دیا جس کا تعلق اس شخص کی ذات سے دائمی نہیں بلکہ محض عارضی اور زوال پذیر ہوتا ہے۔ اسلام میں جس طرح ذات پات کی اور ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ کی طبقاتی تقسیم قطعاً ایک بے معنی

چیز ہے اسی طرح اسلامی نقطۂ نظر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسانی سوسائٹی کو آزاد اور غلاموں کے دو طبقوں پر تقسیم کیا جائے اور پھر دونوں کے مدنی اور شہری حقوق کی الگ الگ تشخیص و تعیین کی جائے۔ [۱] یہی وجہ ہے کہ جہاں تک غلامی کی حیثیت سزا کی سی ہے، آزاد اور غلام میں فرق و امتیاز ہے لیکن سوشل معاملات، تمدنی حقوق اور انسانی مقتضیات کے اعتبار سے آقا اور غلام دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مصر کے نامور فاضل اور مصنف ڈاکٹر حسن ابراہیم نے بالکل صحیح لکھا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''اسلام نے غلاموں کی حالت کو سدھارا اور آزادی کی راہ میں ان کی دستگیری کی اسلام نے کھانے پینے، لباس اور تعلیم و تہذیب اور دوسرے بڑے بڑے مدنی اور شہری حقوق (Civil rights) میں آقا اور غلام دونوں کو برابر کے درجہ میں رکھا ہے۔'' [۲]

آزاد کردہ غلام کی حیثیت:

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں غلام جب تک غلام رہتا ہے اس کے لئے بحیثیت سزا یافتہ ہونے کے کچھ ایسی پابندیاں ضرور ہیں جن سے اس کے انسانی شرف و عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن آزاد ہونے کے بعد تو...... جس کے لئے اسلام نے متعدد اختیاری اور اضطراری طریقے تجویز کئے ہیں اور فکِ رقبہ کو سب سے بڑا ثواب کا کام قرار دے کر اس کی طرف مسلمانوں کو شدید رغبت دلائی ہے۔ غلام اور آزاد میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔

امام نووی اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

> **''ان حکم السید علیه وملکه له کحبل فی رقبة العبدو کالغل المآنع له من الخروج فاذا اعتق فکانه اطلقت رقبته من ذلک۔''** [۳]

> ''غلام پر اُس کے آقا کا حکم اور اس کی ملکیت غلام کی گردن میں ایک رسی اور اُس طوق کی طرح ہے جو اس کو نکلنے سے منع کرے لیکن جب وہ آزاد ہو جاتا ہے تو گویا اس کی گردن رسی یا طوق سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے۔''

---

(۱) اس موضوع پر مفصل بحث کے لئے دیکھو ''اسلام میں غلامی کی حقیقت''۔ (۲) تاریخ الاسلام السیاسی ج ا ص ۲۳۱۔

(۳) شرح صحیح مسلم ج، ص ۱۳۵۔

ولاء کا تعلق:

بلکہ آزاد ہونے کے بعد غلام اور آقا میں ایسا تعلق اور رابطہ قائم ہو جاتا ہے کہ غلام اپنے آقا کے خاندانی یا قبائلی شرف ومجد میں برابر کا شریک سمجھا جاتا ہے شریعت اسلام کی اصطلاح میں اس تعلق کو ولاء کہتے ہیں اور اس کو "الولاء لحمة کلحمة النسب" فرما کر اتنا مضبوط اور نا قابلِ انفکاک قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح وہ شخص جو اپنے باپ کے علاوہ اپنے آپ کو کسی اور شخص کا بیٹا بتاتا ہو عندالشرع ملعون ہے اسی طرح جو غلام کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے اس پر بھی لعنت بھیجی گئی ہے[1] ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مولی القوم منھم" (کسی قوم کا مولیٰ اسی کا ایک فرد ہوتا ہے) علامہ ابن خلدون اس کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:

''اہل عصبیت جب غیر نسب لوگوں کے ساتھ کوئی مخالفت کرتے ہیں، یا ان کو غلام بناتے ہیں اور یہ لوگ ان کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں تو یہ بھی عصبیت میں اہل قبیلہ کے شریک بن جاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''مولیٰ القوم منھم'' یہ مولیٰ عام ہے، خواہ مولیٰ رِق ہو یا مولیٰ مخالفت۔''

پھر آگے چل کر کہتے ہیں:

''تمام بڑی بڑی حکومتوں کے آزاد کردہ غلاموں کا حال یہی تھا، یہ حکومت کے ولاء میں حصہ دار ہونے کے باعث نہایت عزت ووقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے چنانچہ حکومت بنو عباس میں تُرک موالی، بنو برمک اور بنو نوبخت اس دعوے کے شاہد عدل ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہارون رشید کے ولاء کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے جعفر بن یحیٰ بن خالد کس قدر معظم ومحترم سمجھا جاتا تھا۔[2]

آزاد کردہ غلام کے مدنی حقوق:

آزاد ہونے کے بعد اب وہ تمام کام کرسکتا ہے جو ایک حُر الاصل انسان کے لئے جائز ہیں، وہ لشکروں کی قیادت کرسکتا ہے، چار عورتوں سے نکاح کرسکتا ہے، اور اپنے اندرونی و بیرونی معاملات میں تصرف واختیار کا پورا مجاز ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب العتق۔ (۲) مقدمہ ابن خلدون ص ۹۶۔

قیادتِ لشکر:

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ غلام زادہ تھے۔ اور کمسن بھی لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس لشکر کی قیادت کے لئے منتخب فرمایا جس میں حضرت عمرؓ ایسے اکابر صحابہؓ شامل تھے یہ لشکر مقامِ خندق تک پہنچا تھا کہ سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے بعض حضرات کی چہ میگوئیوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ہی باقی رکھا، اور اب آپ نے اس لشکر کو روانہ کیا تو اس شان سے کہ حضرت اُسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور خود خلیفۂ اسلام ان کی مشایعت کے لئے پاپیادہ چل رہا تھا۔ اسامہؓ بولے "آپ کو خدا کی قسم یا تو آپ بھی سوار ہو جائیے، ورنہ پھر میں بھی اُتر جاتا ہوں،" حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "نہیں تمہیں خدا کی قسم! تم ہرگز نیچے نہ اترو اور میں بھی سوار نہیں ہوں گا۔"(۱)

امامت:

آج کل نماز میں امامت ہر کہ ومہ کر لیتا ہے، لیکن عہد صحابہ میں اس منصبِ وقیع کی یہ زبوں حالت نہیں تھی۔ اس زمانہ میں وہی حضرات امامت کر سکتے تھے جو علم وفضل اور تقویٰ و طہارت میں نمایاں شخصیت رکھتے تھے اور مسلمانوں میں جنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلام کو غلامی کے رواج پر بدنام کرنے والوں کو تعجب ہوگا کہ اس عہد میں احرار کی طرح غلام بھی امامت کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ حضرت سالم مولیٰ حذیفہ جن کی امامت کا واقعہ حدیث کی متعدد صحیح کتابوں میں مذکور ہے، وہ تو خیر آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے علاوہ متعدد واقعات ایسے بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غلام غلامی کی حالت میں امامت کرتے تھے۔ مثلاً ابوسفیان جو عبداللہ بن احمد کے غلام تھے آزاد ہونے سے پہلے بھی نماز پڑھاتے تھے اور اکابر صحابہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے، چنانچہ داود بن الحصین کے الفاظ یہ ہیں: **ان ابا سفیان کان یؤم بنی عبدالاشھل فی مسجدھم وھو مکاتب فی رمضان وفیھم قومٌ قد شھدوا بدرا والعقبۃ:** — یہ واقعہ تو ان کے مکاتب ہونے کے زمانہ کا ہے، لیکن ایک مرتبہ جب کہ یہ مکاتب بھی نہیں بلکہ رقیقِ محض تھے نماز پڑھا رہے تھے کہ محمد بن مسلمہ

---

(۱) تاریخ ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۱۲۔

اور سلمة بن سلامة جو مشہور صحابیؓ ہیں ادھر سے گزرے تو ابوسفیان کی قرأت سننے کے لئے کھڑے ہو گئے، اور پھر فرمایا:

"مابهذا من امام باس." [1]

"ایسے امام میں تو مضائقہ نہیں ہے۔"

اسی طرح ذکوان بھی جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام تھے اور جن کو انہوں نے مدبر کر دیا تھا قریش کی امامت کرتے تھے عبداللہ بن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ مقام حراء اور ثبیر کے درمیان قیام پذیر تھیں، ان سے شرف نیاز حاصل کرنے قریش کے بڑے بڑے وفد آتے تھے، اسی اثناء میں نماز کا وقت ہو جاتا تھا تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر امامت کرتے تھے، اور اگر وہ موجود نہ ہوتے تو ذکوان (فتاہا) اس فرض کو انجام دیتے تھے۔ [2]

شادی:

آج کل سادات اور شیوخ غیر ذات کے لوگوں سے خواہ وہ کیسے ہی حُر الاصل ہوں ازدواجی تعلق قائم کرنا اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے ہیں، لیکن عہد صحابہ و تابعین میں غلاموں سے متعلق اسلام کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کا اثر یہ تھا کہ نہایت نجیب الطرفین حضرات بھی باندیوں اور غلاموں سے شادی کرنے کو ذرا بھی معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ امام زین العابدینؒ جو خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ تھے ان سے بڑھ کر نجیب و شریف کون ہوگا، سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی والدۂ محترمہ (شہر بانو) بیوہ ہو گئیں تو امام زین العابدین نے ان کا نکاح امام حسینؓ کے غلام زبید سے کر دیا اور خود اپنا نکاح اپنی ایک باندی سے اسے آزاد کر کے کر لیا۔ عبدالملک بن مروان نے اس پر طعن کیا تو امام عالی مقام نے جواب میں ارشاد فرمایا "ہم سب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسوۂ حسنہ تھے۔ آپ نے حضرت صفیہ کو آزاد کر کے اپنا نکاح ان سے کیا، اور اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کو اپنے غلام حضرت زید کے حبالۂ عقد میں دیا۔ [3]

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۲۶۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۳۱۸۔ (۳) کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۹۴۔

حفظِ ناموس:

غلاموں اور باندیوں کے ناموس کی حفاظت بالکل احرار کے ناموس کی طرح کی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص اس پر حملہ کرتا تو اسے خاطر خواہ سزا ملتی تھی۔ عہد فاروقی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ کسی غلام نے ایک باندی کے ناموس کو مجروح کرنے کی کوشش کی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے غلام کے کوڑے لگوائے اور اس کو شہر بدر کر دیا۔ (۱)

کسی غلام اور حُر میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا، تو غلامی اور آزادی سے صرفِ نظر کر کے معاملہ کی واقعی تحقیق کی جاتی تھی اور پھر جس کا حق ثابت ہوتا تھا اسے بے تکلف دلا دیا جاتا تھا، ایک مرتبہ حضرت اسامہ بن زید مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اور عمرو بن عثمان میں ایک جائیداد سے متعلق نزاع ہو گیا، دونوں میں سے ہر ایک اس کی ملکیت کا دعویٰ کرتا تھا عمرو بن عثمان نے کہا ''اے اسامہ! کیا تمہیں میرا مولیٰ بننے سے نفرت ہے؟ حضرت اُسامہؓ نے فرمایا ''بخدا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ولاء کے بدلے میں تو میں تجھ سے نسبی تعلق قائم کرنے کو بھی قبول نہیں کرسکتا۔'' فیصلہ کے لئے دونوں حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سعید بن العاص اس مجلس میں موجود تھے، وہ یہ دیکھ کر عمرو بن عثمان کے حامی ہو گئے اور اسے حجت کی تلقین کرنے لگے۔ اب حضرت حسنؓ آگے بڑھے اور وہ حضرت اسامہؓ کے پہلو میں بیٹھ کر انہیں دلیل بتانے لگے۔ اس کے بعد عتبہ بن ابی سفیان، عمرو بن عثمان کا حامی ہو گیا، اتنے میں امام حسینؓ بھی تشریف لے آئے اور وہ بھی حضرت اسامہ کی حمایت کرنے لگے۔ غرضیکہ اس طرح دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک جانب عبدالرحمٰن بن ام الحکم اور ولید بن عقبہ تھے جو عمرو بن عثمان کے حامی تھے۔ اور دوسری جانب حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفر تھے جو حضرت اسامہ کی تائید کر رہے تھے۔ دونوں طرف کے دلائل وشواہد سننے کے بعد امیر معاویہ نے فرمایا ''جو اصل معاملہ ہے وہ مجھ کو معلوم ہے جب یہ جائیداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ کو عطا فرمائی تھی اس وقت میں خود وہاں موجود تھا'' اس فیصلہ کو سن کر تمام ہاشمی جو یہاں موجود تھے بہت خوش ہوئے اور گھر واپس چلے آئے۔

---

(۱) مؤطا امام محمدؒ باب الاستکراہ فی الزناء۔

تحصیل علم و فضل:

غلاموں اور آزادوں میں سوشل مساوات اور برابری کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ تحصیل علم و کمال کے دروازے دونوں پر یکساں کھلے ہوئے تھے اور جو غلام اپنی فطری استعداد، محنت اور ذاتی ذوق و شوق کے باعث علم و فضل میں کوئی نمایاں مقام حاصل کر لیتے تھے ان کی تعظیم و تکریم ان کی علمی جلالت شان کے مطابق کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے سلاطین و اُمراء ان کی قدر دانی کرتے، اور ان کی عظمت و برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ عہد تابعین تو اس لحاظ سے خاص طور پر مشہور ہے کہ اس زمانہ میں فقہ کے اکثر مراکز پر موالی کا قبضہ تھا۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا بیان ہے کہ جب عبادلہ ثلاثہ یعنی حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کا انتقال ہو گیا تو تمام ممالک میں فقہ کے مراکز موالی کی طرف منتقل ہو گئے۔ چنانچہ مکہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح یمن میں طاؤس بن کیسان، یمامہ میں یحیٰی بن ابی کثیر، بصرہ میں حسن بصری، کوفہ میں ابراہیم النخعی، شام میں مکحول الدمشقی اور خراسان میں عطار الخراسانی فقہ میں مرجع انام تھے البتہ مدینہ میں صرف حضرت سعید بن المسیب فقہ کے امام سمجھے جاتے تھے، جو قرشی الاصل تھے۔ [1] استاذ کرد علی جو عہد حاضر کے مشہور مفکر اسلام اور مصنف ہیں لکھتے ہیں:

> ''غلام زیادہ تر روم، فارس، حبش، سوڈان وغیرہ ان قوموں میں سے ہوتے تھے جو جزیرۃ العرب کے پڑوس میں واقع تھیں اور جنہوں نے عربوں سے جنگ کی تھی ان میں کثرت سے وہ لوگ تھے جن کی اولاد کو مسلمانوں نے اچھی تربیت دی ان کو قرآن و سنت کا عالم بنایا جس کی وجہ سے یہ علم و فضل میں عربی الاصل صحابہ اور کبار تابعین کے ہمسر ہو گئے کوئی شہر ایسا نہیں تھا جس میں طالبان علم موالی کی بھاری تعداد موجود نہ ہو اور بعض شہروں میں تو فقہاء موالی کی تعداد عرب فقہا سے کہیں زیادہ تھی۔ [2]

اسلام کی عام اخلاقی تعلیم اور خصوصاً ان تعلیمات نے جو غلاموں اور باندیوں سے متعلق تھیں، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال نے عربوں کی پرانی ذہنی عصبیت میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی تھی، لیکن پھر بھی عام لوگوں میں پرانی ذہنیت کا کچھ اثر باقی تھا کہ

---

(۱) معجم البلدان ج ۳ ص ۴۱۲۔ (۲) الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۴۔

اکابر صحابہ اور اہل بیت کے عمل نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا، جاحظ کا بیان ہے کہ لوگ باندیوں سے نکاح کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور اسی طرح جو باندیوں کے بطن سے ہوتے تھے ان کو بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن جب ان لوگوں نے حضرت ابوالقاسم بن محمد بن ابی بکر سالم بن عبداللہ بن عمر اور علی بن الحسینؒ کو دیکھا کہ ان تینوں کی والدہ ہائے محترمہ وہ خواتین تھیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ (۱)

اور اس کے باوجود مدینہ، حجاز اور عراق میں کیا تمام روئے زمین میں کوئی نہ تھا جو عزت وشرف میں ان کا حریف بن سکے تو ان لوگوں کی ذہنیتوں میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ابوالعباس مبرد نے اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے جاحظ کی تائید ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں بھی حضرت ابوالقاسم، سالم اور علی بن الحسین رحمہم اللہ کا تذکرہ ہے۔ (۲)

مسلمانوں کی اس پاک وصاف ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ قول استاذ کرد علی'' وہ غلاموں کے ساتھ اپنا جیسا معاملہ کرتے تھے۔ ان کے لئے فراخی عیش کے دروازے کھلے رکھتے تھے، انہیں تعلیم دیتے اور بہترین تربیت سے آراستہ کرتے تھے، ان کی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ غلاموں کا نکاح اپنی بیٹیوں سے، اور اپنا نکاح لونڈیوں سے کرتے تھے، یہاں تک کہ غلام لطف وکرم کی اس روح پرور فضا میں رہ کر اپنے آپ کو آزاد اور آقا کے گھر کا ایک فیملی ممبر سمجھتا تھا۔ (۳)

اس اعلیٰ تعلیم وتربیت سے آراستہ ہو کر، غلاموں، اور غلام زادوں نے تاریخ میں کیسے کیسے عجیب وغریب علمی اور عملی شاندار کارنامے کئے؟ اور مسلمانوں نے ان کے کمالات ذاتی اور علم وفضل کی کس طرح قدر کی؟ اور اسلامی سوسائٹی نے ان کے ساتھ کس تعظیم وتکریم کا معاملہ کیا؟ یہ چند سوالات ہیں جن کے تحقیقی ومستند جوابات آپ کو زیر نظر کتاب کے صفحات میں ملیں گے۔

آخر میں کتاب کی نسبت دو ایک باتیں عرض کرنی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ کیا گیا تھا، تو خیال تھا کہ اس میں محدثین وفقہاء اور اولیاء وصوفیا کے ذکر کے ساتھ ان سلاطین وامراء کا ذکر بھی شامل کر دیا جائے جنہوں نے غلام ہونے کے باوجود عظیم الشان سیاسی کارنامے انجام دیئے لیکن تاریخ وسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سلاطین وامراء

---

(۱) علی بن الحسینؒ کی والدہ ماجدہ کے متعلق اس روایت کو اگرچہ ابن خلکان جیسے نامور مؤرخ نے قبول کیا ہے تاہم اس کی صحت میں بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے مگر جیسا کہ ظاہر ہے اس وقت ہمارا موضوع اس روایت کی تنقیح نہیں بلکہ غلاموں اور باندیوں سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے طریقہ عمل کی وضاحت ہے۔

(۲) دیکھو الکامل للمبرد ج ۲ ص ۹۸۔ (۳) الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۴۔

کا ذکر تو درکنار ایک ضخیم جلد میں تمام محدثین وفقہاء کا تذکرہ بھی نہیں آ سکتا، چنانچہ اس کتاب میں بہت ہی منتخب اور نمایاں اربابِ علم وفضل کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر ان کا استیعاب کیا جاتا تو انہی کے حالات میں کئی جلدیں ہو جاتیں۔ پھر غلام سلاطین وامراء بھی اس کثرت سے ہیں کہ ان کے ذکر کے لئے ایک جلد کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس بناء پر مجبوراً اس کتاب کو علماء وفضلاء کے ذکر تک محدود رکھا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربی زبان میں ''مولیٰ'' کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس کے معنی آزاد کردہ غلام بھی ہیں۔ اور مولیٰ اس کو بھی کہتے ہیں جو عجمی ہونے کے باوصف کسی عربی خاندان میں مسلمان ہوا ہو، اور اس سے مخالفت کی ہو۔ اس بنا پر میں نے یہ نہیں کیا کہ ہر وہ شخص جس کے نام کے آگے ''مولیٰ'' کا لفظ لکھا دیکھا اس کو ''غلامانِ اسلام'' کی فہرست میں شامل کر لیا، بلکہ اپنی بساط کے مطابق تحقیق کی ہے کہ مولیٰ سے واقعی آزاد کردہ غلام مراد ہے یا نہیں؟ اسی بنا پر امام بخاری وغیرہ اصحاب کا ذکر چھوڑ دیا گیا جن کو بعض اربابِ سیر نے مولیٰ لکھا ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہاں ولاء عتاقہ مراد نہیں بلکہ ولاء اسلام مراد ہے۔ اسی طرح میں نے امام شعبی وغیرہ ایسے اصحاب کا تذکرہ بھی شامل کتاب نہیں کیا ہے جن کی نسبت ایک ضعیف سی روایت ہے کہ ان کی ماں جنگ بلولاء کے قیدیوں میں سے تھیں اور حضرت شعبی کے والد شرحبیل کے حصہ میں آئی تھیں۔ کیونکہ اگر یہ روایت قوی ہوتی تب بھی اولاد چونکہ خیرالابوین کے تابع ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت شعبی غلام نہیں کہلا سکتے تھے۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے عہد صحابہ کے غلاموں کا تذکرہ ہے پھر تابعین اور اس کے بعد اتباع تابعین وغیرہم کا۔ یہ تقسیم طبقہ وار ہے۔ افسوس ہے کہ میں سنین کے اعتبار سے ترتیب قائم نہیں رکھ سکا یعنی اس میں آپ کو بعض ان بزرگوں کے حالات پہلے ملیں گے جن کا بعد میں انتقال ہوا ہے۔ اور جو سنہ وفات کے اعتبار سے ان سے مقدم ہیں ان کا ذکر بعد میں ہے۔ ناموں کی تقدیم وتاخیر میں میں نے حتی الوسع جلالت مرتبت کا لحاظ ضرور رکھا ہے لیکن کہیں کہیں اس کا خلاف بھی ہو گیا ہے۔

واقعات کی تحقیق وتنقیح میں مقدور بھر محنت وجستجو سے کام لیا گیا ہے جو نہایت ہی مستند تاریخی مآخذ ہیں، ان کی مدد سے معتبر اور بالکل صحیح واقعات فراہم کر کے احتیاط سے مرتب کئے گئے ہیں۔

مجھ کو یہ کہنے میں مسرت ہے کہ اگر برادر محترم مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی خود کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح نہ کرتے تو یقیناً کتاب میں بعض جگہ میری کوتاہی کی وجہ سے نہایت فاحش غلطیاں رہ جاتیں، لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب اب بھی غلطیوں سے بالکل مبرا ہے۔ اول تو کوئی انسانی کام خطاء سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا اور پھر کام بھی اس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر وخطا ہو۔ اس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ کی توفیق سے ہی انجام پذیر ہو سکا ہے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم وھو حسبی ونعم الوکیل.

سعید احمد

ندوۃ المصنفین دہلی

۱۸ جون ۴۰ء

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

حضرت بلالِ بن رَبَاح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ابوعبداللہ کنیت، بلال نام، والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ اصل کے اعتبار سے حبشی تھے۔ مکہ میں پیدا ہوئے، امیہ بن خلف ان کا آقا تھا۔ [1]

اسلام:

آپ ان سات ''السابقون الاولون'' میں سے تھے جنہوں نے توحید کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا۔ اس ''جرم'' میں ان کا آقا امیہ بن خلف ان کو سخت اذیتیں پہنچاتا تھا، تپتی ہوئی ریت اور جلتے ہوئے سنگریزوں پر ان کو لٹا دیتا اور زدوکوب کرتا۔ مشرکین کے لڑکے ان کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر اس زور سے کھینچتے کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ مگر توحید کی شرابِ طہور نے ان کو جس کیفِ جاں نواز سے آشنا کر دیا تھا، اس کا نشہ کہیں ان تکلیفوں سے کم ہو سکتا تھا۔ ابوجہل ان کو منہ کے بل سنگریزوں پر لٹا کر اوپر سے پتھر کی چکی رکھ دیتا اور جب گرمی تیز ہو جاتی، تو پوچھتا ''بلال! اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا سے باز نہ آؤ گے؟'' شمع نبوت کا یہ پروانۂ جاں نثار اس وقت بھی کہتا ''احد احد'' یعنی خدا ایک ہے ایک ہے [2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک روز ان کو اس حالت میں دیکھا تو خرید کر آزاد کر دیا۔

فضائل:

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز نہایت شیریں اور دلکش تھی، اس لئے مدینہ طیبہ میں جب مسجد کی تعمیر ہو چکی اور نماز پنجگانہ کا اہتمام کیا گیا تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مؤذن مقرر ہوئے۔ آپ اسلام کے سب سے پہلے مؤذن ہیں۔

آپ سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوات میں بھی شریک رہے، معرکۂ بدر میں امیہ بن خلف انہی کی شمشیر آبدار سے قتل ہوا۔ [3]

---

(۱) طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت بلال۔ (۲) اسد الغابہ ذکر حضرت بلال۔

(۳) حضرت ابوبکر نے اس موقع پر خوش ہو کر یہ شعر پڑھا:

"هنيا زادك الرحمن خيرا
فقد ادركت ثارك يا بلال"

''مبارک ہو خدا تمہارے لئے خیر و برکت کو زیادہ کرے، تم نے اے بلال! اب اپنا بدلہ پالیا۔''

فتح مکہ کے وقت کوکبۂ نبوی مکہ میں شان و تجمل کے ساتھ داخل ہوا تو حضرت بلال اس وقت بھی ہمراہ تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ''بلال! کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دو'' اللہ اکبر! وہ حریم قدس جس کو اسلام کے معمار اولین حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، ایک عرصہ تک بتکدہ رہنے کے بعد پھر ایک حبشی نژاد غلام کی اذانِ توحید سے گونجا۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''ابو بکر سیدنا و اعتق سیدنا یعنی بلالا.''(۱)

''ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار یعنی بلال کو آزاد کرایا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ''ایک دن فجر کی نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو بلا کر پوچھا ''اپنا کوئی ایسا عمل تم مجھ کو بتاؤ جس پر ثواب کی توقع سب سے زیادہ ہو کیوں کہ میں نے تمہارے جوتوں کی آواز اپنے آگے جنت میں سنی ہے۔حضرت بلالؓ نے فرمایا'' میں نے ایسا عمل تو کوئی نہیں کیا، البتہ دن رات میں کوئی وضو ایسا نہیں ہے کہ اس کے بعد میں نے نماز نہ پڑھی ہو۔(۲)

سبقتِ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر میں ساتھ رہنے کے باعث حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو شرف حاصل تھا، تمام صحابہ اس کا احترام کرتے تھے۔ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں کسی کام کے لئے رؤسائے مکہ کا ایک گروہ بابِ خلافت پر حاضر ہوا اور باریابی کی اجازت طلب کی۔ان کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اندر بلایا۔بعض سردارانِ قریش کو یہ بات ناگوار گزری اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شرفاء منتظر بیٹھے ہیں اور ایک غلام کو شرف باریابی حاصل ہو رہا ہے۔اس پر عکرمہ بن ابی جہل نے کہا'' بلانے والے نے سب کو ایک آواز سے بلایا، لیکن ہم نے اس وقت بھی اس آواز کو بعد میں سنا۔لہٰذا اب بھی وہ ہی لوگ پہلے باریابی حاصل کرنے کے حقدار ہیں جنہوں نے اسلام کی آواز پر ہم سے پہلے لبیک کہا۔آج ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔''

---

(۱) بخاری باب مناقب حضرت بلال۔ (۲) صحیح بخاری باب فضل الطہور باللیل والنہار۔

نکاح:

آپ نے متعدد نکاح کئے تھے اور ان کی بعض بیویاں عرب کے شریف ومعزز خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ابن ابی بکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہماری ہمشیرہ کا نکاح کسی سے کر دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم بلال کو چاہتے ہو؟" وہ پھر واپس آئے اور یہی عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا، بالآخر وہ راضی ہو گئے اور کہا "آپ کو اختیار ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کی صاحبزادی کا نکاح حضرت بلالؓ سے کر دیا۔ حضرت قتادہ کی روایت کے مطابق آپ کا ایک نکاح بنوزہرہ کی ایک عرب عورت سے بھی ہوا تھا (۱)۔ اور آپ کی بیوی کا نام ہند الخولانیہ تھا۔ (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ ملک شام میں جا کر متوطن ہو گئے تھے۔ بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے وہاں بھی ایک نکاح کیا تھا۔ (۳)

حلیہ: حضرت بلالؓ کا جسم لاغر، رنگ سیاہ اور قد نہایت طویل تھا۔ سر کے بال نہایت گھنے، خمدار اور اکثر سفید تھے۔ (۴)

وفات: ۲۰ھ میں کم وبیش ساٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور دمشق میں باب الصغیرہ کے قریب دفن ہوئے۔ (۵)

---

(۱) طبقات ابن سعد ص ۱۶۹ جلد ۳۔

(۲) ابن عساکر ص ۳۰۱ جلد ۳۔

(۳) مولانا شبلی نے حضرت بلالؓ کے واقعہ نکاح کو موثر پیرایہ میں نظم کیا ہے، ہم اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں:

بارگاہِ نبوی کے جو موذن تھے بلال
کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں
جا کے انصار ومہاجر سے کہا یہ کھل کر
ہوں غلام ابن غلام اور حبشی زادہ
یہ بھی سن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہش تزویج بھی ہے
ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے حذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور
جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر
عہد فاروق میں جس دن کہ ہوئی ان کی وفات
یہ کہا حضرت فاروق نے بادیدۂ تر
اٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا!
اٹھ گیا آج نقیب حرمِ پیغمبرؐ
اس مساوات پہ ہے معشر اسلام کو ناز
نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلم اکبر!

(۴) طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۷۰۔ (۵) اسد الغابہ ذکر حضرت بلال۔

حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

صہیب نام اور ابو یحییٰ کنیت تھی، والد کا نام سنان، اور والدہ کا نام سلمیٰ بنت قعید تھا۔

ان کے والد اور ان کے چچا شاہ فارس کی طرف سے مقام ابلہ میں حاکم تھے۔ ان لوگوں کے مکانات لبِ دجلہ شہر موصل کے پاس تھے۔ اہل روم نے ان پر شب خون مارا اور حضرت صہیب کو جو اس وقت صغیر السن تھے پکڑ کر لے گئے اور غلام بنالیا۔ پھر ان کو قبیلۂ کلب کے لوگوں نے خرید لیا اور مکہ لے آئے۔ عبداللہ بن جدعان نے کلب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ (۱)

لیکن ایک دوسری روایت ہے کہ وہ خود بھاگ کر آئے تھے اور عبداللہ بن جدعان سے محالفت کر لی تھی۔ اور ابنِ جدعان کی اخیر زندگی تک اس کے ساتھ رہے۔ (۲)

اسلام:

مکہ معظمہ میں تیس آدمی اسلام لا چکے تھے کہ حضرت صہیب، حضرت عمار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ آپ نے ان میں اور حارث بن صمہ کے درمیان مواخات کرادی تھی۔

کفار و مشرکین مکہ نے ان پر طرح طرح کے جانگسل مصائب توڑے۔ بالآخر حضرت علیؓ کی معیت میں ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ مکہ سے روانہ ہو رہے تھے کہ کفار نے تعاقب کیا۔ انہوں نے اپنا ترکش سنبھال لیا، اور فرمانے لگے ''اے قریش کے لوگو! تم جانتے ہو میں تم سب سے اچھا تیر انداز ہوں، خدا کی قسم تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے یہاں تک کہ جتنے تیر میرے پاس ہیں، وہ سب میں تم پر ختم کر دوں گا، اور اس کے بعد اپنی تلوار سے کام لوں گا جب تک وہ میرے ہاتھ میں رہے گی'' ہاں اگر تم میرا مال چاہتے ہو تو میں تمہیں بتادوں۔ ان لوگوں نے کہا ''اچھا تم ہمیں اپنا مال ہی بتادو'' چنانچہ حضرت صہیب نے ان کو اپنے مال کا پتہ بتا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا ''اے ابو یحییٰ! تمہاری تجارت بہت اچھی رہی۔ اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۳)

---

(۱) اسد الغابہ باب الصاد والباء۔ (۲) طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۳۔ (۳) اسد الغابہ ذکر حضرت صہیب۔

"ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله و الله رؤف م بالعباد."
''بعض لوگ وہ ہیں جو اپنی جان اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے
بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔''

مزاح:

طبیعت میں مزاح بے حد تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں مکہ سے روانہ ہو کر قبا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ کے سامنے کھجوریں رکھی ہوئی تھیں، اور آپ ان سے شغل کر رہے تھے، میری ایک آنکھ آشوب کر آئی تھی۔ راستہ میں تشنگی اور بھوک کا غلبہ رہا تھا اس لئے جاتے ہی میں نے کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کیا تم آشوب چشم کی حالت میں بھی کھجوریں کھاتے ہو؟'' میں بولا ''یا رسول اللہ! میں اس آنکھ کی طرف سے کھاتا ہوں جو اچھی ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنتے ہی مسکرانے لگے، یہاں تک کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ (۱)

غزوات:

حضرت صہیبؓ تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر، احد، خندق اور تمام دوسرے معرکوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ عالم پیری میں وہ لوگوں کو جمع کر کے نہایت لطف کے ساتھ اپنے جنگی کارناموں کی دلچسپ داستان سنایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کو ان سے بہت محبت تھی انہوں نے وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ حضرت صہیب ہی میرے جنازے کی نماز پڑھائیں اور اہل شوریٰ جب تک مسئلۂ خلافت طے نہ کریں وہ خلیفہ کے فرائض انجام دیں۔ چنانچہ انہوں نے تین دن تک بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ امامت کا فرض انجام دیا۔ (۲)

حضرت صہیبؓ کا بچپن رومیوں میں گزرا تھا۔ اس لئے زبان میں عجمیت پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے ''اے صہیب! تم میں صرف تین باتیں ہیں جن کو میں برا سمجھتا ہوں اگر وہ نہ ہوتیں تو میں کسی کو تم پر فضیلت نہ دیتا میں دیکھتا ہوں کہ تم خود کو عرب کی طرف منسوب کرتے ہو

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۹۹ و اسد الغابہ۔ (۲) اسد الغابہ ص ۳۲ ج ۳۔

حالانکہ تمہاری زبان عجمی ہے اور تم اپنی کنیت ابو یحییٰ بتاتے ہو جو ایک نبی کا نام تھا اور اپنا مال فضول خرچ کرتے ہو" حضرت صہیبؓ نے فرمایا: میں مال بے جا خرچ نہیں کرتا اور میری کنیت ابو یحییٰ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی ہے۔ لہٰذا میں اس کو ترک نہ کروں گا اور میں اپنے تئیں جو عرب کی طرف منسوب کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں درحقیقت عربی ہی ہوں، مگر کمسنی میں اہل روم مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس لئے میں نے ان کی زبان حاصل کر لی۔ (۱)

حلیہ:

حضرت صہیبؓ کا قد درمیانہ تھا نہ بہت کوتاہ، نہ زیادہ دراز، رنگ بہت سرخ تھا سر کے بال گھنے تھے، بڑھاپے میں مہندی کا خضاب کرتے تھے۔ (۲)

وفات:

۳۸ھ میں بماہِ شوال مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی۔ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (۳)

فضائل:

آپ نے متعدد حدیثیں بھی روایت کی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "صہیب روم کا پھول ہے" اور آپ کی دلجوئی کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ایک بار ابوسفیان (مسلمان ہونے سے قبل) حضرت سلمانؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ کے پاس سے گزرا تو ان تینوں نے کہا "اللہ کی تلوار نے اب تک اس دشمنِ خدا کی گردن نہیں اڑائی" حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنا تو فرمایا "تم لوگ قریش کے بزرگ کی نسبت ایسا کہتے ہو؟" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا: "تم نے شاید ان کو خفا کر دیا؟ اگر واقعی ناراض کر دیا ہے تو گویا تم نے اپنے خدا کو ناراض کر دیا" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ ان تینوں بزرگوں کے پاس آئے اور فرمایا: "اے میرے پیارے بھائیو! کیا میں نے تم کو ناراض کر دیا" انہوں نے کہا "نہیں ہم غضبناک نہیں ہوئے اے بھائی! خدا تمہاری مغفرت کرے۔ (۴)

---

(۱) اسد الغابہ ص ۳۳ جلد ۳۔ (۲) طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۳ ؔ (۳) اسد الغابہ ذکر حضرت صہیبؓ۔

(۴) صحیح مسلم بحوالہ کتاب التاج الجامع الاصول ج ۳ ص ۴۲۴۔

حضرت صہیب کی نسبت ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''**نعم العبد صهيب لو لم يخف الله لم يعصه.**''[1]

''صہیبؓ اچھے بندے ہیں، اگر وہ اللہ کا خوف نہ کرتے، تب بھی اس کی معصیت نہ کرتے۔''

اسلام کی ایک یہ بھی عجیب شان ہے کہ وادیِ فاران کے داعی حق کی دعوتِ توحید پر کفر وشرک کی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کے باوجود جن بزرگوں نے سب سے پہلے اس دعوت کو قبول کیا ان میں حضرت ابوبکر ایسے بزرگ قریش کے ساتھ حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت عمار اور حضرت خباب ایسے ''غلاموں'' کے اسماء گرامی بھی نظر آتے ہیں جن کی ذات گرامی اسلام کے لئے سرمایۂ افتخار اور جن کے اعمال مسلمانوں کے لئے باعث تقلید تھے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے سطوتِ اسلام کا پرچم لہرایا اور اس کی عظمت و بزرگی کا اعتراف اہل عالم سے کرایا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

---

(۲) صحیح مسلم بحوالہ کتاب التاج الجامع للاصول ج ۳ ص ۴۲۴

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

اسلام سے پہلے آپ کا نام مابہ تھا، مجوسی المذہب تھے، آپ کے والد اصفہان کے قریہ جی کے باشندے تھے۔ بعض کہتے ہیں آپ فارس کے شہر رامہرمز سے تعلق رکھتے تھے والد کا نام یوذخشان بن مورسلان تھا جو فارس کے ایک آتشکدہ کی خدمت کرتے تھے۔ صیغۂ معاش کاشتکاری وزمینداری تھا۔(۱)

اسلام سے پہلے:

حضرت سلمانؓ کے والد ان کے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو لڑکیوں کی طرح گھر سے باہر نہ جانے دیتے تھے، حضرت سلمان فطرۃً مذہبی جوش وولولہ لے کر آئے تھے۔ اس لئے آتش کدہ کی خدمت اس انہماک سے کرتے تھے کہ آگ برابر روشن رہتی تھی۔

عیسائیت کی طرف میلان:

ایک مرتبہ والد نے کہا کہ میں اپنی جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے خود جانہیں سکتا، تم ہو آؤ۔ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ راضی ہوگئے۔ راستہ میں ایک گرجا ملا جس میں اس وقت نماز ہو رہی تھی، سلمانؓ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا گھر آئے تو والد کو اس کی خبر ہوئی وہ بہت برہم ہوئے اور ان کو گھر میں مقید کردیا۔ انہوں نے عیسائیوں سے کہلا بھیجا کہ کوئی قافلہ شام جائے تو مجھ کو اس کی خبر کرنا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سلمانؓ موقع پاکر اس قافلہ کے ساتھ شام کی طرف چل دیئے، جہاں پہنچ کر انہوں نے معلوم کیا کہ عیسائیوں کا یہاں سب سے بڑا پیشوا کون ہے؟ لوگوں نے کہا، بشپ، سلمان اس بشپ کے پاس گئے اور اس کے کیرکٹر کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ شخص انتہا درجہ کا ذلیل فطرت اور بدعمل تھا۔ سلمان اس کی بدعملی کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔ آخر کار وہ مرگیا، اور اس کا قائم مقام جو دوسرا بشپ ہوا وہ بڑا عابد وزاہد اور تارک الدنیا تھا، سلمان اس سے بہت مانوس تھے جب یہ مرنے لگا تو سلمان نے پوچھا اب میں کس کے پاس جاؤں۔ اس نے موصل کے کسی شخص کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ سلمان یہاں آئے تو دیکھا کہ واقعی یہ

---

(۱) لیکن ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت سلمانؓ ایک بادشاہ کے لڑکے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں اس کو نقل کیا ہے۔

شخص بڑا عابد و زاہد اور متقی و پرہیز گار ہے مگر چند روز کے بعد جب اس کا بھی انتقال ہونے لگا تو اس نے سلمان کو وصیت کی کہ مقام نصیبین کے فلاں شخص کے پاس چلے جائیں۔ بشپ کی وصیت کے مطابق سلمان نے نصیبین آ کر دیکھا کہ واقعی یہ شخص بھی پہلے دو بشپوں کی طرح عابد و زاہد ہے اتفاق کی بات چند روز کے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کی وصیت کے مطابق حضرت سلمان عموریہ آئے۔ یہاں انہوں نے کچھ بکریاں لیں اور ان سے معاش کا انتظام کرنے لگے۔ آخر کار وقت آیا کہ اس اسقف کا ساغرِ حیات بھی چھلکنے لگا۔ سلمان نے اس سے کہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ بشپ بولا۔ اب میری نظر میں کوئی بشپ ایسا نہیں ہے جس کے پاس جانے کی میں تم کو ہدایت کروں البتہ ہاں اس نبی کے ظہور کا انتظار کرو جو ریگستان عرب سے اٹھ کر دین ابراہیمی کو زندہ کرے گا۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ وہ ہدیہ قبول کرے گا، لیکن صدقہ کو اپنے لئے حرام سمجھے گا۔ اس کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اگر تم اس سے مل سکو تو ضرور ملنا۔

غلامی:

اس بشپ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک حضرت سلمان عموریہ میں مقیم رہے کہ اتنے میں بنو کلب کا ایک قافلہ ان کے پاس سے گزرا۔ سلمان نے ان لوگوں سے کہا ''میں تم کو اپنی بکریاں اور گائیں دے دوں گا تم مجھ کو اپنے شہر میں لے چلو۔ قافلہ راضی ہو گیا۔ اور حضرت سلمانؓ ان کے ساتھ چلے آئے۔ مگر بعد میں ان لوگوں نے غداری کی۔ وادی القریٰ پہنچ کر انہوں نے حضرت سلمانؓ کو غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ انہوں نے یہاں کھجوریں دیکھیں تو سمجھے میرا گوہر مقصود یہیں ملے گا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے حضرت سلمانؓ اپنے آقاؤں کی شدید سختیوں کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اسی دوران میں بنو قریظہ کے ایک شخص نے حضرت سلمانؓ کو خرید لیا اور اپنے ہمراہ ان کو لے کر مدینہ چلا آیا۔

قبول اسلام:

قیام مدینہ کے زمانہ میں حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے باغ میں ایک درخت پر کام کر رہا تھا۔ اتنے میں اس کا ایک چچازاد بھائی آیا اور کہنے لگا خدا بنی قیلہ (انصار) کو غارت کرے میں ان کے پاس سے ابھی گزرا تو دیکھا کہ ایک شخص جو اپنے تئیں نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور جو مکہ سے آیا ہے۔ یہ سب لوگ اس کے ارد گرد جمع ہیں۔ میں یہ سنتے ہی اس درجہ اثر پذیر

ہوا کہ ایک بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ قریب تھا کہ درخت سے گر پڑوں۔ بڑی عجلت کے ساتھ اپنے آقا کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے مجھے طمانچہ مارا اور کہنے لگا ”جا اپنا کام کر، تجھ کو ان باتوں سے کیا غرض؟“ حضرت سلمانؓ اس وقت تو خاموش ہو گئے۔ رات ہوئی تو کوئی چیز لے کر قباء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے پاس یہ چیز جمع ہوگئی تھی۔ اب میں اس کو آپ کے پاس بہ طور صدقہ لے کر آیا ہوں کیونکہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک صالح بزرگ ہیں، اور آپ کے ساتھ حاجت مند لوگ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر اپنا دست مبارک روک لیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا ”کھاؤ۔ چنانچہ وہ سب کھانے میں مشغول ہو گئے اور سلمان واپس چلے آئے۔ پھر ایک مرتبہ اور آپ کی خدمت میں حسب سابق کوئی چیز لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا یہ آپ کے لئے ہدیہ ہے صدقہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک بڑھایا اور اس میں سے خود بھی کھایا اور دوستوں کو بھی کھلایا۔ حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں: ”میں نے یہ دیکھ کر کہا“ یہ دو علامتیں تو صحیح نکلیں، اب ایک خاتم نبوت کی علامت اور رہ گئی ہے، اس کا بھی امتحان کر لینا چاہئے۔ چنانچہ ایک اور دن حضرت سلمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایک جنازہ کے ساتھ بقیع الغرقد جا رہے تھے۔ حضرت سلمانؓ خاتم نبوت دیکھنے کی غرض سے پیچھے ہو گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منشاء معلوم کر لیا اور اپنے دوشِ مقدس سے چادر سرکا دی۔ حضرت سلمانؓ نے خاتم نبوت دیکھی تو فوراً بڑھ کر بوسہ دیا اور رونے لگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ اب حضرت سلمانؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پورا واقعہ سنایا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی دلچسپی لی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ کے اصحاب بھی اس کو سنیں۔ اس وقت حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس دولتِ لازوال کے مالک تھے جس کی تلاش و جستجو میں وہ اب تک سرگرداں پھرتے رہے تھے۔

آزادی:

لیکن غلامی کے باعث وہ آزادی کے ساتھ تمام اسلامی فرائض انجام نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ آپ بدر و اُحد کے معرکوں میں شرکت نہیں فرما سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلمانؓ کی اس مجبوری و بے بسی کو محسوس کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”تم اپنے آقا سے مکاتبت کر لو(1) حضرت سلمانؓ نے آقا سے اس کی خواہش ظاہر کی۔ معاملہ تین سو کھجور

(1) یعنی کوئی معاوضہ دے کر آزادی حاصل کرو۔

کے درخت لگانے اور چالیس اوقیہ سونے کے ادا کرنے پر طے ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم فرمایا کہ کھجور کے درخت لگانے میں سلمان کی مدد کریں۔ سب نے حسب مقدرت ان کی امداد کی۔ جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔ رہا سونا اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ایک شخص انڈے کے برابر سونا لئے ہوئے حاضر خدمت ہوا۔ تولنے پر معلوم ہوا کہ ٹھیک چالیس اوقیہ تھا۔ آنحضرت نے بُلا کر حضرت سلمانؓ کو دلوادیا جس کو ادا کر کے وہ نعمتِ آزادی سے بہرہ اندوز ہو گئے۔

مواخاۃ (بھائی چارہ):

آزادی کے بعد عرب کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ کسی کے حلیف ہوکر رہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ کی مواخات حضرت ابوالدرداءؓ سے کرادی۔ (۱)

غزوۂ خندق:

آزادی کے بعد سب سے پہلا معرکہ خندق کا پیش آیا حضرت سلمانؓ نے اس میں بڑے جوش وخروش اور شوق وذوق کے ساتھ شرکت فرمائی، بلکہ حق یہ ہے کہ اس معرکہ کی کامیابی ظاہری اسباب کے پیش نظر بڑی حد تک حضرت سلمانؓ کی تجربہ کاری، دانائی اور فراست کے ہی باعث تھی۔ اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل ایک زبردست جمعیت کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف امنڈ آئے تھے۔ حملہ مدینہ پر تھا جس کے اردگرد نہ قلعہ تھا اور نہ فصیل تھی۔ ادھر دشمنوں کی جمعیت کثیر، اور مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، حضرت سلمانؓ ایران کی معرکہ آرائیاں دیکھے ہوئے تھے۔ جنگ کے اصول سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت سلمانؓ نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے کھلے میدان میں جنگ نہ کرنی چاہئے بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ چاروں طرف خندقیں کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا جائے، اس تجویز کو پسند کیا گیا، خندق کھودی گئی تو اس کی کھدائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس شریک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار ومہاجرین کی یہ محنت ومشقت دیکھی تو بے ساختہ زبان مبارک سے نکلا:

"اللهم ان العيش عيش الأخرة فاغفر الانصار والمهاجرة."

ترجمہ: "اے اللہ زندگی تو دراصل آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو انصار و مہاجرین کو بخش دے۔"

---

(۱) شروع سے یہاں تک کے تمام حالات اسد الغابہ جلد۲ ص ۳۱۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱ سے ماخوذ ہیں۔

فدا کاران رسالت پناہ نے نبوت کی لسانِ صدق و محبت کو یوں نوا پیرا دیکھا تو جوشِ اطاعت میں بول اٹھے۔

"نحن الذین بایعوا محمداً
علی الجهاد مابقینا ابدًا" (۱)

"ہم ہی ہیں وہ جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم زندہ رہیں گے۔"

یہ واقعہ ۸ ذی قعدہ ۵ سنہ کا ہے۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حدود قائم کیں۔ داغ بیل ڈال کر دس دس گز زمین دس دس آدمیوں پر تقسیم کر دی۔ انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوا کہ حضرت سلمانؓ کدھر رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **سلمان منا اهل البیت** (سلمان تو ہمارے اہل بیت میں سے ہے)۔

حافظ ابن حجرؒ کی روایت کے مطابق دشمنانِ اسلام چوبیس ہزار کی فوج گراں لئے ہوئے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ یہاں آ کر دیکھا خندق کھدی ہوئی ہے اور اندر پہنچنا سخت دشوار ہے۔ وہ اس طریقۂ جنگ سے پہلے بے خبر تھے وہیں محاصرہ کر کے پڑ گئے تقریباً ایک ماہ تک مسلسل محاصرہ قائم رہا۔ مگر شہر تک پہنچنا ان کو نصیب نہ ہوا۔ مشرکین میں سے عمرو بن عبدود ایک مشہور بہادر جنگجو تھا وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور خندق عبور کر گیا، اب اس نے عرب کے دستور کے مطابق للکار کر کہا "کون ہے جو میرے مقابل آئے" حضرت علیؓ نے فرمایا: "میں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو خود دستِ مبارک سے تلوار عنایت کی اور عمامہ باندھا، کچھ گفتگو کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی۔ عمرو بن عبدود کے پہلے وار کے بعد حضرت علیؓ نے اس زور سے حملہ کیا کہ ان کی تلوار حریفِ مقابل کا شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ (۲) اس فتح میں بڑا دخل خندق کو تھا، جس کا مشورہ حضرت سلمانؓ نے ہی دیا تھا، اس لئے اس غزوہ کی کامیابی کو حضرت سلمانؓ کے فضائل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خندق کے بعد کوئی غزوہ ایسا نہیں ہوا جس میں حضرت سلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں۔ علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

"ولم یتخلف عن مشهد بعد الخندق." (۳)

"خندق کے بعد آپ کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہے۔"

---

(۱) بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔ (۲) سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۰، ۳۹۲۔ (۳) اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۰۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد فاروق کی ایرانی جنگوں میں بھی آپؓ شریک ہوئے اور چونکہ یہ خود ایرانی الاصل تھے اور جنگ کے طریقوں سے پوری طرح باخبر تھے اس لئے آپ سے اسلامی لشکر کو بڑی مدد ملی۔

گورنری:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں مدائن کے گورنر تھے۔ اس کے باوجود درویشی وفقر کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے اور اس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے۔ (۱)

زہدو اتقاء:

زہد واتقاء کی شان یہ تھی کہ عمر بھر کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ حضرت حذیفہؓ نے حضرت سلمانؓ سے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے ایک مکان بنادیں'' حضرت سلمانؓ نے فرمایا ''کیوں! کیا تم میرے لئے ایسا مکان بنانا چاہتے ہو جیسا کہ تمہارا مکان مدائن میں ہے'' حضرت حذیفہؓ نے کہا ''نہیں ہم آپ کے لئے بانس کا مکان بنائیں گے، جس کی چھت گھاس اور پھونس کی ہوگی، اور جو اس قدر مختصر ہوگا کہ آپ کھڑے ہوں گے تو اس کی چھت آپ کے سر کو لگے گی اور آپ لیٹیں گے تو اس کی دیواریں آپ کے دونوں پہلوؤں کو لگیں گی۔'' حضرت سلمانؓ بولے ''تم نے میرے دل کی بات پالی۔'' (۲)

پہلے گزر چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت سلمانؓ دونوں میں مواخات کرادی تھی حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابوالدرداءؓ شام چلے گئے اور حضرت سلمانؓ عراق میں قیام پذیر تھے۔ شام سے حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے بھائی کو لکھا ''میں یہاں بہت خوش ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مال واولاد دونوں کی نعمت وافر عطا فرمائی ہے اور میں یہاں ارض مقدس میں ہوں'' آپ نے اس کا جواب لکھا۔ ''سنو! مال واولاد کی کثرت یا ارض مقدس میں ہونا خیر نہیں ہے بلکہ خیر یہ ہے کہ تم کوئی ایسا عمل کرو جو تمہارے لئے مفید ہو اور تم اپنے تئیں مردہ لوگوں میں سے سمجھو۔ (۳)

---

(۱) طبقات ابن سعد ذکر حضرت سلمانؓ۔ (۲) اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱۔ (۳) اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱۔

فضائل:

حضرت سلمانؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تقرب حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''سلمانؓ رات کو دیر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو یہ ڈر ہو گیا کہ کہیں آپ ہم سے غافل نہ ہو جائیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے۔ علی، عمار اور سلمان'' حضرت علیؓ سے کسی نے حضرت سلمانؓ کے علم کے متعلق پوچھا۔ آپؓ نے فرمایا: ''انہیں اول و آخر کا علم دیا گیا ہے اور وہ ایک ایسے سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا(۱) حضرت صہیبؓ کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ صہیبؓ، بلالؓ اور سلمانؓ پر ناراض ہو گئے۔ آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ناراضگی کا اظہار کیا جس پر انہیں پشیمان ہونا پڑا۔

ایک دفعہ حضرت سلمانؓ نے اپنے اسلامی بھائی ابودرداءؓ کی بیوی کو آشفتہ حال دیکھا پوچھا ''تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔'' وہ کہنے لگی ''میں کس کے لئے بناؤ سنگھار کروں۔ تمہارے بھائی تو بالکل ہی تارک دنیا ہو گئے ہیں'' حضرت ابوالدرداءؓ مکان پر تشریف لائے تو حضرت سلمان کے لئے کھانا منگایا، مگر خود معذرت کی کہ میں روزہ سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ بولے ''تو میں بھی کھانا نہ کھاؤں گا۔'' رات کو آپؓ نے وہیں قیام فرمایا۔ شب کے آخر میں حضرت ابوالدرداءؓ عبادت کے لئے اٹھے تو آپؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا ''تم پر تمہارے رب، تمہاری آنکھ اور تمہاری بیوی کا سب کا حق ہے۔ روزوں کے ساتھ افطار اور شب بیداری کے ساتھ سونا بھی ضروری ہے۔ اگلے دن صبح کو دونوں نے یہ معاملہ بارگاہِ رسالت پناہ میں پیش کیا'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالدرداءؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''سلمان تم سے زیادہ مذہب سے واقف ہیں۔''(۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقرب خاص رکھنے کی وجہ سے صحابہ کرامؓ بھی آپؓ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ آپ اس وقت تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو دیکھتے ہی تکیہ آپ کے لئے ڈال دیا۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل سچ فرمایا'' عمر رضی اللہ تعالی عنہ بولے ''اے ابوعبداللہ کچھ بیان کیجئے آپؓ نے فرمایا ''میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

(۱) أسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱۔ (۲) استیعاب جلد ۲ ص ۵۷۲۔

خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ایک تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ آپ نے اس کو میرے سامنے ڈال دیا۔ پھر فرمایا "اے سلمان جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے پاس جائے اور وہ اس کے لئے ازراہِ تعظیم و تکریم اپنا تکیہ پیش کر دے تو خدا اس کی مغفرت کر دے گا۔ [1]

حضرت معاذؓ بن جبل خود بہت بڑے عالم اور صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد سے کہا کہ چار آدمیوں سے علم حاصل کرنا، ان میں ایک حضرت سلمانؓ کا نام بھی تھا۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمانؓ علم سے پُر ہے۔ [2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "سلمان الخیر" کا لقب بھی عطا فرمایا تھا۔

علالت اور وفات:

آپؓ کی عمر کے متعلق ارباب سیر و تاریخ نے عجیب و غُریب روایتیں لکھی ہیں۔ صاحب اصابہ فرماتے ہیں "اس میں تو کسی کو شک ہی نہیں کہ حضرت سلمانؓ کی عمر ڈھائی سو برس کی تھی۔ پھر ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپؓ نے اسی برس کی عمر پائی تھی، بہر حال حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں علیل ہوئے۔ حضرت سعدؓ آپ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، آپ رونے لگے۔ سعدؓ نے فرمایا "آپ روتے کیوں ہیں؟ اب موت قریب آ رہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے خوش دنیا سے رخصت ہوئے تھے اب آپ وہاں ان سے جا کر ملیں گے۔ بولے خدا کی قسم! میں موت سے نہیں گھبراتا۔ اور نہ دنیا کی حرص میری دامنِ گیر ہے۔ رونا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہمارا سامان ایک مسافر کے سامان رحلت سے زیادہ نہ ہو، اور میرے پاس اس قدر سانپ جمع ہیں" سعد فرماتے ہیں کہ کل سامان جس کو سانپ سے تعبیر کیا گیا تھا، یہ تھا۔ ایک بڑا پیالہ، ایک لگن اور ایک تسلہ۔ اس کے بعد سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "مجھ کو کوئی نصیحت کیجئے" فرمایا "جب کسی کام کا قصد کرو، فیصلہ کرو یا تقسیم کرو تو خدا کو یاد رکھو۔ [3]

حضرت سعدؓ کے علاوہ دوسرے احباب نے بھی آپؓ سے وصیت و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ حج، عمرہ، جہاد کرتے یا قرآن پڑھتے ہوئے جان دے اور گناہ و معصیت کی حالت میں نہ مرے" اخیر لمحات زندگی میں سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب آئے تو دیکھا آشیانۂ قدس کا طائر زریں بال قفس عنصری سے جدا ہو کر ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گیا ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

---

(۳) مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۹۹۔ (۲) طبقات ابن سعد جز ۴ ص ۶۱۔ (۳) مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۹۹۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

زید نام، کنیت ابواُسامہ وحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب'' لقب تھا۔ والد کا نام حارثہ اور ماں کا نام سعدیٰ بنت ثعلبہ تھا۔ والد یمن کے ایک نہایت معزز قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور والدہ قبیلہ طے کی ایک شاخ بنومعن سے تھیں۔

غلامی:

حضرت زیدؓ ابھی صغیر السن تھے کہ ان کی والدہ انہیں ساتھ لے کر اپنے قبیلہ بنومعن کے پاس گئیں راہ میں بنوقین کی ایک جماعت نے غارت گری کی اور زید کو غلام بنا کر بازار عکاظ میں بیچنا چاہا۔ حکیم بن حزامؓ نے اپنی پھوپی حضرت خدیجہ بنت خولد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے چار سو درہم کے بدلہ میں خرید کرلیا۔ سعادت مندی واقبال ازل میں مقدر ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے (نبوت سے قبل) انہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہ طور ہبہ پیش کر دیا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنالیا۔ چنانچہ لوگ عام طور پر آپ کو ''زید بن محمدؐ'' کہا کرتے تھے۔ پھر جب آیت "ادعوهم لاباء هم" (لوگوں کو ان کے باپوں کے نام سے بلاؤ) نازل ہوئی تو یہ کہنا چھوڑ دیا گیا۔

حضرت زیدؓ کے والد کو ان کے اس طرح گم ہو جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہ سب کے چہیتے اور لاڈلے تھے۔ صاحب اسد الغابہ اور ابن سعد نے ان کے چند اشعار جو انہوں نے فراقِ فرزند سے بے تاب ہو کر کہے تھے، نقل کئے ہیں:

۱. بکیت علیٰ زید ولم ادرما فعل	احی فیرجیٰ ام اتی دونه الاجل
۲. فو اللہ مادری وَانْ کنت سألا	اغالک سهل الارض ام غالک الجبل
۳. فیالیت شعری هل لک الدهر رجعة	فحسبی من الدنیا رجوعک لی بجل
۴. تذکرینی الشمس عند طلوعها	وتعرض ذکراه اذا قارب الطفل
۵. وان هبت الارواح هیجن ذکره	فیاطول ماحزنی علیه ویاوجل
۶. ساعمل نص العیس فی الارض جاهدا	ولا اسأم التطواف اوتسأم الابل
۷. حیاتی اوتاتی علی منیتی	وکل امرء فان وان غرهٔ الامل
۸. واوصی به قیسا وعمرا کلیهما	واوصی یزیدا ثم من بعدهم جبل

ترجمہ:

۱۔ میں زید کے لئے رویا پیٹا پھر بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا حال کیا ہے۔ آیا وہ زندہ ہے کہ پھر اس سے ملنے کی توقع کی جائے یا وہ مر گیا ہے۔

۲۔ بخدا اگرچہ میں سوال کرتا پھرتا ہوں لیکن پھر بھی نہیں جانتا کہ تجھ کو نرم زمین نے ہلاک کر دیا یا سخت زمین تجھ کو لے بیٹھی۔

۳۔ اے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تو کبھی واپس آئے گا یا نہیں۔ تیرا واپس آنا ہی میرے لئے دنیا میں بہت کافی ہے۔

۴۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی یاد دلاتا ہے، اور پھر جب ڈوبنے کے قریب ہوتا ہے تو اس وقت بھی اس کی یاد پیش آتی ہے۔

۵۔ ہوائیں چلتی ہیں تو وہ بھی اس کی یاد کو بھڑکا دیتی ہیں۔ آہ! میرا غم کتنا طویل و دراز اور میرے خوف کا کیا عالم ہے۔

۶۔ میں پوری کوشش کے ساتھ دنیا بھر میں اونٹ پر بیٹھ کر چکر لگاؤں گا اور ان چکروں سے تھکوں گا نہیں یہاں تک اونٹنی ہی تھک جائے۔

۷۔ زندگی بھر یہاں تک کہ مجھ پر موت آ جائے، اور ہر آدمی فنا پذیر ہے۔ اگرچہ اس کو امید نے دھوکہ دے رکھا ہو۔

۸۔ میں قیس اور عمر دونوں کو اس کے جستجو کی وصیت کرتا ہوں اور یزید کو ان کے بعد جبلہ کو وصیت کرتا ہوں۔ (جبل سے مراد حضرت زیدؓ کے بھائی جبلہ بن حارثہ ہیں اور یزید ان کے علاتی بھائی تھے۔"

ایک سال کلب کے چند آدمی حج کرنے کے لئے مکہ معظّمہ آئے۔ یہاں انہوں نے زیدؓ کو دیکھا تو پہچان لیا، انہوں نے ساتھ چلنے کو کہا ہوگا، حضرت زیدؓ نے فرمایا "میری طرف سے یہ پیغام میرے گھر والوں کو پہنچا دینا۔

۱. احن الی قومی وان کنت نائیا — فانی قعید البیت عند المشاعر

۲. فکفوا من الواجد الذی قد شجاکم — ولا تعملوا فی الارض نص الاباعر

۳. فانی بحمدالله فی خیرا سرة — کرام معد کابرا بعد کابر

ترجمہ:

۱۔ میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں اگرچہ بعید ہوں۔ میں خانہ کعبہ میں مشعر الحرام کے قریب رہتا ہوں۔

۲۔ پس تم اس غم سے باز آجاؤ جس نے تم کو غمگین کررکھا ہے۔ اور اونٹوں کو زمین میں مت ہنکاؤ۔

۳۔ کیونکہ میں بحمداللہ بہت اچھے قبیلے میں ہوں جو پشتہا پشت سے معد کے شریف آدمیوں کا قبیلہ ہے۔

کلبیوں نے جا کر حضرت زیدؓ کے والد حارثہ کو اس واقعہ کی پوری اطلاع دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پاس یہ مقیم تھے، آپ کے اور آپ کے اہل خانہ کے حالات بھی سنائے۔ حارثہ کی چشمِ تمنا جو دیدۂ یعقوب کی طرح ایک ''روزن دیوار'' ہو کر رہ گئی تھی اس میں پھر امیدوار مان کا نور جھلکنے لگا۔ یہ اور ان کے بھائی کعب دونوں فدیہ لے کر حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بلند مرتبت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ''اے عبدالمطلب کے فرزند ارجمند۔ اے ہاشم کے نورنظر، اے اپنی قوم کے سید اعلیٰ ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے معاملہ میں گفتگو کرنے آئے ہیں، آپ اس کو ہمارے حوالہ کر کے ہم پر احسان کیجئے، اور اس کا فدیہ قبول فرمائیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کون ہے؟'' بولے ''زید بن حارثہ'' ارشاد ہوا '' کیا اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟'' انہوں نے پوچھا ''وہ کیا؟'' فرمایا ''زید کو بلا لو اسے اختیار دے دو، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا پسند کرے تو ساتھ چلا جائے۔ اگر مجھ کو ترجیح دے تو میں اس شخص پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا جو مجھ کو ترجیح دیتا ہے'' یہ سب اس پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ زید بن حارثہ کو بلایا گیا۔ آپ نے پوچھا تم انہیں پہچانتے ہو۔ بولے ''جی ہاں! یہ میرے باپ ہیں اور یہ میرے چچا ہیں'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''رہا میں تو تم مجھ کو جانتے ہی ہو۔ اور میرا تمہارے ساتھ جیسا کچھ طرز رہا ہے اس کو بھی جانتے ہو، اب تمہیں اختیار ہے، مجھ کو پسند کر و یا ان دونوں کو اختیار کرلو۔''

حضرت زیدؓ سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف و مجد حاصل کر چکے تھے جس پر دنیا جہاں کی نعمتیں اور آزادیاں قربان کی جاسکتی ہیں، بے تامل بولے ''میں ان دونوں کو ترجیح نہیں دیتا میں وہ نہیں ہوں کہ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ترجیح دے سکوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لئے بمنزلۂ والد بھی ہیں اور چچا بھی۔ حارثہ اور ان کے بھائی کعب بولے ''زید! افسوس! تم آزادی پر غلامی کو اور اپنے باپ اور چچا پر غیر کو ترجیح دیتے ہو؟ فرمایا' جی ہاں! مجھے اس ذات گرامی میں کچھ ایسی ہی خوبیاں نظر آئی ہیں کہ میں کبھی کسی شخص کو ان پر ترجیح نہیں دے سکتا'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کی غیر معمولی وفاداری واطاعت کوشی کا یہ ولولہ انگیز مظاہرہ دیکھا تو فرطِ ترحم و شفقت سے حضرت زید کا ہاتھ پکڑ کر مقام حجر تک تشریف لائے، اور اعلان فرمادیا ''اے وہ لوگو جو اس وقت

موجود ہو۔ تم سب گواہ رہو کہ زید میرا فرزند ہے، وہ میرا وارث ہوگا، اور میں اس کا وارث ہوں گا۔ حضرت زیدؓ کے والد اور چچا نے یہ دیکھا تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو گئے۔ اور واپس چلے گئے۔ (۱)

اسلام: پھر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرقِ مبارک پر ختم رسالت کا تاجِ گوہریں رکھا گیا اور اسلام کا شروع شروع میں غلغلہ بند ہوا تو حضرت زیدؓ بھی دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے بلکہ امام زہری کی روایت ہے **ما علمنا احداً اَسْلَمَ قبل زید بن حارثہ** (ہم کو نہیں معلوم کہ حضرت زید سے پہلے کوئی اور اسلام لایا ہو) لیکن اس میں علماء نے کلام کیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جس طرح عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی حضرت خدیجہؓ، مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ ہیں اسی طرح غلاموں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے حضرت زیدؓ ہیں۔ حضرت حمزہؓ مسلمان ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے ان کی مواخات کرادی۔

نکاح: حضرت اُم ایمنؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آیا اور کنیز تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کا نکاح ان سے کر دیا، جن کے بطن سے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔

ہجرت: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے حضرت زیدؓ بھی مدینہ پہنچے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت اسید بن حضیر انصاری کا جو قبیلۂ عبدالاشہل کے معزز رئیس تھے، بھائی بنا دیا اور ان کے رہنے کے لئے ایک مکان مخصوص کر دیا۔ یہیں آپ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کر دیا۔ مگر طبائع کی عدم موافقت کے باعث دونوں میں نباہ نہ ہو سکا مجبوراً حضرت زیدؓ نے آپ کو طلاق دے دی۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہئے کہ حضرت زیدؓ کا نکاح حضرت زینبؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے اور رائے سے ہوا تھا۔ حضرت زینبؓ اس رشتہ پر رضامند نہیں تھیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ بہت عزیز تھے، اس لئے آپ نے چاہا کہ ان کا نکاح آپ کی پھوپی زاد بہن (زینب) سے ہو جائے جو حسب ونسب میں مرتبۂ بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ حسن و جمال میں بھی ممتاز تھیں۔ حضرت زینبؓ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحانِ طبع کا احترام کرتے ہوئے زید سے نکاح کرنا منظور تو کر لیا لیکن یہ ظاہر ہے میاں بیوی کے تعلقات اگر دونوں کے مزاج میں موافقت نہ ہو اس طرح کے رکھ رکھاؤ سے نبھ نہیں سکتے۔

---

(۱) یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ طبقات ابن سعد میں بھی مذکور ہے، مگر ہم نے اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۴، ۲۲۵ سے لیا ہے۔

چنانچہ یہی ہوا دونوں میں آئے دن نا اتفاقی رہنے لگی۔ حضرت زیدؓ بارگاہ رسالت پناہ میں بیوی کی تیز زبانی اور عدم موافقت کا شکوہ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ طلاق دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا:

"امسک علیک زوجک واتق اللہ."

"تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور خدا سے ڈرو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ ہوتا تھا کہ میں نے بہت کچھ کہہ سن کر تو زینب کو نکاح پر آمادہ کیا تھا۔ اب ان کو طلاق مل گئی تو انہیں طبعی طور پر اس کا بڑا رنج و ملال ہوگا۔ اور چونکہ اس نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا دخل تھا۔ اس لئے حضرت زینبؓ کی طلاق کا خیال کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی یک گونہ انفعال و اثر محسوس کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ کا جملۂ بالا ظاہر کرتا ہے۔

دونوں میں نا اتفاقی بڑھتی گئی یہاں تک کہ بحکم وان خفتم الایقیما حدود اللہ الآیہ نوبت طلاق کی آئی۔ حضور پُرنور رحمۃ للعالمین تھے، آپ کو طبعاً اس کا ملال ہوا۔ اور خصوصاً حضرت زینبؓ کی دل شکستگی اور خانہ ویرانی کا خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بھی تکلیف پہنچاتا تھا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ کسی طرح اس کی مکافات کر دیں اور نکاح و طلاق سے جو زخم حضرت زینبؓ کے دل پر لگا تھا۔ اس کی کوئی تدبیر چارہ گری کریں۔ مکافات کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا تدبیر ہو سکتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو شرف زوجیت بخشنا چاہا۔ حضرت زینبؓ کے نکاح میں بہت کچھ حکمتیں ہوں گی۔ بادی النظر میں تین فائدے تو بالکل عیاں ہیں:

۱۔ اسلام میں غلام رہنے سے کسی کی ذات پر بٹہ نہیں لگ جاتا۔ حضرت زیدؓ غلام تھے مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی پھوپی زاد بہن سے کر دیا۔

۲۔ پھر پھوپی زاد بہن جو ایک غلام کی مطلقہ بیوی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، بلکہ پوری بشاشت طبع کے ساتھ نکاح کیا۔

۳۔ تیسرا اہم فائدہ جو اس سے حاصل ہوا وہ یہ بتانا تھا کہ "لے پالک" کا حکم اپنے بیٹے کا سا نہیں ہے اس کی بیوی اگر مطلقہ ہو جائے تو اس سے نکاح ہو سکتا ہے۔

پھر اس واقعہ سے جہاں یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں سرکار دو جہاں کی مروت، رحمت و رافت، اور وضع و پاسداری بھی نمایاں ہوتی ہے کہ محض حضرت زینبؓ کی دل شکستگی کو دور کرنے کے

لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا۔

چنانچہ انقضاء عدت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کی معرفت خود اپنے نکاح کا پیام حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا، وہ خود عاقلہ وفہیمہ تھیں جانتی تھیں کہ میرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ قرآن کی کوئی آیت اس کے متعلق نازل نہ ہو۔ بولیں "دیکھئے خدا کی طرف سے کیا حکم آتا ہے" اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

"**فلما قضی زید منھا وطرا زوجنکھا.**"

"جب زید نے حاجت پوری کرلی تو ہم نے ان کا نکاح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کر دیا۔"

اسی واقعہ کے سلسلہ میں منافقوں نے جو ناگوار شہرت پیدا کردی تھی۔ قران حکیم نے اس کے رد میں فرمایا:

"**ما کان محمدٌ ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین .**"

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔"

مسلمانوں کو حکم دیا گیا:

"**ادعوھم لآ باء ھم ھو اقسط عند اللہ.**" (۱)

"لوگوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ زیادہ قرین انصاف ہے۔"

کارنامے: حضرت زیدؓ تیر اندازی میں یگانۂ روزگار تھے۔ معرکۂ بدر سے غزوۂ موتہ تک تمام اہم اور زبردست معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت عائشہؓ تو یہاں تک فرماتی ہیں کہ حضرت زیدؓ جس کسی سریہ (فوج کشی) میں شریک ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کو سردار بناتے تھے۔ اور اگر حضرت زیدؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی زندہ ہوتے تو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ہی اپنا خلیفہ مقرر کرتے۔ (۲) چنانچہ سریہ قردہ، سریہ جموم، سریۂ عیص، سریۂ طرف وحسمیٰ ان سب مہمات میں اسلامی لشکر کی قیادت حضرت زیدؓ ہی کے سپرد تھی جس کو آپؓ نے بخوبی سرانجام دیا۔ اور کامیاب و بامراد ہو کر واپس آئے۔

---

(۱) اس واقعہ کے سلسلہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

"اذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشہ۔"

"جبکہ آپ نے اس سے جس پر اللہ نے اور آپ نے انعام کیا تھا (یعنی زید پر) کہا کہ اپنی بیوی کو روکے رہو اور اللہ سے ڈرو اور تم آپ اپنے نفس میں وہ چیز چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔"

"متعصب عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو عجیب وغریب رنگ دے کر لکھا ہے۔ اور کسی اور کا کیا ذکر خود بعض علماء تفسیر نے اپنی کتابوں میں ایسی بے سروپا روایتیں بھر دی ہیں جن کے باعث معترضین کو اسلام پر حرف گیری کا موقع ملتا ہے خاص حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق عام تفسیروں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں حافظ ابن حجر ان کی نسبت بالکل صفائی سے فرماتے ہیں۔"

"ووردت اثار اخری اخرجھا ابن ابی حاتم والطبری ونقلھا کثیرٌ من المفسرین لاینبغی التشاغل بھا۔"

"اس کے علاوہ وہ دوسرے آثار جن کو ابن ابی حاتم وطبری نے بیان کیا ہے اور جن کو بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے ان کے ساتھ مشغول ہونا مناسب نہیں ہے۔"

نہایت افسوس کی بات ہے، ارباب تفسیر روایتوں کی نقل میں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ آیتوں کو ایسے ایسے معانی پہنائے جاتے ہیں جو ہر ایک روایت پر منطبق ہو جائیں ورنہ یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات بالا میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت میں کسی قسم کی گستاخی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو بھی پیدا ہو سکے۔

"تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ۔"

"آپ اپنے نفس میں وہ چھپاتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔"

اس اخفا سے مراد صرف یہ ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کی دل شکستگی کو رفع کرنے کے لئے جو خود ان سے نکاح کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ آپ اس کو لوگوں پر اس اندیشہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے کہ قرآن مجید میں اب تک متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا ہے۔ منافقین اب اس خبر کو سنیں گے تو عہد جاہلیت کے خیال کی بناء پر طعن شروع کر دیں گے کوتاہ نظر غیر مسلم مصنفین نے اس واقعہ کو ایک افسانہ کا رنگ دے رکھا ہے حالانکہ اگر وہ ذرا تعصب اور بے جا ضد سے ہٹ کر دیکھیں تو انہیں یہ واضح ہو جائے کہ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تردد اور پھر آیت کے نزول کے بعد اس کا صاف وصریح اعلان کر دینا خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ غور کیجئے ایک طرف تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ سے یہ فرماتے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اللہ سے ڈرو اور دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ ہے کہ حضرت زیدؓ بغایت مجبوری طلاق دے دیتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود نکاح کا پیام ان کے پاس بھیجتے ہیں۔ ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینبؓ سے نکاح کسی تعلق خاطر کی بناء پر تھا یا محض اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تسلی وتشفی کرنا چاہتے تھے اور یہ بتانا منظور تھا کہ متبنیٰ کا حکم بالکل فرزند کا سا نہیں ہے۔

(۲) اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۶۔

فضائل:

حضرت زیدؓ کی فضیلت و بزرگی کے لئے یہی بات کیا کچھ کم ہے کہ تمام صحابہ کرام میں صرف حضرت زیدؓ کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے بہت زیادہ محبت تھی آپ خانوادۂ نبوت میں بالکل ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص زیدؓ کی شان میں گستاخی کا کوئی کلمہ کہہ دیتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے ''ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصری فوج کسی مہم پر روانہ کی اور حضرت اسامہؓ بن زید کو اس کا سردار بنا دیا اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم اسامہ کی امارت پر اعتراض کرتے ہو (تو کوئی مضائقہ نہیں) اس سے پہلے اس کے باپ زید بن حارثہ کی سرداری پر بھی تم لوگ اسی قسم کا اعتراض کر چکے ہو۔ قسم خدا کی وہ یقیناً امارت کا سزاوار تھا، اور لوگوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور اس کے بعد یہ (اُسامہ) سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔ (۱)

حضرت زیدؓ روئی کی طرح سپید تھے، اور حضرت اسامہؓ کا رنگ سیاہ تھا۔ بعض مفسدہ پرداز اس اختلاف رنگ کی بناء پر حضرت اسامہؓ کے نسب میں طعن کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے تھے تو ملول ہوتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو مسکراتے ہوئے اور اس قدر خوش کہ آپ کا چہرۂ اقدس جگمگا اٹھا تھا اور آتے ہی فرمایا۔ ''عائشہ! تمہیں خبر نہیں، ابھی ایک قیافہ شناس آیا تھا جس کا نام مجزز تھا اس وقت زید بن حارثہ اور اسامہ دونوں ایک چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے اور ان کے پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ اس شخص نے دونوں کے پاؤں دیکھتے ہی کہا کہ یہ پاؤں بالکل ایک دوسرے کی مانند ہیں (یعنی ان دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے)۔ (۲)

اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت زیدؓ و اسامہؓ کے ساتھ غایت محبت کا ثبوت ملتا ہے کہ اگرچہ قیافہ شناس کی بات اسلام میں حجت نہیں ہے، تاہم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی زبان سے ایک ایسی بات سنی جس سے حق کی تصدیق و توثیق ہوتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوئے۔

---

(۱) بخاری باب مناقب زیدؓ بن حارثہ۔ (۲) بخاری کتاب الفرائض باب القائف۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ حضرت زیدؓ کہیں باہر سے مدینہ میں آئے۔ اور میرے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنتے ہی بیتابانہ اٹھے۔ یہاں تک کہ آپ نے لباس کا بھی اہتمام نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک زمین پر گھسٹ رہی تھی اور جاتے ہی حضرت زیدؓ سے معانقہ کیا، اوران کو بوسہ دیا۔ (۱)

حضرتؓ کے ساتھ اس درجہ تعلق خاطر رکھنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کی اولاد کے ساتھ بھی بے حد شفقت ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کے کسی گوشہ میں اپنے کپڑے گھسیٹ رہا ہے۔

عبداللہ بن دینار پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے آپ نے فرمایا ''دیکھو یہ کون ہے؟ اے کاش یہ میرے پاس آئے'' ایک شخص بولا ''کیا آپ اسے نہیں جانتے؟ یہ تو محمد اسامہؓ کا فرزند ہے'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سنتے ہی سر جھکا لیا اور ہاتھوں سے زمین کریدنے لگے۔ پھر فرمایا۔ اگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرماتے تو ضرور پسند کرتے۔ (۲)

حضرت اسامہؓ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اور حضرت حسنؓ کو پکڑتے اور دونوں کے لئے دُعاء فرماتے:

''اللھم احبھما فَاِنِّی احبھما.'' (۳)

''اے اللہ! تو ان دونوں سے محبت کر، کیونکہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں۔''

حضرت اسامہؓ تو پھر بھی بیٹے تھے حرملہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حجاج بن ایمن جن کے باپ یعنی ایمن حضرت اسامہ بن زید کے علاتی بھائی تھے۔ اور جو ابھی کمسن ہی تھے، مسجد میں آئے، اور بچوں کی طرح ادھ کچری نماز پڑھنی شروع کردی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا ''نماز لوٹاؤ'' پھر جب واپس چلے گئے تو آپ نے پوچھا یہ کون تھے؟'' حرملہ نے کہا ''یہ حجاج بن ایمن بن ام ایمن ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے ''اگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو ضرور ان سے محبت کرتے۔ (۴)

---

(۱) رواہ الترمذی مشکوٰۃ المصابیح باب المصافحہ والمعانقہ۔ (۲) بخاری باب مناقب زید بن حارثہ۔

(۳) بخاری باب مناقب زید بن حارثہ۔ (۴) ایضاً۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے تھے ''بخدا حضرت زیدؓ افسری کے لائق تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے محبوب تھے۔ پھر یہی ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت اسامہ کا وظیفہ میرے وظیفہ سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا ''اے بیٹے اسامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ، اور اسی طرح اس کے باپ (زید) تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھے۔ (۱)

غزوہ موتہ اور شہادت:

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں موتہ کا جو شام کا ایک مقام ہے، غزوہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کے نام ایک خط تحریر فرمایا، اور حضرت حارث بن عمرؓ کو نامہ بری کے لئے مقرر کیا۔ یہ خط لے جا رہے تھے کہ علاقہ بلقاء کا ایک رئیس حکمران جس کا نام شرجیل بن عمرو اور عیسائی مذہب کا پیرو تھا، اس نے حارثؓ کو قتل کر دیا۔ قاصد کو قتل کرنے کا رواج کہیں بھی نہیں تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدعہدی پر بڑا غصہ آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مجاہدینِ اسلام کی ایک فوج حضرت حارثؓ کا انتقام لینے کے لئے روانہ کی۔ اس لشکر میں حضرت جعفر طیارؓ حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور عبداللہ بن رواحہؓ جو ایک معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، شریک تھے لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی قیادت کا شرف حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ہی بخشا۔ لوگوں نے اور خود عبداللہ بن رواحہؓ نے شکایت کی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم جاؤ تمہیں معلوم نہیں کہ خیر کس میں ہے؟'' (۲) اور ارشاد ہوا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب، اور اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ لشکر کے امیر ہوں حضرت زیدؓ نے حسب دستور اس غزوہ میں بھی خوب دادِ شجاعت دی۔ لیکن آخرام برچھیاں کھا کر شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد علم حضرت جعفرؓ کے دستِ مبارک میں آیا۔ انہوں نے بھی جوانمردی و بہادری کے حیرت انگیز جوہر دکھائے۔ انجام کار وہ بھی شہادت کبریٰ کا جام نوش کر کے خاموش ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں کی شہادت کا حال سنا تو بڑا رنج ہوا اور فرمایا:

''اخوائی ومونسائی ومحدثائی.'' (۳)

---

(۱) اصابہ ج ۳ ص ۳۶۔ (۲) ابن جریر طبری ج ۳ ص ۱۰۹۔ (۳) اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۷۔

''یہ دونوں میرے بھائی، میرے مونس اور مجھ سے بات چیت کرنے والے تھے۔''

عمر اور حلیہ:

شہادت کے وقت حضرت زیدؓ کی عمر پچپن برس کی تھی[1] ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا اور پست قامت تھے۔[2]

ازواج:

شادیاں مختلف اوقات میں متعدد کی تھیں۔ بیویوں کے نام یہ ہیں:
ام ایمن، کلثوم بنت عقبہ، درۃ بنت لہب، ہند بنت العوام، زینب بنت جحش۔

اولاد:

دو لڑکے اسامہؓ بن زید اور زید بن زید تھے، اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام رقیہ تھا، حضرت اسامہؓ کے علاوہ دونوں بچے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔[3]

---

(۱) اصابہ جلد۳ ص ۲۶۔ (۲) اسد الغابہ ذکر زید بن حارثہ۔ (۳) طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۳۰۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

عمار نام ابوالیقظان کنیت والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے" عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن الحصین بن انودیم بن ثعلبہ بن عوف بن حارثہ ابن عامر الاکبر بن یام بن عنس بن مالک بن اود بن زید بن یشجب المذحجی ثم العنسی۔(۱)

ان کے والد یاسر قحطانی النسل تھے۔ یمن ان کا اصل وطن تھا۔ اپنے دو بھائی حارث اور مالک کے ساتھ ایک گم شدہ بھائی کی جستجو میں مکہ پہنچے، وہ دونوں واپس لوٹ گئے حضرت یاسرؓ یہیں مقیم ہوگئے اور بنو مخزوم کے حلیف ہوکر اس قبیلہ کے ایک شخص ابوحذیفہ بن المغیرہ کی جاریہ سمیہ سے شادی کرلی۔ انہیں کے بطن سے حضرت عمار پیدا ہوئے۔ ماں کی وجہ سے یہ بھی غلام سمجھے جاتے تھے۔ ابوحذیفہ نے ان کو بچپن میں ہی آزاد کردیا تھا(۲) اس بنا پر بنومخزوم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔

اسلام:

حضرت عمار بن یاسرؓ اسلام قبول کرنے کی سعادت وشرف کے اعتبار سے السابقون الاولون میں سے ہیں۔ یہ اور حضرت صہیبؓ دونوں ساتھ ایمان لائے تھے وہ خود فرماتے ہیں "کہ میں نے صہیب کو ارقم بن ابی ارقم کے دروازۂ مکان پر دیکھا تو پوچھا" آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں؟ بولے" پہلے تم اپنا مقصد ظاہر کرو" میں نے کہا" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل کر ان کی کچھ باتیں سننا چاہتا ہوں" کہنے لگے" میرا مقصد بھی یہی ہے" اس کے بعد دونوں ساتھ چلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمارؓ جس وقت اسلام لائے تھے اس وقت تک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے علاوہ صرف پانچ غلاموں اور دو عورتوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت مجاہدؒ کی روایت ہے کہ اس وقت تک صرف سات اصحاب نے ہی اسلام قبول کیا تھا، مگر صحیح یہ ہے کہ کچھ اوپر بیس لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔(۳)

---

(۱) اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۳۔ (۲) اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۳-۴۴۔ (۳) اسد الغابہ۔

تکالیف و مصائب:

اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ خود دنیوی وجاہت و ثروت نہیں رکھتے تھے اور اس وقت تک ان کی والدہ سمیہ بھی بنو مخزوم کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئی تھیں اور اسلام کا جلوۂ جہاں فروز کچھ اس طرح اس خاندان کو منور کر چکا تھا کہ حضرت عمارؓ کے علاوہ ان کی والدہ اور والد بھی مشرف باسلام ہو چکے تھے اس بناء پر کفار ان پر سخت سے سخت مظالم کرتے تھے۔ جلتے ہوئے ریت پر لٹا دیتے اور بری طرح زدوکوب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان تینوں کو ستایا جا رہا تھا کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا۔ اپنے شیدائیوں کو اس حالت میں دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھر آیا اور فرمایا ''اے آل یاسر تم صبر کرو۔ تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔ (۱)

حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت:

آپ کی والدہ سمیہ کے ساتھ بدبخت ابوجہل نے انتہا درجہ کا وحشیانہ معاملہ کیا جس کی وہ تاب نہ لا سکیں اور جاں بحق ہو گئیں۔ ان کو اسلام کی راہ میں اس طرح شہید ہو جانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ابوجہل غزوۂ بدر میں مارا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمارؓ سے فرمایا ''اللہ نے تمہاری ماں کے قاتل کو قتل کر دیا'' ابن قتیبہ کو دھوکا ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ حضرت یاسرؓ کے بعد سمیہؓ کا نکاح ایک شخص ازرق نامی سے ہو گیا تھا۔ یہ سمیہ حضرت عمار کی نہیں بلکہ زیاد کی والدہ ہے۔ (۲)

ایک مرتبہ مشرکین نے حضرت عمارؓ کو پانی میں اس قدر غوطے دیئے کہ وہ بالکل بدحواس ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان ظالموں نے ان کی زبان سے ایک ناشائستہ کلمہ بھی کہلوا لیا، اس وقت تو انہیں مصیبت سے نجات مل گئی، مگر بعد میں ہوش آیا تو غایت ندامت و خجالت کے ساتھ بارگاہِ رسالت پناہؐ میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے'' انہوں نے پورا واقعہ اول سے آخر تک کہہ سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم اپنا دل کیسا پاتے ہو'' کہا ''میرا دل ایمان پر مطمئن ہے'' سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے غایت شفقت کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور فرمایا ''کوئی مضائقہ نہیں، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

"من كفر بالله من بعد ايمانه الا من اكره وقلبه مطمئن بالايمان." (۳)

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۳۔ (۲) اصابہ ج ۸ ص ۱۱۴۔ (۳) طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عمار و اسد الغابہ۔

''جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (اس سے باز پرس نہ ہوگی)۔''

سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں:

''میں نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے دریافت کیا ''کیا مشرکین مسلمانوں کو اس قدر اذیتیں پہنچاتے تھے کہ اگر وہ ان کی تاب نہ لاکر دین چھوڑ دیتے تو انہیں معذور سمجھا جاتا'' فرمایا ''ہاں! بخدا یہ لوگ ان غریبوں کو مارتے تھے ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ دردو کرب کے مارے اٹھنے بیٹھنے سے بھی عاجز ہو جاتے تھے۔ اور بعض تو مجبور ہو کر مشرکین کے منشاء کے مطابق نادرست باتوں کا اظہار اپنی زبان سے کر بیٹھتے تھے۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جو کچھ فرمایا بعینہ حضرت عمارؓ پر صادق آتا ہے۔ انہوں نے اسلام کی راہ میں طرح طرح کی سخت اور ناقابل برداشت مصائب اٹھائے، لیکن زبان سے لغزش ہو جانے کے باوجود ان کا دل برابر صبر و استقامت کے ساتھ ایمان پر مطمئن رہا یہاں تک کہ ان کی تسلی اور معاملہ کی صفائی کے لئے قرآن مجید کی ایک آیت نازل ہوئی۔

ہجرت: بعضوں کا خیال ہے کہ حضرت عمارؓ ان لوگوں میں سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ مگر بعض اس سے مختلف ہیں۔ مدینہ کی ہجرت کا حکم ہوا تو حضرت عمارؓ بھی روانہ ہوئے اور اس سرزمین قدس میں پہنچ کر حضرت مبشر بن عبدالمنذرؓ کے مہمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ان کی مواخات حضرت حذیفہ بن الیمان انصاریؓ سے کرادی اور مستقل سکونت کے لئے ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا۔ (۲)

تعمیر مسجد قبا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو حضرت عمارؓ نے خیال کیا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک مکان سے چارہ نہیں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قیلولہ سے فارغ ہو کر اٹھیں تو اس کے سایہ میں تشریف فرما ہوں، اور وہاں نماز پڑھیں، چنانچہ آپ نے پتھر جمع کئے، اور مسجد قبا کی تعمیر کی یہ مدینہ کی سب سے پہلی مسجد تھی جو حضرت عمارؓ کے ہاتھ سے انجام کو پہنچی۔ (۳)

---

(۱) اسد الغابہ جلد ۴ص ۴۴ و ۴۵۔ (۲) طبقات ابن سعد ج ۳ص ۱۷۹۔ (۳) مستدرک حاکم ج ۳ص ۳۷۵۔

تعمیر مسجد نبوی: ہجرت کے چھ سات ماہ بعد مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی گئی تو حضرت عمارؓ نے اس میں بھی حصہ لیا۔ آپ اینٹ گارا لا لا کر دیتے تھے اور زبان پر یہ رجز جاری تھا:

''نحن المسلمون نبنی المساجد.''

''ہم مسلمان ہیں، ہم مسجد بناتے ہیں۔''

سب لوگ ایک ایک اینٹ اٹھاتے تھے اور حضرت عمارؓ دو دو اینٹ لاتے تھے ایک دفعہ اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ازراہِ شفقت فرمایا: ''اے عمار، سنو تم کو باغی فرقہ قتل کرے گا اور تم اہل جنت میں سے ہو۔[1]

ایک مرتبہ کسی نے ان پر اتنا بوجھ لاد دیا کہ لوگوں کو خیال ہوا آج عمار نہ بچیں گے وہ اس سے پہلے بھی تکلیف شاقہ کی شکایت کر چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر کچھ اینٹیں اتار کر پھینک دیں اور ارشاد ہوا۔ افسوس! ابن سمیہ تمہیں گروہ باغی قتل کرے گا۔

غزوات کی شرکت:

حضرت عمارؓ شروع سے بڑے پر جوش اور بہادر مسلمان تھے۔ غزوۂ بدر سے غزوۂ تبوک تک جتنے معرکے پیش آئے، پوری بہادری اور دلیری کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں جو جنگیں ہوئیں ان میں سے اکثر میں شریک رہے۔ یمامہ کی جنگ میں ان کا ایک کان شہید ہو گیا جو پاس ہی زمین پر پھڑک رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس زور سے پے بہ پے حملے کرتے رہے کہ جس کسی طرف کا رخ کیا صفیں کی صفیں الٹ گئیں۔ ایک دفعہ کچھ لوگ دل شکستہ ہو کر اقدام سے جی چرانے لگے انہوں نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر زور سے کہا ''اے مسلمانوں کے گروہ! کیا تم جنت سے بھاگتے ہو، میں عمار بن یاسرؓ ہوں کیا تم جنت سے گریز کرتے ہو۔ دیکھو! میں عمار بن یاسرؓ ہوں۔ آؤ میری طرف۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ''عمار یہ کہتے جاتے تھے اور میں ان کے کان کو دیکھ رہا تھا'' کہ لٹکا ہوا تھا'' اور وہ بڑے زور سے حملے کرتے تھے۔[2]

کوفہ کی گورنری:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان کو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے ہمراہ کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس موقعہ پر آپ نے جو فرمان اہل کوفہ کے نام ارسال کیا تھا ہم

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۷۔ (۲) مستدرک ج ۳ ص ۳۸۷۔

اس کو ذیل میں بعینہٖ نقل کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اجلۂ صحابہ صاحب علم وفضل آزاد کردہ غلاموں کی کتنی توقیر کرتے تھے، تحریر فرماتے ہیں:

"اما بعد فانی بعثت الیکم عمار بن یاسر امیرا وعبداللّٰہ بن مسعود معلماً ووزیرا وقد جعلت ابن مسعود علی بیت مالکم وانھما لمن النجباء من اصحاب محمد من اھل بدرٍ فاسمعوا لھما واطیعوا واقتدوبھما وقداثرتکم بابن ام عبد علی نفسی وبعثت عثمان ابن حنیف علی السواد ورزقھم کل یوم شاۃ فاجعل شطرھا وبطنھا لعمار والشطر الباقی بین ھؤلاء الثلاثۃ." (۱)

"امابعد! میں عمار بن یاسرؓ کو امیر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو وزیر و معلم بنا کر تمہارے پاس بھیجتا ہوں ابن مسعود تمہارے بیت المال کے منتظم ہوں گے یہ دونوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شریف ساتھیوں میں سے ہیں اور غزوۂ بدر میں شرکت کی سعادت رکھنے والے ہیں، تم سب ان کا کہا مانو، اطاعت کرو اور ان دونوں کی پیروی کرو میں نے ام عبد کے بیٹے (عبداللہ بن مسعودؓ) کو تمہارے پاس بھیج کر تم کو خود اپنے نفس پر ترجیح دی ہے اور عثمان بن حنیفؓ کو ارض سواد کی پیمائش کے لئے بھیجتا ہوں۔ ان کی خوراک کے لئے ایک بکری یومیہ مقرر کی جاتی ہے جس کا ایک حصہ اور پیٹ عمارؓ کو ملے گا اور بقیہ حصے ان تینوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔"

حضرت عمارؓ نے ایک سال نو ماہ تک فرائض امارت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے لیکن کوفہ کے لوگ انتہا درجہ کے تند مزاج اور متلون واقع ہوئے تھے۔ کسی ایک امیر کی اطاعت پر قائم رہتے ہی نہ تھے عمارؓ سے قبل یہاں کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ ان کی اہلیت و قابلیت میں کیا کلام ہو سکتا ہے مگر کوفہ والوں نے حسب عادت ان کی اتنی شکایتیں دربار خلافت تک پہنچائیں کہ آخر کار انہیں معزول کرنا پڑا۔ حضرت سعدؓ کے بعد جب عمارؓ گورنر ہو کر آئے، تو ان کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی معاملہ کیا، اور حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بار بار لکھ کر بھیجا کہ "عمارؓ کمزور ہیں، انہیں سیاست نہیں آتی" خلیفۂ دوم کو اہل کوفہ کی اس تلون مزاجی پر بڑا افسوس ہوا اور آپ نے فرمایا:

---

(۱) یہ فرمان اختصار کے ساتھ "اسد الغابہ" میں بھی ہے مگر اس تفصیل کے ساتھ طبقات ابن سعد جز۳ ص۱۸۲ میں مذکور ہے۔

"من يعذرني من اهل الكوفة ان استعملت عليهم القوى فجروه وان وليت عليهم الضعيف حقروه." (۱)

"اہل کوفہ کی طرف سے مجھ کو معذور رکھنے والا کون ہے۔ اگر میں ان پر قوی کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس سے انحراف کرتے ہیں اور اگر ضعیف کو ان پر حاکم مقرر کرتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر کرتے ہیں۔"

بہر حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو معزول کر کے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

معزولی کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا "تم معزولی کے حکم سے ناراض تو نہیں ہوئے؟ بولے "میں نہ اس امارت سے خوش تھا اور نہ اب عزل سے خوش ہوں۔ (۲)

خلیفہ ثالث کے عہد میں حضرت عمارؓ خوش نہیں رہے۔ ایک تحقیقات کے سلسلہ میں مصر بھیجے گئے تھے، ایک عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آئے تو ان پر اہل مصر کے خیالات کا گہرا اثر تھا۔

خلیفہ چہارم کے عہد میں:

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تمام اہم امور میں اپنا مشیر مقرر کر لیا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ وغیرہ نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کے سلسلہ میں جنگی تیاریوں کے لئے بصرہ کا رخ کیا تو حضرت علیؓ کے حکم سے آپؓ حضرت امام حسنؓ کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے کہ اہل کوفہ کو خلافت کے تحفظ وحمایت پر آمادہ کریں۔

جنگ جمل: ماہ جمادی الاخری ۳۶ھ میں جمل کی ناگوار جنگ پیش آئی تو حضرت عمارؓ حضرت علیؓ کے ساتھی تھے اور فوج کے میسرہ کی قیادت کرتے تھے۔ اس جنگ میں بھی حسب معمول حضرت عمارؓ نے غیر معمولی جرأت و دلیری اور شجاعت و مردانگی کا ثبوت دیا۔

جنگ صفین: اس کے بعد امیر معاویہؓ سے صفین کا معرکہ پیش آیا اس وقت حضرت عمارؓ کی عمر اکیانوے برس کی تھی مگر حوصلہ اور ہمت جوانوں سے بڑھ کر تھی۔ نہایت جوش وخروش سے حضرت علیؓ کی جانب سے لڑ رہے تھے۔ اثناءِ جنگ میں ان کی نظر حضرت عمرو بن العاصؓ پر پڑ گئی جو حضرت امیر معاویہؓ کے بڑے سرگرم علمبردار تھے۔ حضرت عمارؓ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: میں اس

(۱) فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷۸۔ (۲) اسد الغابہ تذکرہ حضرت عمار۔

علمبر دار سے تین دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں لڑ چکا ہوں۔ اب یہ چوتھی مرتبہ ہے بخدا اگر وہ ہم کو شکست دیتے ہوئے مقام ہجر تک بھی پسپا کرتے چلے آئیں میں تب بھی یہی سمجھوں گا کہ ہم لوگ حق پر ہیں اور وہ غلطی پر۔ (۱)

شہادت: اسی جنگ میں ایک دن حضرت عمارؓ نے ایک گھونٹ مانگا، تھوڑا سا دودھ حاضر کیا گیا۔ آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ آخری گھونٹ جو تم پیو گے وہ دودھ کا ہوگا۔ یہ کہہ کر میدان جنگ میں جا گھسے اور اس بے جگری سے لڑے کہ آخر کار قتل کردیئے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۴ سال کی اور بعض کے نزدیک ترانوے برس کی تھی۔

فضائل: حضرت عمارؓ کی کتاب فضائل کا سب سے زیادہ روشن باب یہ ہے کہ وہ حق کی تائید میں کسی شخص کی بھی پروانہیں کرتے تھے۔ جنگ جمل کا معاملہ نہایت سخت تھا۔ ایک طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ تھیں اور دوسری طرف حیدر کرار علی مرتضیٰؓ تھے دونوں نہایت درجہ محترم و مکرم اور خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے والے۔ حضرت عمارؓ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس جنگ میں حضرت علیؓ کی حمایت کرنی چاہئے چنانچہ آپ مردانہ وار مقابلہ کے لئے بڑھے، اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معرکہ آرائی کی۔

اس موقع پر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ایسے بزرگان مرنج و مرنجاں نے لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین کی۔ مگر حضرت عمارؓ نے ایک پر جوش تقریر میں فرمایا: ''لوگو! میں جانتا ہوں عائشہؓ دنیا اور آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ تم سب کا امتحان لے رہا ہے کہ تم اس کی فرمانبرداری کرتے ہو یا حضرت عائشہؓ کی؟ (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی وصف خاص کی بنا پر حضرت عمارؓ سے محبت کرتے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں ''ایک دفعہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت عمارؓ آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مرحبا بالطیب المطیب.''

''خوش آمدید! پاکیزہ و مصفا بزرگ۔''

ایک دفعہ حضرت خالدؓ اور حضرت عمارؓ دونوں میں کسی بات پر نزاع ہوگیا جس میں اول الذکر نے اپنے حریف کی شان میں کوئی نامناسب کلمہ کہہ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو حضرت خالد پر ناراض ہوئے اور فرمایا:

---

(۱) طبقات ابن سعد جز ۳ ص ۱۰۵۔ (۲) الاخبار الطوال دینوری ص ۱۴۷۔

”یا خالد لاتسب عمار افانه من یسب عمار ایسبه الله ومن یبغض عمارا یبغضه الله ومن یسفه عمارا یسفهه الله.“

”اے خالد! عمار کو برا نہ کہو جو اس کو برا کہتا ہے اللہ اس کو سب کرتا ہے۔ جو عمار کو مبغوض رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہوتا ہے اور جو عمار کی تحمیق کرتا ہے اللہ اس کی تحمیق کرتا ہے۔“

حضرت خالدؓ فرماتے ہیں: ”یہ دن میرے لئے بڑا ہی سخت تھا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے استغفار کیجئے۔ اور خود بھی حضرت عمارؓ سے عفو کے طلبگار ہوئے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ”اگر عمار کو دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جائے تو وہ اسی بات کو اختیار کریں گے جو بہتر ہوگی“ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لوگو! میرے بعد ابوبکر وعمر کی اقتداء کرو اور عمار کی روش سیکھو۔ چنانچہ لوگ عام طور پر یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عمارؓ جدھر ہوں گے حق اسی طرف ہوگا۔ خزیمہ بن ثابتؓ جنگ جمل وصفین میں موجود تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی تلوار میان سے نہیں نکالی۔ لوگوں نے پوچھا تو کہا ”میں اپنی تلوار اس وقت تک نہیں کھینچوں گا جب تک کہ میں یہ نہ دیکھ لوں کہ عمار کو کون قتل کرتا ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمارؓ سے فرمایا ”تم کو باغیوں کا گروہ قتل کرے گا“ پھر جب صفین میں عمارؓ قتل کردیئے گئے تو خزیمہؓ نے کہا کہ ”قاتلِ عمار کے لئے گمراہی یقینی ہے“۔

عمرو بن العاصؓ صفین میں حضرت معاویہؓ کی فوج کے علمبردار تھے لیکن وہ بھی حضرت عمارؓ کی جلالتِ شان کے اس درجہ معترف تھے کہ عمارؓ کے شہید ہوجانے کے بعد ان کے دو قاتل لڑتے جھگڑتے حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آئے اور ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ میں نے عمارؓ کو قتل کیا ہے۔ تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا: ”قسم اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں دوزخ کے لئے جھگڑ رہے ہیں۔ قسم اللہ کی میں پسند کرتا ہوں کہ اب سے بیس برس پہلے مرگیا ہوتا۔[2]

مذہبیت: ایک زبردست مجاہد وسرفروش ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمارؓ بے حد نمازی اور اوراد ووظائف کے پابند تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں ”آیت......

”امن هو قانت اناء اليل ساجدا وقائما يحذر الأخرة ويرجوا رحمة ربه.“

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۹۱، ۳۹۲۔ (۲) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۶۔ اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۷۔

''کیا وہ شخص جو رات کو سجدہ کر کر کے اور قیام کر کے عبادت کرتا ہے،
آخرت کے ڈر سے اور اپنے رب کی رحمت کی امید کرتا ہے (گنہگار
بندوں کے برابر نہیں ہوسکتا)۔''

حضرت عمارؓ کی شان میں ہی نازل ہوئی ہے۔ جمعہ کے دن خطبہ سے قبل منبر پر بیٹھ کر عموماً سورۂ یٰس تلاوت فرماتے تھے۔ خطبہ فصیح و بلیغ اور مختصر ہوتا تھا۔ ایک بار کسی نے اس اختصار پر اعتراض کیا تو آپؓ نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''نماز کو طول دینا اور خطبہ مختصر کرنا انسان کے سمجھ کی نشانی ہے۔''

حلیہ:

قد دراز، آنکھیں نرگسی، سینہ چوڑا، رنگ سیاہ، بدن بھرا اور گٹھا ہوا، سر کے بال بہت کم، اکیانوے یا کچھ اس سے زائد برس کی عمر میں شہادت پائی۔ مگر آخر تک جوانوں کی طرح باہمت و باحوصلہ رہے کبھی خضاب استعمال نہیں کیا۔

حضرت سالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

ابو عبداللہ کنیت، سالم نام، والد کا نام بعض کے نزدیک عبید بن ربیعہ اور بعض کے نزدیک معقل ہے۔ ایرانی الاصل ہیں۔ اصطخر ان کا آبائی وطن تھا۔ مولیٰ ابی حذیفہ بن عتبہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ دراصل حضرت ابو حذیفہؓ کی بیوی ثبیہ بنت یعار انصاریہ کے غلام تھے۔ انہوں نے آزاد کر دیا تو حضرت ابو حذیفہؓ نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا[1] اور اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید سے ان کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ لوگ انہیں سالم بن حذیفہ کہنے لگے۔ مگر جب قرآن مجید میں "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآءِ هِمْ" (ان کو ان کے باپ کی نسبت سے بلایا کرو) کا حکم نازل ہوا تو لوگ انہیں سالم مولیٰ ابی حذیفہ کہنے لگے۔[2]

اسلام:

مکہ میں اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو حضرت سالمؓ ابو حذیفہؓ کے ساتھ یہیں مقیم تھے توحید کی دعوت ربانی نے اپنا اثر کیا اور فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبیدۃ بن الجراح سے بھائی چارہ کرا دیا[3] مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ہوا تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے مدینہ پہنچ گئے۔ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر معاذ بن ماعص سے مواخات کرا دی۔[4]

غزوات وشہادت:

حضرت سالم نہایت پرجوش اور بہادر مجاہد تھے، غزوۂ بدر، احد اور تمام معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں مرتدین سے یمامہ میں جنگ کی نوبت آئی، تو حضرت سالمؓ اس میں شریک تھے۔ آپ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا کسی نے کہا "آپ یہ جھنڈا کسی اور کو دے دیجئے، آپ کی جان کو خطرہ ہے" بولے "تو پھر میں برا حاملِ قرآن ہوں گا" نہ مانے اور جھنڈا لے کر میدان جنگ میں درانہ گھسے چلے گئے داہنا ہاتھ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ سے علم تھام لیا، بایاں ہاتھ بھی قلم ہو گیا تو لواء کو گردن میں ڈال لیا کہ وہ خم نہ ہونے پائے۔ آپ جھنڈے کو سینہ سے چمٹائے اور گردن سے لگائے ہوئے تھے اور زبان مبارک پر یہ فقرہ جاری تھا۔

---

(۱) اسد الغابہ جلد۲ ص ۲۴۵۔ (۲) اصابہ ج ۳ ص ۵۶۔ (۳) طبقات ابن سعد جز ۳ ص ۶۱۔ (۴) اسد الغابہ جلد۲ ص ۲۴۶۔

''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ وَكَأَيِن من نبی قتل مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْر ۔''
''محمد صرف ایک رسول ہیں اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والے قتل کئے گئے۔''

اس حالت میں کب تک مقاومت کرتے؟ زخموں سے چور ہو کر گرے تو پوچھا ''ابو حذیفہؓ کا کیا حال ہے؟'' کسی نے کہا ''وہ تو قتل کر دیئے گئے'' پھر کسی شخص کا نام لے کر دریافت کیا اس کا کیا حال ہے؟ ''لوگوں نے کہا ''وہ بھی قتل کر دیئے گئے'' فرمایا ''مجھ کو ان دونوں کے درمیان لٹا دو۔

ابن سعد فرماتے ہیں ''جنگ یمامہ میں مسلمانوں کے پاؤں پیچھے پڑنے لگے۔ تو حضرت سالمؓ نے فرمایا: ''حیف! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو ہمارا حال ایسا نہ تھا'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے لئے ایک گڑھا کھود لیا اور اس میں کھڑے ہو کر علم لئے ہوئے آخر لمحۂ حیات تک لڑتے رہے۔ جنگ کے ختم پر لوگوں نے دیکھا کہ ان کا سر اپنے منہ بولے باپ حضرت ابو حذیفہؓ کے پاؤں پر تھا۔ (۱)

شہید ہونے کے بعد دیکھا گیا تو ان کا ترکہ صرف ایک ہتھیار اور ایک گھوڑا تھا حضرت عمرؓ نے اس کو ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا، اور کہا کہ ''حضرت سالم کو آزاد کرنے والی تو سائبہ ہیں۔ حضرت سائبہؓ کے پاس یہ ترکہ بھیجا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''میں نے سالم کو محض اللہ کے لئے آزاد کیا تھا۔ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں ہے'' حضرت عمرؓ نے اس کے بعد اس تمام ترکہ کو بیت المال میں داخل کر دیا۔ (۲)

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سالم کی شہادت کی خبر پھیلی تو لوگوں نے کہا ''آج ایک ربع قرآن جاتا رہا۔'' (۳)

فضائل: حضرت سالمؓ صحابۂ کرام کے طبقۂ سابقون الاولون میں سے سمجھے جاتے تھے قرأت اور حسن صوت کے امام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے قرأت چار شخصوں سے حاصل کرو عبد اللہ بن مسعودؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ''جب سے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے میں حضرت سالم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں'' (۴) خوش الحانی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لا رہی تھیں راستہ میں رک گئیں۔

---

(۱) طبقات ابن سعد قسم اول جز ۳ ص ۶۱۔ (۲) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲۶۔ (۳) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲۶۔

(۴) بخاری باب مناقب سالم مولی ابو حذیفہ۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ایک شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا میں اس کو سننے لگی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر اتنا اشتیاق ہوا کہ فوراً رداء مبارک سنبھالتے ہوئے باہر تشریف لائے اور جب دیکھا کہ یہ قاری حضرت سالم تھے تو زبان قدس یوں زمزمہ پیرا ہوئی۔

"الحمدللہ الذی جعل فی امتی مثلک." (۱)

"جمیع حمد ثابت ہے اس خدا کے لئے جس نے میری امت میں تمہارے جیسے لوگوں کو پیدا کیا۔"

حضرت سالم کے لئے اس سے بڑھ کر فضیلت و بزرگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود نبوت کی زبان حق ترجمان اس پر فخر و ناز کرے۔

مدینہ میں امامت: اسی خوش الحانی اور فن قرأت میں مہارت و امامت کے باعث آپؓ مسجد قبا میں نماز پڑھاتے تھے۔ اور اجلۂ صحابہ مثلاً حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی اقتداء میں نماز پڑھتے تھے۔ (۲) حضرت سالمؓ کے اس فضل و کمال کی وجہ سے تمام صحابہ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات کے وقت فرمایا: "اگر آج سالم زندہ ہوتے تو میں خلافت کی سفارش ان کے لئے کرتا۔" (۳)

حضرت اسلمؓ فرماتے ہیں "ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا "تم لوگ تمنا کرو" کسی نے کہا "میں اس بات کی تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر سونے سے بھرا ہوتا، اور میں اس سب کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتا، اور صدقہ دے ڈالتا، ایک دوسرے شخص نے کہا "اے کاش یہ گھر پکھراج اور جواہرات سے پر ہوتا اور میں فی سبیل اللہ وہ سب لٹا بیٹھتا" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "اور کوئی تمنا ظاہر کرو" لوگوں نے کہا "ہم نہیں جانتے اے امیر المومنین کیا کہیں۔ پھر آپ نے فرمایا "میں تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن الجراح معاذ بن جبل، سالم مولی ابی حذیفہ، اور حذیفہ بن الیمان ایسے بزرگوں سے بھرا ہوتا۔ (۴)

اخلاق: حضرت سالم اخلاق کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ بزرگ تھے گزشتہ واقعات زندگی سے ان کی استقامت اور استقلال و پامردی کا ثبوت ملتا ہے دنیا و اہل دنیا سے بے تعلق رہتے تھے۔ جو کچھ کماتے تھے مختلف اسلامی ضرورتوں اور غلاموں کی ضرورتوں پر صرف کر دیتے تھے۔ وفات کے وقت صرف ایک ہتھیار اور ایک گھوڑا چھوڑا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

---

(۱) اسد الغابہ تذکرۂ سالم۔ (۲) بخاری کتاب الصلوۃ باب امامۃ العبد۔ (۳) اسد الغابہ جلد ۲ ص ۲۴۶ و ۲۴۷۔

(۴) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲۷۔

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

والد کا نام جحدر یا بجد دتھا، کنیت ابو عبداللہ اور نام ثوبان، یمن کے باشندے تھے، پہلے غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزاد کر دیا، اور فرمایا ''اگر تم اپنے خاندان میں جانا چاہتے ہو تو وہاں چلے جاؤ اور اگر یہاں قیام کرنا پسند کرو تو تم میرے اہل بیت میں سے ہو'' انہوں نے بارگاہِ نبوی میں رہنا ہی اختیار فرمایا اور سفر وحضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ (۱)

ایک مرتبہ آپ نے اہل بیت کے لئے دعا کی، حضرت ثوبان بولے ''انا من اہل البیت'' (میں بھی اہل بیت میں سے ہوں) حضرت نے فرمایا ''ہاں! جب تک تم کسی دروازہ کی چوکھٹ پر نہ کھڑے ہو یا کسی امیر کے پاس سوال کرنے نہ جاؤ۔ (۲)

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے، حضرت ثوبانؓ جلوت و خلوت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، وفات کے بعد کچھ دنوں تک مدینہ میں ہی قیام رہا، پھر رملہ (شام) میں اقامت اختیار کر لی اور وہیں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

حضرت ثوبانؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شرف غلامی حاصل تھا وہ اس کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حمص میں بیمار ہو گئے اور وہاں کا گورنر آپ کی عیادت کے لئے نہ آیا تو آپ نے اس کو لکھا ''اگر موسیٰ اور عیسیٰؑ کا غلام تمہارے یہاں ہوتا تو کیا تم اس کی عیادت کے لئے نہ آتے؟ گورنر حضرت ثوبانؓ کے ان الفاظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکلا اور آپ کے گھر آ کر دیر تک مزاج پرسی کرتا رہا۔ (۳)

حضرت ثوبانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ اس لئے آپ کو احادیث کثرت سے یاد تھیں۔ اور پھر حفظ حدیث کے ساتھ وہ اس کی اشاعت و تبلیغ کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ اس فضل و کمال کی وجہ سے لوگ آپ سے احادیث سننے کے مشتاق رہتے تھے ایک بار لوگوں نے اس کی خواہش ظاہر کی تو آپؓ نے فرمایا: ''جو مسلمان خدا کے لئے ایک سجدہ کرتا ہے خدا اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور اس کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے۔'' (۴)

بڑے بڑے علماء ان سے اپنی مسموعہ احادیث کی تصدیق کراتے تھے۔ معدان بن طلحہ جلیل القدر محدث تھے۔ انہوں نے حضرت ابو درداءؓ سے ایک حدیث سنی تو اس کی تصدیق حضرت ثوبانؓ سے کی۔ (۵)

معدان کے علاوہ ابو ادریس الخولانی، ابو عامر الالہانی، عبدالرحمٰن بن غنم، جبیر بن نفیر اور دوسرے ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔ (۶)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱۔ (۲) اصابہ جلد اص ۲۱۲۔ (۳) مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۸۰۔
(۴) مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۷۶۔ (۵) ابوداؤد ج اص ۲۳۷۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱۔

حضرت ابُو فکُیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

یسار نام، ابوفکیہ کنیت، قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے، صفوان بن امیہ کے غلام تھے [۱] دعوتِ اسلام کی صدائے کفرشکن مکہ میں نئی نئی بلند ہوئی تھی کہ آپؓ مسلمان ہو گئے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ کی طرح ان پر بھی شدید مظالم کئے جاتے تھے۔ آتش خیز دوپہر میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر منہ کے بل لٹا کر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جاتا تھا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابوفکیہ اس ظلم کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ایک بار امیہ نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو جلتی ہوئی ریت پر ڈال دیا اور گلا گھونٹنے لگا۔ اتنے میں اس کا بھائی ابی بن خلف ادھر سے گزرا اور کہنے لگا ''اور مارو'' چنانچہ امیہ برابر مارتا رہا یہاں تک کہ ان کو بے جان سمجھ کر چھوڑ دیا حضرت ابوبکرؓ ادھر سے گزرے، ابوفکیہ کو اس حال میں دیکھ کر جی بھر آیا فوراً ان کو خرید ا اور فی سبیل اللہ آزاد کر دیا۔ [۱]

ہجرت ووفات:

آزادی کے بعد ہجرت ثانیہ کے موقع پر حبشہ چلے گئے۔ سخت ترین مصائب وآلام برداشت کرنے کی وجہ سے اعضاء میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے اور غزوۂ بدر سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ [۲]

---

(۱) اصابہ ج ۷ ص ۱۵۲۔ (۲) طبقات ابن سعد ج ۴ ق اول ص ۹۱۔

حضرت عامر بن فُہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

عامر نام، ابوعمرو کنیت، والد کا نام فہیرہ تھا، طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے جو حضرت عائشہؓ کے اَخیافی بھائی تھے اور قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام:

مکہ مکرمہ میں اسلام کا غلغلہ اول اول بلند ہوا تو اس کی صدائے پرتاثیر نے جن حق آگاہ دلوں کو متاثر کیا ان میں ایک حضرت عامرؓ بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دارِارقم میں تشریف فرما نہیں ہوئے تھے کہ حضرت عامر بحالتِ غلامی ہی اسلام لے آئے۔ حضرت بلال، مصعب بن عمیرؓ اور حضرت عمارؓ کی طرح ان پر بھی سخت سے سخت مصیبتوں کی انتہا کر دی گئی، مگر انہوں نے بڑی پامردی اور استقلال وثابت قدمی کے ساتھ ان سب کا مقابلہ کیا، اور اسلام کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ حضرت ابوبکرؓ جو غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرنے میں مشہور تھے انہوں نے حضرت عامرؓ کی یہ حالت دیکھی تو خرید کر آزاد کر دیا۔ (۱)

ہجرت:

پھر جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ کی ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور غارِ ثور میں قیام کیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عامرؓ کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ دن بھر ان کی بکریاں چراتے تھے اور شام کو غار کے پاس لے آتے یہاں دوہ کر ان کا دودھ نکالا جاتا اور کام میں لایا جاتا۔ صبح کے وقت حضرت عبداللہ بن ابی بکر واپس جاتے تو بکریوں کو ان کے نشانِ قدم پر لے چلتے کہ مشرکین کو کچھ شبہ نہ ہو۔ پھر جب یہ قافلہ غارِ ثور سے روانہ ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت سعد بن خثیمہؓ کے مہمان ہوئے اور حضرت حارث بن اوسؓ کے ساتھ مواخات کرادی گئی۔ (۲)

مدینہ کی آب وہوا شروع میں جن حضرات کو موافق نہیں آئی ان میں ایک حضرت عامر بھی تھے۔ مرض کا اس قدر غلبہ ہوا کہ زندگی سے مایوس ہو گئے، بحران کی شدت کے وقت یہ اشعار پڑھتے تھے:

---

(۱) اسد الغابہ جلد ۳ ص ۹۰۔ (۲) اسد الغابہ جلد ۳ ص ۹۰۔

۱۔انی وجدت الموت قبل ذوقه ان الجبان حتفه من فوقه
۲۔کل امرء مجاهد بطوقه کالثور یحمی انفه بروقه

ترجمہ:

۱۔ میں نے موت سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھ لیا۔ بے شبہ بزدل کی موت اس کے اوپر سے ہے۔

۲۔ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ بیل کی طرح جو اپنے سینگ سے اپنی ناک کی حفاظت کرتا ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین کرامؓ کی اس ناسازئ طبائع کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعاء کی "اے اللہ! تو مکہ کی طرح مدینہ کو بھی ہمارے لئے خوشگوار بنا دے۔ اور ان کو بیماریوں سے پاک وصاف کر دے" دعا قبول ہوئی اور حضرت عامر بن فہیرہؓ تندرست ہو گئے۔

غزوات:

غزوۂ بدر واحد میں شریک تھے۔ صفر ۴ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو براء کلابی جو قبیلۂ کلاب کا سردار تھا، اس کی درخواست پر ستر قاریوں کی ایک جماعت جن میں سے اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے تبلیغ وارشاد کے لئے اس قبیلہ کی طرف روانہ کیا۔[2]

ان میں حضرت عامر فہیرہؓ بھی تھے اس جماعت مبلغین نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا عامر بن طفیل نے رعل وذکوان قبائل کے پاس آدمی دوڑا دیئے۔ ان لوگوں نے غداری کی ان تمام اصحاب کو مع حضرت عامر بن فہیرہؓ کے شہید کر دیا۔ صرف حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری زندہ گرفتار ہوئے۔ حضرت عامرؓ کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی۔ اس کے بعد عامر بن طفیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو کہا کہ میں نے عامر بن فہیرہ کی لاش کو قتل ہونے کے بعد دیکھا کہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے یہاں تک کہ آسمان وزمین کے درمیان بالکل معلق نظر آئے پھر زمین پر رکھ دیئے گئے۔[3]

---

(۱) اصابہ تذکرہ حضرت عامر۔

(۲) عربی کا مشہور شاعر ہے۔ اس کا دیوان عبید بن الرص کے دیوان کے ساتھ یورپ سے شائع ہو چکا ہے۔

(۳) بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الرجیع۔

حضرت عروہؓ سے مروی ہے کہ ان شہداء کرام میں حضرت عامرؓ کی نعش تلاش کی تو نہیں ملی۔اس پر لوگوں کو خیال ہوا کہ فرشتے اس کو اٹھا کر لے گئے یا انہوں نے تدفین کی، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ معونہ کا بڑا صدمہ ہوا۔اور آپ چالیس روز تک صبح کی نماز کے بعد ان غداروں کے حق میں بددعا فرماتے رہے، یہاں تک کہ آیت: **لیس لک من الامر شیء** (آپ کو اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے) نازل ہوئی۔[1]

اخلاق وشمائل:

حضرت عامرؓ صورت ظاہری کے لحاظ سے سیاہ فام حبشی تھے مگر ان کا دل اور سینہ نبوت کے عکس ریزیوں سے شمع جہاں فروز کی مانند روشن تھے حضرت عامرؓ کی فضیلت اور بزرگی کے لئے یہ شرف ہی کیا کم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غار ثور ایسے ایک موقع پر اپنا معتمد بنایا۔استقلال وپامردی کا عالم یہ تھا کہ غزوۂ بیر معونہ میں ان کے قاتل جبار بن سلمی کا نیزہ ان کے سینہ سے پار ہوا تو اضطراب وتشویش کی بجائے بے ساختہ زبان مبارک سے نکلا "فزت واللہ" میں اللہ کی قسم کامیاب ہو گیا۔[2]

---

(۱) اسد الغابہ جلد ۳ ص ۹۱۔ (۲) طبقات ابن سعد ص ۳۴۷۔

حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب: نام میں بہت اختلاف ہے زیادہ مشہور اسلم ہے، امام بخاری نے بھی اس کو ہی جزم کیا ہے۔کنیت ابورافع تھی۔

غلامی: ابتداء میں حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور ہبہ دے دیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کے اسلام قبول کرنے کی خوشی میں آزاد کردیا۔

اسلام: اپنے اسلام کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش نے مجھ کو کسی کام کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی میرا دل اسلام کی طرف مائل ہو گیا اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب میں قریش کے پاس واپس نہ جاؤں گا۔ سرکار کونینؐ نے فرمایا ''میں عہد شکنی نہیں کرتا اور قاصد کو نہیں روکتا۔اب تو تم واپس چلے جاؤ۔اگر پھر بھی تم اسلام کی طرف میلان کا جذبہ اپنے اندر پاؤ تو واپس آ جانا'' چنانچہ ارشاد نبویؐ کے مطابق یہ واپس چلے گئے اور پھر بارگاہِ نبوت پناہ میں حاضر ہو کر دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔(۲)

اخفاء اسلام: بدر تک قریش کے خوف سے اسلام کا اعلان نہیں کیا، ایک دن چھت پر بیٹھے تیر درست کر رہے تھے حضرت عباس کی بیوی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔اتنے میں ابولہب آیا، اور حجرہ کی طناب کے پاس بیٹھ گیا۔پھر ابوسفیان آئے۔انہوں نے ابولہب سے بدر کے حالات پوچھنے شروع کئے۔بولا ''کیا بتاؤں؟ مسلمانوں نے ہماری تمام قوت تباہ کر کے رکھ دی کتنے ہی ہیں جن کو تہِ تیغ کیا، کچھ گرفتار ہوئے ہیں۔اسی سلسلے میں ایک یہ عجیب وغریب واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ میدان جنگ میں زمین سے آسمان تک سفید پوش سوار بھرے پڑے تھے۔ابورافعؓ بولے ''وہ فرشتے تھے'' یہ سن کر ابولہب نے ان کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔یہ سنبھل کر گتھم گتھا ہو گئے۔مگر کمزور تھے غالب نہ آ سکے۔ابولہب نے زمین پر پٹک دیا اور جتنا مار سکتا تھا مارا۔حضرت عباسؓ کی بیوی جو پاس ہی موجود تھیں، اس ظلم کو برداشت نہ کر سکیں۔ایک ستون اٹھا کر اس زور سے رسید کیا کہ ابولہب کا سر کھل گیا۔اور بولیں اس کا آقا موجود نہیں ہے کمزور سمجھ کر مارتا ہے۔''(۳)

---

(۱) ابن سعد قسم اول جز ۴ص ۵۱۔ (۲) مستدرک حاکم ج ۳ص ۵۹۸۔ (۳) ابن سعد قسم اول جز ۴ص ۵۱۔

ہجرت: بدر کے بعد ہجرت کرکے مدینہ گئے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام پذیر ہوگئے۔

غزوات: اُحد اور خندق وغیرہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ حضرت علیؓ کی زیر سرکردگی جو یمن کی طرف بھیجا تھا اس میں حضرت رافعؓ بھی تھے وہ خود فرماتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا ''اے ابو رافع! تم علی سے جا کر مل جاؤ، اور ان کو پیچھے سے آواز نہ دینا۔ ان کو چاہئے کہ کھڑے ہو جائیں اور ادھر ادھر نہ دیکھیں یہاں تک کہ میں آ جاؤں'' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور حضرت علیؓ کو چند باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا ''اے علی تمہارے ذریعہ اللہ کسی ایک شخص کو ہدایت دے۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن پر آفتاب طلوع کرتا ہے۔''(۱)

فضل وکمال:

حضرت ابو رافعؓ فضل وکمال میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ان سے اڑسٹھ ۶۸ روایتیں مروی ہیں۔ جن میں سے ایک میں بخاری اور تین میں امام مسلم منفرد ہیں۔ جن حضرات نے ان سے روایتیں نقل کیں اور علمی استفادہ کیا ان کے نام یہ ہیں: صاحبزادوں میں حسن، رافع، عبید اللہ، معتمر، پوتوں میں حسن، صالح۔ عام اصحاب میں عطار بن یسار ابو غطفان بن طریف۔ ابو سعید مقبری۔ اور سلیمان بن یسار۔

حضرت ابو رافع ایک خادم کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر وحضر میں رہتے تھے۔ اس لئے سرور کائنات کی زندگی کی معمولی معمولی جزئیات سے متعلق ان کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ واقفیت تھی، اسی بنا پر اجلۂ صحابہ ان سے استفادہ کرتے تھے حضرت ابو رافع کے پوتے عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ میرے دادا کے پاس ایک کاتب کو لے کر آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں دن کیا کیا کام کئے تھے۔ وہ بتاتے جاتے اور کاتب تحریر کرتا جاتا تھا۔(۲)

حضرت ابو رافع کے شرف ومجد کے لئے یہی کیا کم ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کرکے ان کو اپنے خاندان میں شامل کر لیا تو فرمایا **مولی القوم من انفسهم** اس کے بعد شرافت ونجابت اور فضیلت وبزرگی کا کونسا مرتبہ باقی رہتا ہے۔(۳)

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹۸۔ (۲) اصابہ ج ۴ تذکرہ حضرت ابن عباس۔ (۳) سنن ابوداؤد۔

حضرت ابو رافعؓ کو اس نسبت پر بڑا فخر و ناز تھا اور وہ اس کو کسی قیمت پر بھی دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے متعلق صاحب تہذیب التہذیب نے ایک روایت لکھی ہے کہ عمرو بن سعید بن عاص نے، مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں ان سے پوچھا "تم کس کے مولی ہو؟" انہوں نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا" عمرو بن سعید نے کہا "نہیں! تم ہمارے غلام ہو" انہوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ عمرو نے ان کے پانسو درے لگائے اور بالآخر انہوں نے اقرار کرلیا "ہمارے خیال میں اول تو یہ روایت درست ہی نہیں۔ جیسا کہ خود صاحب تہذیب التہذیب نے اس کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ولا تبين لی ذٰلک بل عندی انه غيرهٗ."(1)

"میرے نزدیک یہ درست نہیں ہے بلکہ یہ کوئی اور ابو رافع ہیں۔"

اور اگر ان سے ہی متعلق ہو، تو صحیح یہ ہے کہ آخر دم تک یا اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام کہتے رہے اور عمرو کی غلامی کو تسلیم نہیں کیا، جیسا کہ بعض اور روایتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

شادی اور اولاد:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی آزاد کردہ جاریہ سلمٰی سے کر دیا تھا جو صاحبزادۂ ابراہیم کی آیا تھیں۔ ان سے عبداللہ تولد ہوئے (2) ان کے علاوہ حضرت ابو رافع کی اولاد کے نام حسب ذیل ہیں:

حسن، رافع، معتمر، مغیرہ، سلمٰی۔ (3)

وفات:

وفات کے متعلق اختلاف ہے، کوئی حضرت عثمانؓ کے آخر عہد خلافت میں بتاتا ہے۔ مگر غالباً صحیح یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے ابتدائی عہدِ خلافت میں انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔ اصل یہ ہے کہ ابو رافع نام کا ایک شخص ابواحیحہ سعید بن العاص کا غلام تھا ان دونوں کے واقعات ایک دوسرے سے ملتبس ہوگئے ہیں۔ (4)

---

(1) تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۹۳۔ (2) اسد الغابہ ج ۳ ص ۷۷۔ (3) تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۹۲۔

(4) ایضاً ص ۹۳۔

حضرت شقران صالح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب: صالح نام، شقران لقب، اور والد کا نام عدی تھا۔ حبشی نژاد تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے غلام تھے، بعد میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہ طور ہدیہ پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خلعت آزادی سے مشرف فرمایا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمتاً خریدا تھا۔ لیکن یہ قول بہت ضعیف ہے، خود ارباب سیر نے ''قیل'' کے ساتھ لکھا ہے [(۱)]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں ہے۔ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی غلام کو قیمت کے بدلہ میں خریدنا ثابت ہو۔

خدمات: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غزوۂ مریسیع میں اموالِ غنیمت کے جمع کرنے اور بدر میں قیدیوں کی دیکھ بھال پر متعین کیا تھا [(۲)]۔ انہوں نے قیدیوں کی نگرانی اس نرمی اور ملاطفت سے کی کہ ان سب نے ان کو اس قدر معاوضہ دیا کہ مالِ غنیمت میں سے جن کو حصہ ملا تھا حضرت شقرانؓ ان سب سے اچھے رہے۔ [(۳)]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شقرانؓ کی حسنِ خدمات سے بہت خوش تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت خاص طور سے ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی وصیت فرمائی۔ حضرت شقرانؓ بھی اپنے آقا کے ایسے جاں نثار غلام ثابت ہوئے کہ جس دامنِ کرم سے ایک مرتبہ وابستہ ہو گئے تھے آخر تک اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی وفاکوشی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سید کونینؐ کے جسم مطہر کی امانت زمین کے سپرد کی گئی تو اس موقع پر حضرت شقرانؓ بھی آلِ بیت اطہار کے ساتھ موجود تھے۔ جو چادر اس وقت رحمۃ للعالمین کے زیب بدن تھی حضرت شقرانؓ اس کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ملأ قدس کی یہ امانت باعظمت سپرد زمین ہو کر چشم ظاہر سے قیامت تک کے لئے مستور ہو گئی [(۴)] صلی اللہ علیہ وعلی الہ وصحبہ وسلم۔

حضرت شقرانؓ سے بعض احادیث بھی مروی ہیں۔ عبیداللہ بن ابی رافع نے ان سے روایت کی ہے۔ [(۵)]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت شقرانؓ کہاں رہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بغوی فرماتے ہیں کہ مدینہ میں قیام رہا، اور بعضوں کا خیال ہے کہ بصرہ چلے گئے۔ ٹھیک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جائے وفات اور وقت وفات بھی معلوم نہیں ہے۔

---

(۱) اسد الغابہ ج ۳ ص ۹۔ (۲) اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹۔ (۳) طبقات ابن سعد قسم اول جز ۳ ص ۳۴۔

(۴) اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹۔ (۵) اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹۔

حضرت خبّاب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

خباب نام، ابوعبداللہ کنیت، والد کا نام ارت تھا، ان کے نسب میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں خزاعی تھے۔ مگر صحیح یہ ہے بنوتمیم سے تعلق رکھتے تھے عہد جاہلیت میں غلام بنا کر مکہ میں فروخت کیے گئے۔ ان کے آقا کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان کے آقا عتبہ بن غزوان تھے اور کسی نے ان کو ام انمار بنت سباع الخزاعیہ کا غلام کہا ہے۔ (۱)

اسلام:

حضرت خباب ان سعادت مند بزرگوں میں سے ہیں جن کی کلاہِ فخر کا طرۂ امتیاز السابقون الاولون ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی حضرت ارقمؓ کے گھر میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے کہ حضرت خبابؓ اسلام کی نعمت بے زوال سے مشرف ہوگئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپؓ کا نمبر چھٹا تھا۔ اسی بنا پر آپ کو ''سادس الاسلام'' کہتے تھے۔ (۲)

یہ وقت ان چند مسلمانوں کے لئے انتہائی سخت اور صبر آزما تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابوطالب کی وجہ سے محفوظ تھے، اور حضرت ابوبکرؓ اپنی قوم میں ممتاز تھے۔ اس لئے وہ بھی کفار مکہ کے شر سے امن میں تھے۔ حضرت خبابؓ غلام تھے کوئی ان کا یار و مددگار نہیں تھا۔ انہوں نے اسلام کا اعلان کیا تو کافروں کا غیظ و غضب ان کے خلاف ابل پڑا۔ یہ ان مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھے جن کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں لٹا دیتے تاکہ لوہے کی گرمی سے ان کا جسم تپنے لگے، کبھی ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیئے جاتے، اور سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ کر ایک آدمی مسلتا۔ حضرت خبابؓ یہ انسانیت سوز مظالم برداشت کرتے، انگاروں پر لوٹتے لوٹتے گوشت کباب کی طرح بھننے لگتا۔ لیکن ان تمام سختیوں کے باوجود جو زبان بادۂ توحید کے ذائقہ کام ونواز سے ایک مرتبہ آشنا ہو چکی تھی وہ کس طرح اس ظلم و جبر سے مرعوب ہو کر کلمۂ حق سے انحراف کر سکتی تھی۔ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خبابؓ کی ان مصیبتوں کا حال سن کر انتہا درجہ ملول ہوتے اور تالیف قلب فرماتے تھے۔ ام انمار کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دلجوئیوں کا علم

---

(۱) اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۲۔ (۲) اصابہ ج ۲ ص ۱۰۱۔

ہوتا تو اپنے ظلم میں اور شدت پیدا کر دیتی، اور لوہا آگ میں تپا کر ان کا سر داغتی تھی[1] ایک مرتبہ ظلم وستم کی انتہا ہوگئی تو حضرت خبابؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی ''میرے لئے بارگاہِ خداوندی میں دُعاء فرمائیے کہ وہ مجھ کو اس عذاب سے نجات عطا فرمائے؛'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعاء فرمائی ''خدایا خباب کی مدد کر۔''[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ ام انمار کے سر میں ایسی تکلیف شروع ہوئی کہ وہ کتوں کی طرح بھونکتی تھی۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ سر کو داغ لگوانا چاہئے چنانچہ حضرت خبابؓ گرم کیا ہوا لوہا ام انمار کے سر پر رکھ کر داغ دیتے تھے۔[3]

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمائش کی کہ تم نے مکہ میں جو مصیبتیں برداشت کی ہیں انہیں بیان کرو۔ حضرت خبابؓ نے اپنی پشت دکھائی تو حضرت عمرؓ بولے ''آج تک میں نے کسی کی پشت ایسی نہیں دیکھی ہے۔ حضرت خبابؓ نے فرمایا ''آگ جلائی جاتی تھی اور اس پر میرے جسم کو تپایا جاتا تھا یہاں تک کہ میری پشت کی چربی اس کو بجھا دیتی تھی۔ (اسد الغابہ)

جسمانی سزا کے علاوہ ان لوگوں نے مالی نقصان پہنچانے میں بھی کمی نہیں کی۔ حضرت خبابؓ لوہار کا کام کرتے تھے اس سلسلہ میں ان کا عاص بن وائل پر کچھ قرضہ تھا۔ یہ جب کبھی تقاضہ کرنے جاتے، وہ کہتا کہ میں اس وقت تک ادا نہیں کروں گا جب تک کہ تم محمد کا دامن نہیں چھوڑو گے۔ حضرت خبابؓ فرماتے ''جب تک تو دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آئے گا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔'' اس پر وہ بولتا ''اچھا میں مر کر دوبارہ زندہ ہوں گا۔ اور اپنے مال واولاد کی طرف لوٹ کر آؤں گا، تب تمہارا قرضہ ادا کر دوں گا۔'' (عاص بن وائل کا یہ کہنا عقیدۂ قیامت پر ایک طرح کی تعریض تھی) اس واقعہ پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔[4]

''افرأیت الذی کفر بایاتنا وقال لاوتین مالا وولدا اطلع الغیب ام اتخذ عند الرحمن عهدا کلاسنکتب مایقول ونمدله من العذاب مدا ونرثه مایقول ویاتینا فردا.''

''اے محمدؐ! کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا ہے اور اس نے کہا کہ مجھ کو مال اور اولاد دی جائے گی یہ شخص کیا غیب

(۱) ابن سعد ج ۳ تذکرہ حضرت خباب۔ (۲) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔ (۳) اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۶

(۴) بخاری کتاب التفسیر باب قوله ونرثه مایقول۔

سے باخبر ہو گیا ہے یا اس نے خدا سے عہد لے لیا ہے ہر گز نہیں یہ جو کچھ کہتا ہے ہم اس کے وارث ہوں گے اور یہ تنہا ہمارے سامنے لایا جائے گا۔''

ہجرت:

ایک عرصہ تک مصائب وآلام کا مقابلہ کرنے کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم ہوا، تو ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اور فراش بن صمہ کے غلام تمیمؓ میں اور بعض کے نزدیک جبیرؓ بن عتیک میں مواخات کرادی تھی۔ (۱)

غزوات:

حضرت خبابؓ بدر، اُحد، خندق اور تمام غزوات میں شریک رہے۔

فضائل: حضرت خبابؓ ایمان وعمل کے اعتبار سے نہایت پختہ اور مضبوط تھے۔ اس بناء پر تمام صحابہ میں آپ کو ہر دلعزیزی حاصل تھی، حضرت عمرؓ بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خبابؓ حضرت عمرؓ سے ملنے آئے تو آپ نے ان کو اپنے گدے پر بٹھایا، اور لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا ''ان کے علاوہ صرف ایک شخص اور ہے جو اس گدے پر بیٹھنے کا مستحق ہے'' حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا۔ ''امیر المومنین! وہ کون ہے؟'' فرمایا ''بلال!'' بولے ''وہ میرے برابر کس طرح مستحق ہو سکتے ہیں۔ مشرکین میں ان کے بہت سے مددگار تھے، مگر میرا پوچھنے والا سوائے خدا کے اور کون تھا؟'' پھر اپنا استحقاق بتاتے ہوئے اپنے مصائب کی داستان سنائی۔

حضرت خبابؓ علم کی بڑی جستجو رکھتے تھے، کبھی کبھی رات رات بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ عبادت کو دیکھتے رہتے اور صبح کو اس کے متعلق استفسار کرتے ایک مرتبہ انہوں نے پوچھا ''یا رسول اللہ! آپ نے رات جیسی نماز پڑھی ایسی کبھی نہیں پڑھی۔ فرمایا رات کو نماز خوف ورجا کی نماز تھی۔ میں نے خدا سے اپنی امت کے لئے تین چیزوں کی دعا مانگی تھی جن میں سے دو چیزیں منظور کر لی گئی ہیں، تیسری منظور نہیں ہوئی۔ (۲)

---

(۱) اسد الغابہ، مستدرک ج ۳ ص ۳۸۲۔ (۲) اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۷۔

حضرت خبابؓ کی مرویات کی تعداد تینتیس ہے، ان میں سے دو متفق علیہ ہیں اور دو میں امام بخاری اور ایک میں امام مسلم منفرد ہیں۔ جن بزرگوں نے ان سے روایت کی ہے ان کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں:

آپ کے صاحبزادے عبداللہ اور ابو امامۃ باہلی۔ ابو معمر۔ عبداللہ بن سخبرہ، قیس بن ابی حازم، مسروق بن اجدع، علقمہ بن قیس، عمرو بن شرحبیل، شعبی، حارثہ بن مضرب۔ (۱)

روایت میں احتیاط:

احتیاط و انکسار نفس کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ مسجد میں چند اصحاب بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں حضرت خبابؓ تشریف لے آئے، اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم سب اس وقت آپ کے پاس اس لئے جمع ہیں کہ آپ ہم سے کوئی بات کہیں یا کسی چیز کا حکم کریں۔ آپ نے فرمایا ''میں کس بات کا حکم کروں، ممکن ہے میں آپ لوگوں کو کسی امر کا حکم کروں اور خود اسے نہ کرتا ہوں۔ (۲)

ذریعہ معاش:

زمانۂ جاہلیت میں اور اس کے بعد بھی عرصہ تک آہنگری کا پیشہ کرتے رہے اسلام کا ابتدائی زمانہ بڑی تنگی میں بسر ہوا۔ مگر کچھ دنوں بعد خدا نے مرفہ الحالی دی اور اتنی دولت ملی کہ پھر کسی پیشہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہی۔ وفات کے وقت چالیس ہزار درہم چھوڑے۔ (۳)

علالت و وفات:

۳۷ھ میں کوفہ میں بیمار ہوئے اور چند روز کے بعد وہیں وفات ہوگئی۔ وفات سے کچھ دیر قبل اپنے صاحبزادے عبداللہ کو وصیت کی کہ مجھ کو کوفہ کے باہر میدان میں دفن کرنا۔ اس سے قبل کوفہ کے لوگ اپنے مردوں کو گھروں کے سامنے یا شہر کے اندر ہی دفن کرتے تھے۔ حضرت خبابؓ اپنی وصیت کے مطابق شہر کے باہر میدان میں دفن کئے گئے تو ایک جلیل القدر صحابی کے قرب سے شرف اندوز ہونے کے لئے اہل کوفہ نے بھی اپنے مردے وہیں دفن کرنے شروع کر دیئے۔ (۴)

---

(۱) ایضاً۔ (۲) اسد الغابہ۔ (۳) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔ (۴) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔

مرض الموت میں کچھ لوگ عیادت کرنے آئے، اور کہنے لگے ''ابوعبداللہ آپ خوش ہوجائیے کہ کل آپ حوض کوثر پر اپنے بھائیوں سے ملاقات کریں گے، یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ پر رقت طاری ہوگئی اور فرمایا ''تم نے ایسے بھائیوں کا ذکر کیا ہے جو گزر گئے اور انہوں نے اپنا کوئی اجر دنیا میں نہیں پایا ہم ان کے بعد رہے اور دنیا سے اس قدر حصہ پایا کہ ڈر ہے کہیں وہ ہی ہمارے ان اعمال کا ثواب نہ ہو۔''

حضرت خبابؓ نے مرض الموت میں اس قدر تکلیف اٹھائی کہ وہ خود فرماتے ہیں ''اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی دعاء سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنے لئے موت کی دعا مانگتا آخرامر اسی حالت میں تہتر برس کی عمر میں جان جاں آفریں کے سپرد کردی اور اپنے پیشرو احباب ورفقاء سے جا ملے۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت علیؓ صفین کی جنگ سے واپس آرہے تھے کہ کوفہ کے باہر میدان میں انہیں سات قبریں نظر آئیں۔ لوگوں سے پوچھا ''کس کی ہیں؟ جواب ملا'' سب سے پہلے حضرت خبابؓ اپنی وصیت کے مطابق یہاں دفن کئے گئے تھے پھر ان کے اتباع میں لوگوں نے اپنے مردے بھی یہاں دفن کرنے شروع کردیئے ہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ''اللہ خباب پر رحم کرے وہ اپنی رغبت سے مسلمان ہوئے۔ اپنی خوشی سے ہجرت کی مجاہدانہ زندگی بسر کی ان کے جسم کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اللہ تعالیٰ نیک عمل لوگوں کے اعمال ضائع نہیں کرتا'' اس کے بعد آپ نے اور قریب ہوکر تمام اہل قبور کے لئے دعا پڑھی۔ (۱)

حضرت خباب مولائے عتبہ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عتبہ بن غزوانؓ کے غلام تھے۔ غزوۂ بدر اور دیگر تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ مدینہ میں ۱۷ھ میں پچاس سال کی عمر میں وفات پائی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اس وقت سریر آرائے خلافت تھے نماز جنازہ پڑھائی بعض لوگوں کو ان میں اور حضرت خباب بن ارتؓ میں اشتباہ ہوگیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں بالکل الگ الگ ہیں، عتبہ بن نوفل بن عبد مناف کے حلیف تھے خبابؓ کی کنیت ابو یحییٰ تھی اور ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ (۲)

---

(۱) اسد الغابہ جلد ۲ ص ۱۰۹۔ (۲) اسد الغابہ تذکرہ حضرت خباب۔

حضرت خباب مولائے فاطمہ بنت عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی فاطمہ کے غلام تھے ان کے صحابی ہونے میں اگر چہ کلام کیا گیا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا ابو السائب اور ابو سلمہ کنیت تھی ان کے بیٹے سائبؒ کا شمار حجاز کے بڑے عالموں اور حدیث کے راویوں میں ہے۔ (۱)

اسد الغابہ اور اصابہ میں ان سے دو روایتیں منقول ہیں۔ (۲)

بعض لوگوں کو یہ اشتباہ ہو گیا ہے کہ سائب کے والد خباب اور فاطمہ کے غلام خباب دو جدا جدا شخصیتوں کے نام ہیں مگر یہ درست نہیں۔ امام بخاریؒ کا فیصلہ اس کے خلاف ہے وہ دونوں کو ایک مانتے ہیں دیکھو اصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ ص ۱۰۲۔

حضرت ابو کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سلیم نام، ابو کبشہ کنیت، وطن ونسب کے اعتبار سے کوئی ان کو فارسی۔ بعض دوسی اور بعض مکی بتاتے ہیں۔ غلام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔

اسلام:

اسلام کا زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ غلامی سے قیاس ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام کے شروع زمانہ میں ہی اسلام قبول کر لیا ہو گا ہجرت کی اجازت ہوئی تو مدینہ پہنچے اور کلثوم بن ہدم کے یہاں مقیم ہوئے۔

غزوات:

بدر کے معرکہ میں شریک تھے۔ اس کے بعد اُحد اور دوسرے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔

وفات: ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ یوم سہ شنبہ جس دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے وفات پائی۔ (۳)

---

(۱) اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۸، ۱۰۹۔ (۲) اصابہ ج ۲ ص ۱۰۲۔ (۳) ابن سعد ج ۳ قسم اول ص ۳۳۔

حضرت زید بن بولیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابو یسار کنیت تھی۔ ابن شاہین کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غزوۂ بنی ثعلبہ میں پایا تھا اور آزاد کر دیا تھا۔ ان کے پوتے بلال بن یسار کی وساطت سے امام ابوداؤد و ترمذیؒ نے ان سے روایت کی ہے۔ روایت یہ ہے، زیدؓ کہتے ہیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس نے (دل کی پاکی اور ارادے کی سچائی کے ساتھ) **استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ** یہ دعا پڑھ لی اس کی بخشش ہوگئی اگرچہ وہ جہاد (جیسے عظیم الشان عمل) سے بھاگنے اور اس میں پیٹھ دکھانے کا مجرم ہی کیوں نہ ہو[۱] یہ حبشی تھے۔[۲]

حضرت زید الدیلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سلیم بن مازن کے غلام تھے، ان کے بیٹے سنان کہتے ہیں کہ میرے والد اپنے آقا سلیم بن مازن کے ہمراہ حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آقا اور غلام دونوں بیک وقت اسلام سے مشرف ہوئے اور دونوں نے سرکار ابد قرار کی غلامی کا حلقہ اپنے کانوں میں ڈالا۔[۳]

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام و نسب:

عکرمہ نام، ابو عبداللہ کنیت اہل مغرب کے بربر سے تعلق رکھتے تھے۔ حصین بن الخیر العنبری کے غلام تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کی طرف سے بصرہ کے گورنر ہو کر گئے تو حصین نے حضرت عکرمہؓ کو حضرت ابن عباسؓ کی غلامی میں ہبۃً منتقل کر دیا[۴]۔ حضرت عکرمہؓ کی عمر اس وقت بہت تھوڑی تھی۔ اس لئے ان کی تمام تعلیم و تربیت حضرت ابن عباسؓ کے ہی دامان فضل و کرم میں ہوئی جس کے باعث وہ غلام ہونے کے باوجود علم و کمال کے آسمان پر مہر جہانتاب بن کر چمکے۔

---

(۱) اسد الغابہ جلد ۲ ص ۲۲۱۔ (۲) اصابہ ج ۳ ص ۲۲۔ (۳) اسد الغابہ جلد ۲ ص ۲۳۰۔

(۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹۔

تعلیم:

حضرت عکرمہؒ میں تحصیل علم کا شوق خداداد تھا، اور پھر انہیں حضرت ابن عباسؓ ایسا حبر اُمّت، ترجمان القرآن بزرگ مل گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان کو تعلیم دینے میں بڑی کوشش اور جدوجہد سے کام لیا سفر حضر میں ساتھ رکھتے تھے اور قرآن وسنن کی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عکرمہؒ نے مسلسل چالیس برس تک اپنے شفیق آقا کی خدمت میں علم کی تحصیل کی۔

فضل وکمال:

شاگرد کے ذوق اور استاد کی توجہ بے غایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عکرمہؒ علم کے دریائے بے پایاں بن گئے۔ ابن سعد لکھتے ہیں:

''کان کثیر العلم بحراً من البحور.''

''بہت علم رکھتے تھے اور ایک سمندر تھے۔''

امام بخاریؒ نے فرمایا ''کوئی ایسا نہیں ہے جو عکرمہؒ سے احتجاج نہ کرتا اور سند نہ پکڑتا ہو'' یحییٰ بن معینؒ فرماتے تھے ''عکرمہ معتبر ہیں اور تم جس کسی کو دیکھو کہ ان کی شان میں بے اعتباری کا اظہار کرتا ہے اس کے اسلام میں شک ہے'' عمرو بن دینارؒ کہتے ہیں ''مجھ کو حضرت ابوالشعثاء نے چند مسائل دیئے اور کہا'' ان کی بابت حضرت عکرمہ سے پوچھ لو کہ وہ سمندر ہیں۔ تم ان سے مسائل دریافت کیا کرو'' احمد بن عبداللہ العجلی نے فرمایا ''عکرمہ معتبر ہیں اور لوگ انہیں جس چیز سے متہم کرتے ہیں اس سے بَری ہیں'' حضرت عکرمہؒ خود فرماتے ہیں: ''بازار جاتا ہوں اور وہاں کسی شخص سے کوئی کلمہ سنتا ہوں تو اس سے علم کے پچاس دروازے میرے اوپر کھل جاتے ہیں۔ (۱)

ابوالشعثاء ان کو "اعلم الناس" کہتے تھے۔ اور حافظ ذہبی نے ان کو ''الحبر العالم'' لکھا ہے۔ (۲)

تفسیر میں کمال:

حضرت ابن عباسؓ تفسیر قرآن کے امام ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کے لئے تفسیر وتاویل کے علم کے حاصل ہونے کی دعا فرمائی تھی۔ اس بنا پر حضرت عکرمہ بھی ان کے

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات ج اص ۳۴۱۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۹۰۔

فیض صحبت وتوجہ سے تفسیر کے امام ہو گئے ۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ کو خود کسی آیت میں شبہ ہوتا تو اس کے لئے حضرت عکرمہ سے ہی رجوع کرتے تھے ایک مرتبہ آپ نے یہ آیت پڑھی:

''**لم تعظون قوماًالله مهلكهم او معذبهم عذابا شديدا.**''

''تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا ان کو شدید عذاب دینے والا ہے۔''

اور حضرت عکرمہ سے پوچھا ''مجھے نہیں معلوم ان لوگوں نے نجات پائی یا ہلاک ہو گئے۔'' عکرمہ نے پورے وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ یہ لوگ ناجی ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے خوش ہو کر ان کو ایک حلہ عطا فرمایا۔ (۱)

عثمان بن حکیم کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ابوامامہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اتنے میں عکرمہ آئے اور فرمانے لگے'' اے ابوامامہ! تم کو خدا کا واسطہ، تم نے کبھی حضرت ابن عباسؓ سے سنا ہے کہ عکرمہ تم سے جو کچھ کہے اس کی تصدیق کرو۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے؟'' ابوامامہ نے فرمایا ''ہاں''۔ (۲)

حضرت سعید بن جبیرؒ تابعین میں تفسیر کے امام ہیں ان سے کسی نے پوچھا '' آپ اپنے سے کسی اعلم کو جانتے ہیں'' فرمایا ''ہاں! وہ عکرمہ ہیں'' امام شعبیؒ فرماتے تھے: ''اب اللہ کی کتاب کا جاننے والا عکرمہ سے زیادہ کوئی نہیں ہے'' حضرت قتادہ فرماتے تھے '' تابعین میں سب سے بڑے عالم چار ہیں عطاء، سعید بن جبیر، عکرمہ، اور حسنؒ۔ انہی حضرت قتادہ سے دوسرا قول منقول ہے ''عکرمہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں تم ان کے پاس بیٹھا کرو۔''

ایک مرتبہ حضرت مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ نے حضرت عکرمہ سے بعض آیات کی تفسیر سے متعلق چند سوالات کئے حضرت عکرمہ نے ان سب کے جوابات نہایت تسلی بخش دیئے۔ جب یہ دونوں حضرات خاموش ہو گئے تو حضرت عکرمہؒ نے فرمایا ''فلاں آیت کا نزول فلاں واقعہ سے متعلق ہے اور فلاں آیت کا شان نزول یہ ہے۔''

ایوب کہتے ہیں ''جب سے عکرمہ بصرہ میں داخل ہوئے ہیں حضرت حسنؒ نے تفسیر بیان کرنی بہت کم کر دی ہے'' انہی ایوب المصری سے ابن جریج نے پوچھا ''کیا تم نے عکرمہ کی تقریریں قلمبند کی ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا ''تم سے دو تہائی علم فوت ہو گیا۔''

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۵۔

حضرت عکرمہ جرجان تشریف لے گئے تو وہاں لوگوں نے شہر بن حوشب سے دریافت کیا ''کیا ہم عکرمہ کے پاس نہ جائیں؟'' فرمایا ''تم ان کے پاس ضرور جاؤ کیونکہ کوئی امت ایسی نہیں ہے جس کا کوئی حبر نہ ہو۔ ہماری امت کا حبر ابن عباس کا غلام ہے۔[1]

فقہ:

تفسیر کے ساتھ فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابن عباسؓ نے ان سے فرمایا ''تم جاؤ اور لوگوں کو فتاویٰ دو، میں تمہارا مددگار رہوں'' عکرمہؒ بولے ''اگر لوگ جتنے اب ہیں اس سے دگنے بھی ہو جائیں میں ان کو اس وقت بھی فتوے دوں گا'' حضرت ابن عباسؓ نے پھر فرمایا ''جاؤ اور فتوے دو اگر کوئی تم سے کام کی بات دریافت کرے تو اسے فتویٰ دینا ورنہ چپ رہنا'' حضرت عکرمہؒ اپنے عہد میں مرجع خلائق تھے ایوب المصری کہتے ہیں ''میں ایک مرتبہ ارادہ کر رہا تھا کہ حضرت عکرمہ کے پاس جاؤں، ابھی بصرہ کے بازار میں تھا کہ کسی نے کہا ''یہ عکرمہ جا رہے ہیں'' میں ان کی سواری کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لوگ آتے تھے اور پوچھ پوچھ کر چلے جاتے تھے میں اس کو یاد کرتا جاتا تھا۔[2] انہی ایوب کا بیان ہے ''ایک مرتبہ عکرمہ ہمارے یہاں آئے ان کے پاس لوگوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ وہ مجبور ہو کر چھت پر چڑھ گئے۔[3]

حدیث: تفسیر و فقہ کے علاوہ حدیث ان کا خاص فن تھا۔ تفسیر کی طرح انہیں اس میں بھی بڑا کمال تھا حضرت ابن عباسؓ ان کے استاد شفیق تھے ہی۔ ان کے سوا انہوں نے صحابہ میں حضرت علیؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عمرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابو سعید خدریؓ، عقبہ بن عامرؓ حجاج بن عمرو بن غزیہ، معاویہ بن ابی سفیان، صفوان بن امیہ، یعلی بن امیہ، جابرؓ، ابو قتادہؓ، ام المومنین عائشہؓ، اور حمنہ بنت جحش سے بھی استفادہ کیا تھا۔[4]

حدیث میں ان کی وسعت علم کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت ابن عباسؓ کی مرویات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان میں اکثر روایتیں عکرمہ کے واسطہ سے ہی منقول ہیں ابن سعد ان کو ''کثیر الحدیث'' بتاتے ہیں۔

---

(۱) یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب سے منقول ہیں۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۶۔

(۳) ابن سعد ج ۵ ص ۲۰۳۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۶۔

جس طرح حضرت عکرمہ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے، ان کے تلامذہ بھی کثیر التعداد ہیں۔ صاحب تہذیب التہذیب نے ایک صفحہ میں ان کے نام درج کئے ہیں۔ ہم مشاہیر تلامذہ کے اسماءِ گرامی ذیل میں لکھتے ہیں، جس سے حضرت عکرمہ کی جلالتِ شان وابہت علم وفضل کا اندازہ ہوگا۔

ابراہیم نخعی، امام شعبی، قتادہ، سماک بن حرب، عاصم الاحول، ابواسحٰق سبیعی، ابوالزبیر، حصین بن عبدالرحمٰن، ایوب، خالد، داؤد بن ہند، عاصم بن بہدلہ، موسیٰ بن عقبہ، عمرو بن دینار، عطاء بن سائب، یحییٰ بن سعید انصاری، یزید بن ابی حبیب، ابواسحٰق شیبانی، ہشام بن حسان، یحییٰ بن کثیر، حکم بن عینیہ، داؤد بن الحصین، محمد بن سیرین، ابوالشعثاء وغیرہ۔

حضرت عکرمہ پر بعض لوگوں نے جرح کی ہے اور ان کے متعلق بری رائے ظاہر کی ہے ان حضرات میں زیادہ نمایاں شخصیت امام مالکؒ اور امام مسلمؒ کی ہے ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عکرمہ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ خوارج کے ایک فرقہ صفریہ کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک ان کی روایت کا تعلق ہے، اکثر ائمۂ مذہب نے انہیں ثقہ اور معتبر مانا ہے۔ امام بخاریؒ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ ''مجھے کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جس نے حضرت عکرمہ سے احتجاج نہ کیا ہو' حاکم ابواحمد فرماتے ہیں: ''ان کی حدیث سے ائمۂ قدماء نے سند لی ہے۔''

ابوعبداللہ محمد بن نصر المروزی فرماتے ہیں ''عام علماء حدیث نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت عکرمہ کی حدیث سے حجت پکڑنی چاہئے'' امام مسلمؒ ان کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے تاہم انہوں نے ان کی روایت کو قبول کیا ہے اور جرح کے بعد تعدیل کی ہے امام مسلمؒ کے ماسوا امام بخاریؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ ان سب نے اپنی صحاح میں حضرت عکرمہ کی مرویات درج کی ہیں۔ (۱)

قوت تقریر:

ان فضائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تقریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ جو بات بیان کرتے تھے، اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ابن عینیہ فرماتے ہیں کہ ''عکرمہ جب مغازی پر کلام کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اسے سنے تو یہ محسوس ہو کہ گویا وہ خود ارباب مغازی کو دیکھ رہا ہے اور تمام واقعات اس کے سامنے سے ہی گزر رہے ہیں۔

---

(۱) یہ سب معلومات تہذیب التہذیب جلد ۷ از صفحہ ۲۶۳ تا ۲۷۳ ماخوذ ہیں۔

غلامی سے آزادی:

یہ عجیب بات ہے کہ ارباب سیر لکھتے ہیں ''حضرت ابن عباسؓ کی وفات کے وقت حضرت عکرمہ غلام ہی تھے۔ ابن عباسؓ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ علی نے عکرمہ کو چار ہزار دینار کے بدلہ میں فروخت کردیا۔ اس پر عکرمہ نے کہا ''افسوس! تم نے اپنے باپ کا علم چار ہزار دینار کے عوض بیچ ڈالا'' علی اس سے بڑا متاثر ہوا، اور بیع کا اقالہ کرلیا۔ پھر حسبۃً للہ آزاد کردیئے گئے۔ (۱)

لطافت طبع:

مزاج لطافت پسند پایا تھا۔ کسی اچھی آواز کو بھی سنتے تو اس سے متاثر ہوجاتے تھے۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں ''ایک مرتبہ عکرمہ بصرہ آئے ہوئے تھے چند لوگ ان سے ملنے آئے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کہیں سے عمدہ گانے کی آواز آنے لگی حضرت عکرمہ بولے ''چپ رہو'' اور گانا سننا شروع کردیا، وہ ختم ہوگیا تو فرمایا ''کمبخت کس قدر عمدہ گا رہا تھا۔ (۲)

سیر و سیاحت کا شوق:

حضرت عکرمہ کو سیر و سفر کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے یمن، مصر، افریقہ اور اصفہان وخراسان وسمرقند ان سب کی سیاحت کی تھی۔ (۳)

وفات: ۱۰۷ھ یا ۱۰۶ھ میں اسی (۸۰) یا چوراسی (۸۴) برس کی عمر میں مدینہ میں وفات پائی۔ اتفاق سے اسی دن عرب کے مشہور غزل گو شاعر کثیر عزہ نے انتقال کیا تھا، لوگوں نے کہا ''افسوس آج افقه الناس (عکرمہ) اور اشعر الناس (کثیر) دونوں کا انتقال ہوگیا'' دونوں پر بعد ظہر ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ قیروان (شمالی افریقہ) میں وفات ہوئی تھی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ (۴)

اولاد: شادی اور اولاد کے متعلق تفصیل معلوم نہیں۔ البتہ علامہ ابن خلکان نے عمارہ بن حمزہ کو خطیب بغدادی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ کا پوتا بتایا ہے۔ (۵)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۰۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۰۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۷۰۔

(۴) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱۔ (۵) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۰۔

حضرت ابورافع ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ دوسرے ابورافع ہیں سعید بن عاص کے غلام تھے، سعید کے بعد اس کے بیٹوں کی ملکیت میں گئے۔

خالد کے علاوہ سعید کے تمام بیٹوں نے اپنے اپنے حصہ کو آزاد کردیا تھا خالد نے اپنا حصہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کردیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا حصہ آزاد کردیا اور اس طرح ابورافع مکمل طور پر غلامی سے نکل کر آزاد ہوگئے، ہمیشہ بہ انداز فخر کہا کرتے تھے میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام ہوں۔ (۱)

ابورافعؓ کے پوتے عثمانؒ نے اپنے دادا کے آزاد ہونے کا واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ جب ابورافع مسلمان ہوکر اور ہجرت کرکے مدینہ آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد سے ان کے معاملہ میں گفتگو فرمائی اس وقت خالد نہ تو ان کو آزاد کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور نہ ہبہ اور بیع کے لئے، لیکن بعد میں خالد کو اپنی اس جرأت پر بڑی ندامت ہوئی اور ابورافع کے رقبہ پر ان کا جو حصہ تھا وہ انہوں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ہبہ کردیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ہی ان کو آزاد کردیا۔ (۲)

حضرت نافع بن کاؤس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:

نافع نام ابوعبداللہ کنیت والد کا نام کاؤس یا ہرمز تھا، دیلم کے رہنے والے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کسی جنگ میں ملے تھے، اور ان کے غلام تھے۔ (۳)

جس طرح حضرت عکرمہ کو خوش قسمتی سے حضرت ابن عباسؓ کی غلامی میسر آ گئی تھی جن کے فیض تعلیم وتربیت سے وہ تابعین کے ائمۂ کبار میں سمجھے جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح بخت کی ارجمندی نے حضرت نافع کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی غلامی میں دے دیا۔ ابن عمرؓ نے نافع کی تعلیم وتربیت بہترین طریقہ پر کی جس کے باعث وہ علم وحدیث وتفسیر کے امام بلند مقام ہوگئے اور ان کا آستانۂ افادہ ودرس بڑے بڑے احرار ونجباء کے لئے بوسہ گاہِ عقیدت ہوگیا۔

---

(۱) اصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۷ ص ۶۵۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۵۱

آزادی:

نافع میں جو جوہرِ قابل قسام ازل کی طرف سے ودیعت رکھا گیا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ اس کے صحیح جوہر شناس تھے۔ وہ جانتے تھے ان کے زیر سایہ غلامی کی گدڑی میں کیسا لعل بے بہا پرورش پا رہا ہے جو ایک دن اپنی روشنی سے ارشاد وہدایت کی محفل کو بقعۂ نور بنا دے گا۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن جعفرؓ نے بارہ ہزار درہم کے عوض ان کو حضرت ابن عمرؓ سے خریدنا چاہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا، ایک دفعہ ابن عامر نے نافع کی قیمت کے سلسلہ میں ۳۰ ہزار درہم پیش کئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ''میں ڈرتا ہوں کہ ابن عامر کے درہم کہیں مجھ کو فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا: **اذهب فانت حرٌ** (جاؤ تم آزاد ہو)۔ (۱)

تعلیم: حضرت نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں تیس سال تک رہے۔ اس عرصہ میں حضرت ابن عمر نے ایسی توجہ خاص سے نافع کی تربیت کی کہ وہ آسمان علم وفضل پر مہر تاباں بن کر نمودار ہوئے۔

علم وفضل:

ان کی علمی جلالت شان کو تمام ائمۂ حدیث نے تسلیم کیا ہے۔ حضرت عکرمہؒ کے احوال میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تفسیر وحدیث اور فقہ میں امامت کا مرتبہ رکھتے تھے اہل مدینہ میں حضرت نافع حضرت عکرمہ سے بھی افضل سمجھے جاتے تھے۔ (۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرزند ارجمند حضرت سالم بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ''اگر نافع وسالم میں اختلاف ہو جائے تو نہیں جانتا کس کو ترجیح دوں امام نوویؒ نے فرمایا ''وہ جلیل المرتبت تابعی تھے ان کی ثقاہت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے۔''
خود حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''اللہ نے نافع کو عطا فرما کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے (۳)
خلیلی کا بیان ہے کہ نافع مدینہ کے ائمۂ تابعین میں سے تھے اور امام العلم مانے جاتے تھے (۴)
حافظ ذہبی انہیں ''الامام العلم'' لکھتے ہیں۔ (۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۳۱۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۴۱۳۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۲ص ۱۲۳۔
(۴) تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۴۱۳۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۹۴۔

حدیث:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث کے بحرِ بیکراں تھے، نافعؒ تیس سال تک اس بحر سے سیراب ہوتے رہے تھے، اور پھر انہوں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ اور دوسرے سرچشمہ ہائے حدیث سے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے صحابہ میں حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ ابوہریرہ، ابوسعید الخذری، ابوالبابہ، رافع بن خدیج، عائشہ، ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہم سے اور تابعین میں قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، یزید بن عبداللہ، اسلم مولیٰ عمر، ابراہیم بن عبداللہ، عبداللہ بن محمد بن ابی بکر الصدیق رحمہم اللہ سے حدیث کا سماع کیا۔ (۱) حدیث میں جلالت شان کا یہ عالم ہے کہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں:

اصح الاسانید مالک عن نافع عن ابن عمر.
سب سے زیادہ صحیح سند وہ ہے جس میں مالک نافع سے اور نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں:

امام مالکؒ فرماتے تھے "جب میں نافع سے ابن عمرؓ کی کوئی حدیث سن لیتا ہوں تو پھر کسی دوسرے سے اس کو سننے کی پروانہیں کرتا۔ ابن عیینہ کا بیان ہے "نافع کی حدیث سے زیادہ معتبر کس کی حدیث ہے؟ (۲)" ابن سعد فرماتے ہیں "نافع ثقہ کثیر الحدیث تھے" (۳) ابن فراش نے ان کو "ثقہ نبیل" (شریف معتبر) کہا ہے۔ "امام بخاری نے جس سلسلۂ اسناد کو اصح الاسانید کہا ہے۔ علمائے حدیث اس کو "سلسلۃ الذہب" (زنجیر طلائی) کہتے ہیں۔ (۴)

تلامذہ:

حضرت نافعؒ کا بابِ افادۂ درس بہت وسیع تھا اور اس سے بڑے بڑے ائمۂ دین و اکابرِ امت نے استفادہ کیا۔ چند خاص تلامذہ کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

ابواسحٰق سبیعی، زہری، حکیم بن عینہ، محمد بن عجلان، صالح بن کیسان، عبدربہ و یحییٰ، ابناء سعید، یونس بن عبید، یزید بن ابی حبیب، موسیٰ بن عقبہ، میمون بن مہران، جریر بن حازم حکم بن عتیبہ،

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۳۔
(۴) تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۵۱۔

سعد بن ابراہیم، ابن جریج، اوزاعی، مالک بن انس، اسامتہ بن زید اللیثی، عطاء الخراسانی، اعمش، ابن ابی لیلیٰ، ضحاک بن عثمان۔(۱)

امام مالکؒ حضرت نافعؒ کے خاص تلمیذ تھے بچپن سے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک ملازم کو لے کر نوعمری کے زمانہ میں ہی حضرت نافعؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، وہ تشریف لاتے اور مجھ کو احادیث سنایا کرتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت ان کے پاس کوئی نہیں آسکتا تھا۔ طلوع آفتاب کے بعد مسجد سے تشریف لاتے تھے۔

نافعؒ حضرت ابن عمرؓ کی مرویات کے اتنے بڑے عالم تھے کہ خود انہیں اس پر ناز تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے امام زہریؒ کی اس بات کی شکایت کی کہ وہ میرے پاس آتے ہیں میں ان کو حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں سنا دیتا ہوں۔ پھر وہ حضرت سالمؒ (حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادہ) کے پاس جا کر اسی روایت کے متعلق پوچھتے ہیں ''کیا اس کی نسبت آپ نے اپنے والد سے کوئی روایت سنی ہے؟'' سالم فرماتے ''ہاں'' اس کے بعد زہریؒ اس روایت کو سالم کے حوالہ سے بیان کرتے اور میرا کہیں ذکر نہ کرتے حالانکہ حدیث کا اصل سیاق میرے پاس ہوتا تھا۔(۲)

فقہ:

حضرت ابن عمرؓ کثیر الحدیث ہونے کے ساتھ اجلہ فقہائے صحابہ میں سے بھی تھے نافع ان کے شاگرد رشید تھے اس لئے فن حدیث میں امامت کی نعمت کے ساتھ فقاہت کی دولت بے پایاں بھی ان کے حصہ میں آئی تھی۔ حافظ ابن حجر ان کو ''نافع الفقیہ'' لکھتے ہیں (۳) لیکن اپنے آقازادہ حضرت سالمؒ کا احترام اس درجہ مرعی رکھتے تھے کہ ان کی موجودگی میں فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ ایک سیاہ چادر اوڑھتے، منہ لپیٹے رہتے، اور کسی سے کلام نہیں کرتے تھے (۴) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے انہیں سنن کی تعلیم کے لئے مصر بھیج دیا تھا۔(۵)

وفات:

۱۱۷ھ یا ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔(۶)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۱۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴۔ (۵) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۴۔ (۶) تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۵۱۔

تابعین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

سعید بن جبیرؒ

نام ونسب:

سعید نام، ابوعبداللہ یا ابومحمد کنیت۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ بنی والبہ بن الحارث بن ثعلبہ بن دودان کے غلام تھے (۱) والبہ اسد بن خزیمہ کی ایک شاخ تھی اس نسبت سے وہ الوالبی الاسدی کہلاتے ہیں۔ (۲)

تعلیم:

اسلام نے غلاموں کو اکتساب علم وفضل کی جو آزادی عطا فرمائی ہے سعید بن جبیر اس کی ایک مثال تاباں تھے۔ انہوں نے اس زمانہ میں ہوش سنبھالا جبکہ اکابر صحابہ کی بڑی تعداد اُٹھ چکی تھی، تاہم جو باقی تھے سعیدؒ نے ان سے تحصیل علم وکمال میں کوتاہی نہیں کی، چنانچہ صحابہ میں ان کے اساتذہ کے نام یہ ہیں:

عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، ابوسعید خدری، ابو ہریرہ، ام المومنین عائشہ صدیقہ، انس بن مالک، عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم۔ ان صحابہ کرام میں سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے خاص طور پر استفادہ کیا حضرت ابن عباسؓ جس طرح قرآن کے بہترین ترجمان اور فن حدیث کے بحر بیکراں تھے فقہ، فرائض اور ادب وانشاء، شعر وشاعری اور انساب جاہلیت کی معرفت میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اس بنا پر ان کا درس ان تمام چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا حضرت سعید بن جبیرؒ اس حلقۂ درس میں پوری پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کا تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ باہر کے سائلین جو سوالات کرتے اور مسائل پوچھتے تھے اور حضرت ابن عباسؓ ان کے جو جوابات دیتے تھے، سعید خاموشی کے ساتھ ان سب کو سنتے اور یاد کرتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خود بھی کوئی سوال کر لیتے، ورنہ عموماً چپ بیٹھے رہتے تھے۔ شروع میں حضرت ابن عباسؓ نے تقریر قلمبند کرانے کی ممانعت فرما دی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے بعد میں لکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ بعض دن اس کثرت سے مسائل پیش آتے تھے کہ لکھتے لکھتے ابن جبیرؒ کی بیاض پر ہو جاتی تھی اور انہیں کپڑوں اور ہتھیلیوں پر لکھنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ (۳)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۲۔ (۲) لب الالباب۔ (۳) ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹۔

حضرت ابن عباسؓ کے بعد انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے فائدہ اٹھایا، ابن جبیر قیام کوفہ کے زمانہ تک جب کہ وہ خود صاحب افتاء ہو گئے تھے حضرت ابن عمرؓ سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں ''جب کسی مسئلہ میں علماء کوفہ باہم مختلف ہوتے تھے تو میں اس مسئلہ کو لکھ لیتا اور پھر حضرت ابن عمرؓ سے ملاقات ہوتی تو اسے دریافت کر لیتا تھا۔''(۱)

علم و فضل:

ان اساتذۂ کرام کے فیض خاص اور سعید بن جبیر کی محنت و توجہ اور ذوق شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعیدؒ تفسیر، حدیث فقہ اور فرائض میں امام و شیخ بن گئے اور اقلیم شہرت و عظمت کے تاجدار بن کر نمودار ہوئے۔ امام نووی فرماتے ہیں ''سعید بن جبیر تابعین کے ائمۂ کبار میں سے تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور عبادت اور دوسری صفاتِ خیر میں ان کے پیشرو بزرگوں میں سے تھے (۲) میمون بن مہران کہتے ہیں ''سعید بن جبیر کا انتقال ہو گیا اور آج زمین پر کوئی ایک شخص ایسا نہیں ہے جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو'' (۳) اشعث بن قیس کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر کو جهبذ العلماء (رئیس العلماء) کہا جاتا تھا۔ (۳)

تفسیر:

حضرت سعیدؒ کو ابن عباسؓ سے شرف تلمیذ حاصل تھا جو قرآن مجید کے ترجمان تھے اس بنا پر ان کو بھی تفسیر و تاویل اور شانِ نزول کے علم میں بڑا کمال حاصل تھا جب ان کے سامنے کوئی آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ اس کے مصداق فوراً بتا دیا کرتے تھے ابو یونس قزی کہتے ہیں ''میں نے ایک دفعہ سعید بن جبیرؒ کے سامنے یہ آیت پڑھی "الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان" مگر کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے، انہوں نے کہا ''اس میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ مکہ کے چند ستم رسیدہ تھے'' میں نے کہا ''میں ایسے ہی لوگوں (حجاج کے ستم رسیدہ) کے پاس سے آرہا ہوں۔'' سعید بولے ''بھتیجے! ہم لوگوں نے اس کے خلاف بڑی کوشش کی، لیکن کیا کیا جائے، خدا کی مرضی یہی تھی''، اعمشؒ فرماتے ہیں ''سعید بن جبیرؒ سے کسی نے ان ارضی واسعة کی تفسیر دریافت کی تو فرمایا'' ...... اس سے مراد یہ ہے کہ جب اس میں گناہ کیا جائے تو اس سے نکل جاؤ۔ (۴)

---

(۱) ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲۔

(۴) ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳۔

تفسیر میں احتیاط:

تفسیر کا درس زبانی دیتے تھے اور یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص اس کو قلمبند کرے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا، اور تقریر قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ میرے ایک پہلو پر فالج گر پڑے، یہ بہتر ہے اس سے کہ میں تقریر لکھنے کی اجازت دیدوں (۱)'' مگر خاص خاص اہل ذوق کو لکھنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ چنانچہ وقاء بن ایاس بیان کرتے ہیں ''عزرہ تفسیر کی کتاب اور دوات لے کر حضرت ابن جبیرؒ کے پاس آتے تھے۔ (۲)

قرأت:

تفسیر کے ساتھ قرأت میں بھی کمال رکھتے تھے۔ رمضان میں امامت خود ہی کرتے تھے۔ مشہور قرأتوں کا علم حاصل تھا۔ ایک رات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت اور دوسری شب حضرت زید بن ثابتؓ کی قرأت پڑھتے تھے۔ (۳)

حدیث:

حدیث کے اکابر حفاظ میں سے تھے، اجلۂ صحابہ سے حدیث کا سماع کیا تھا حضرت ابن عباسؓ کے تلمیذ خاص تھے جو ان پر خاص شفقت کی نگاہ رکھتے تھے۔

مجاہد فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ نے سعیدؒ سے کہا ''حدیثیں سناؤ'' انہوں نے عرض کیا ''میں آپ کی موجودگی میں حدیث کس طرح سنا سکتا ہوں؟'' ابن عباسؓ نے فرمایا ''کیا یہ خدا کی نعمت نہیں ہے کہ تم میرے سامنے حدیثیں بیان کرو، اگر صحیح بیان کرو گے تو فبہا ورنہ میں اس کی تصحیح کردوں گا'' (۴) بنی دواعہ کے مؤذن کا بیان ہے ''میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا وہ ایک گدے پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اور سعیدؒ ان کے پیروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضرت ابن عباسؓ ان سے فرما رہے تھے ''تم نے مجھ سے بہت حدیثیں یاد کی ہوئی ہیں اب دیکھوں ان کو کیسے روایت کرتے ہو۔'' (۵)

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵۔ (۲) ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳۔ (۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۸۔

(۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۴۔ (۵) ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹۔

روایت حدیث میں احتیاط:

مگر کبارِ حفاظ حدیث میں ہونے کے باوجود روایت کے معاملہ میں محتاط تھے موقع دیکھ کر روایت کرتے تھے۔ محمد بن حبیبؒ کا بیان ہے کہ سعید بن جبیرؒ اصفہان میں تھے تو لوگوں نے روایتِ حدیث کی درخواست کی مگر انہوں نے اُسے منظور نہیں کیا۔ پھر جب کوفہ میں آئے تو احادیث بیان کرنے لگے کسی نے ان سے پوچھا ''اے ابومحمدؒ! آپ اصفہان میں تو حدیث بیان کرتے نہیں تھے کوفہ میں آ کر حدیثیں کس طرح بیان کرنے لگے'' فرمایا ''انشر بزک حیث یعرف'' تم اپنے تھان وہاں کھولو جہاں اس کو پہچاننے والے موجود ہوں۔ (۱)

فقہ:

قرآن وحدیث میں بصیرت تامہ رکھنے کی وجہ سے انہیں فقہ میں بھی امامت کا درجہ حاصل تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے انہیں فتویٰ دینے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، مگر جب وہ نابینا ہو گئے تو حضرت سعید بن جبیرؒ لکھنے لگے (۲) خود حضرت ابن عباسؓ کو اتنا اعتماد تھا کہ اہل کوفہ حج کرنے آئے اور مکہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مسائل دریافت کرتے تو وہ فرماتے ''کیا تم میں سعید بن جبیرؒ نہیں ہیں۔ امام نوویؒ ان کو جہاں تفسیر وحدیث میں کبار ائمۃ التابعین میں شمار کیا ہے، فقہ میں بھی کیا ہے۔

نصیبؒ کا بیان ہے کہ مسائل طلاق کے سب سے بڑے عالم سعید بن المسیبؒ تھے۔ حج کے عطاءؒ، حرام وحلال کے طاؤسؒ، تفسیر کے مجاہدؒ اور ان سب کے جامع سعید بن جبیرؒ تھے۔ (۳)

فرائض:

فرائض میں خاص ملکہ تھا جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم فرائض کے سائلوں کو ان کے پاس بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس اسی قسم کا سائل آیا۔ آپؓ نے اس کو سعید بن جبیرؒ کے پاس بھیج دیا، اور فرمایا ''فرائض کا علم جتنا مجھ کو ہے ان کو بھی ہے۔ مگر وہ حساب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں (۴) جب کبھی مدینہ تشریف لے جاتے۔ علماءِ مدینہ ان سے فرائض سیکھتے تھے۔

---

(۱) ابن خلکان ج ا ص ۲۰۵۔ (۲) ابن خلکان ج ا ص ۲۰۴۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ا ص ۲۱۶۔

(۴) ابن سعد ج ۶ ۱۸۰۔

امام زین العابدینؒ کا بیان ہے کہ ابن جبیرؒ ہمارے یہاں سے گزرتے تو ہم ان سے فرائض اور وہ باتیں دریافت کرتے تھے جن سے خدا نے ہم کو فائدہ پہنچایا۔

اشاعت علم کا شوق:

حضرت سعید ابن جبیرؒ کے سینہ میں علم وفضل کا جو خزانہ ودیعت تھا انہوں نے حسب موقع ومصلحت اس کو شائع کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا بعض لوگ آپ کو حدیث بیان کرنے پر ملامت کرتے تھے۔ آپؒ نے فرمایا "میں تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے حدیث بیان کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ میں اسے قبر میں ساتھ لے جاؤں۔"(۱)

تلامذہ:

شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس میں بعض اکابر امت ہوئے ہیں چند بزرگوں کے نام یہ ہیں: عبدالملک، عبداللہ، یعلی بن حکیم، یعلی بن مسلم، ابو اسحٰق سبیعی، ابوالزبیر مکی، آدم بن سلیمان، اشعث بن ابی الشعثاء ذر بن عبداللہ، سالم الافطس، مسلمہ بن کہیل، طلحہ بن مصرف، عطاء بن السائب، عبدالملک بن سلیمان، مغیرہ بن النعمان وغیرہ۔ (۲)

مشیر کاری قضاء:

کوفہ میں کچھ دنوں تک عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے اور پھر ان کے بعد ابو بردہ ابن ابی موسیٰ اشعری کے پیش کار رہے۔ (۳)

تقویٰ:

ان تمام علمی کمالات کے ساتھ زہد واتقاء میں بھی درجۂ امتیاز رکھتے تھے خشیت ربانی حد سے بڑھا ہوا تھا، سوز وگدازِ قلب جو تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ قاسم ابن ابی ایوب کہتے ہیں "سعید بن جبیرؒ رات بھر روتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں چندھیاہٹ پیدا ہوگئی تھی (۴)۔" مزید فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک مرتبہ دیکھا کہ آیت:

---

(۱) ابن سعد ج ۶ ۱۸۰۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ص ۱۲۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۷۲۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۷۲۔

"واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله."

"تم ڈرو اس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

پڑھ رہے تھے اور روتے جاتے تھے۔ (۱)

غیبت کرنا اور سننا دونوں سے سخت احتراز کرتے تھے۔ مسلم البطین کہتے ہیں "سعیدؒ اپنے روبرو کسی کو غیبت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ اس سے فرماتے "جو کچھ تم کو کہنا ہے اس کے سامنے کہو۔"

نماز میں خشوع:

نماز نہایت خشوع سے ادا کرتے تھے کبھی اس میں اس قدر انہماک ہوتا کہ ایک رکعت میں ہی تمام قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ عبدالملک بن سلیمانؒ بیان کرتے ہیں کہ دو رکعتوں میں قرآن مجید ختم کر دیا کرتے تھے۔ (۲)

ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے کہ یہ آیت:

"اذ الا غلال فی اعناقهم والسلاسل یسحبون فی الحمیم."

"جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں اور وہ گرم پانی پینے کے لئے گھسیٹے جاتے ہوں گے۔"

آ گئی، اتنی رقت طاری ہوئی کہ اس کو بار بار دہراتے رہے۔ (۳)

دعاء میں اثر:

ان کے ان اعمالِ نیک کا ہی ثمرہ تھا کہ ان کی دعاء میں بڑی تاثیر تھی۔ ان کے ہاں ایک مرغ تھا جو رات کو بانگ دے کر انہیں بیدار کر دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک رات اس نے بانگ نہیں دی، حضرت سعید بن جبیرؒ کی آنکھ نہیں کھلی اور وہ صبح تک پڑے سوتے رہے، صبح کو اٹھے تو انہیں شب کا بیدار نہ ہونا بہت برا معلوم ہوا غصہ میں فرمانے لگے "اس مرغ کو کیا ہو گیا تھا، اللہ اس کی آواز کو ختم کر دے" ان کا یہ کہنا تیر بہدف ہوا اور اس مرغ نے پھر دوبارہ کبھی بانگ نہیں دی۔ ان کی والدہ نے فرمایا "اب آئندہ سے کبھی کسی کے حق میں بددعا نہ کرنا۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲۔ (۳) ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۱۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۔

علماءِ سوء سے اجتناب:

علماءِ سوء کو نہایت برا جانتے تھے اور انہیں مسلمانوں کے لئے خطرۂ عظیم سمجھتے تھے ہلال بن خباب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا "لوگوں کی ہلاکت کس وجہ سے ہوگی؟" فرمایا: ان کے علماء کے ہاتھوں۔ (۱)

سیر و سیاحت اور قضاء کوفہ:

ابن جبیرؒ کو سیر و سیاحت کا شوق تھا، ایک عرصہ تک مدینہ رہے، یہاں سے اصفہان چلے گئے اور وہاں ایک مدت تک قیام کرنے کے بعد عراق آ گئے۔ مختلف شہروں میں پھرنے کے بعد ایک گاؤں سنبلان میں اقامت اختیار کر لی۔ (۲) حجاج بن یوسف ان کے علم و فضل کی قدر کرتا تھا، چنانچہ اس نے کوفہ کا امام اور قاضی مقرر کر دیا۔ لیکن کوفہ کے لوگ نہایت شورہ پشت تھے، کسی کی گورنری سے خوش ہی نہیں ہوتے تھے۔ حسبِ عادت ابن جبیرؒ کے خلاف بھی شور وغل مچایا اور کہا "ہمارا حاکم تو کوئی عربی ہی ہونا چاہئے" مجبوراً حجاج کو انہیں عہدۂ قضا سے برطرف کرنا پڑا۔ ان کے بجائے ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعریؒ کوفہ کے قاضی مقرر کر دیئے گئے مگر حجاج نے تاکید کر دی تھی کہ ابن جبیرؒ سے امور قضاء میں مشورے لیتے رہنا۔ (۳)

حجاج کی مخالفت:

حجاج حضرت ابن جبیرؒ کی ہر طرح عزت افزائی کرتا تھا، لیکن وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور اس کی بے پناہ سفاکیوں کو انتہائی نفرت و غصہ کی نگاہ سے دیکھتے۔ چنانچہ جب ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعثؒ نے حجاج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ابن جبیرؒ اس کے ساتھ ہو کر حجاج سے لڑے۔

تاریخ میں حجاج و ابن اشعث کی مخالفت کا واقعہ مشہور ہے، اس کی تفسیر یہ ہے کہ عبدالملک کے عہد میں بجستان کے فرمانروا رتبیل نے باغیانہ روش اختیار کی تھی۔ حجاج نے عبیداللہ ابن ابوبکرہ کو ایک لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، انہوں نے سیستان پہنچ کر فوج کشی کی۔ شروع شروع میں انہیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی مگر بعد میں شکست ہوگئی جس کے باعث

---

(۱) ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳۔ (۲) ابن خلکان ج اص ۲۰۵۔ (۳) ایضاً۔

مسلمانوں کو شدید جانی و مالی نقصان برداشت کرنے پڑے۔ حجاج کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اس نے ابن اشعث کی زیرِ سرکردگی چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار بڑے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا۔ اس لشکر میں بیس ہزار سپاہی کوفہ کے تھے اور بیس ہزار بصرہ کے۔ حضرت سعید ابن جبیرؒ بھی اس فوج میں شریک تھے۔ ان کے سپرد تنخواہ تقسیم کرنے کی خدمت تھی۔ (۱)

ابن اشعث اس فوجِ گراں کو لئے بڑھتے رہے۔ رتبیل کو اس کی اطلاع ہوئی، تو اس نے نامہ و پیام کے ذریعہ مصالحت کرنی چاہی اور پہلی دفعہ مسلمانوں کو اس کے ہاتھ سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی معذرت کی، مگر ابن اشعث نے ایک نہی سنی۔ انہوں نے حدودِ سیستان میں داخل ہو کر کئی علاقے فتح کر لئے مگر بعض مصلحتوں کے پیش نظر مزید پیش قدمی ایک سال کے لئے ملتوی کردی اور حجاج کو خط کے ذریعہ اس کی اطلاع بھی دے دی۔ حجاج خط پڑھ کر برافروختہ ہو گیا، اور اس نے جواب میں لکھا ''تمہارا خط اس شخص کا سا خط ہے جو اغماض و صلح کو پسند کرتا ہے اور دشمن سے سمجھوتہ کرکے آرام کرنے کا خواہشمند ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم نے یہ خط کسی مکاری کی بنا پر لکھا ہے'' البتہ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم نے یہ رائے اپنے ضعف اور سہل انگاری کی بنا پر قائم کی ہے۔'' اس خط کے بعد ایک اور خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ اگر تم خود پیشقدمی نہیں کر سکتے تو اپنے بھائی اسحٰق بن محمد کو لشکر کی قیادت سپرد کردو، اور تم الگ ہو جاؤ۔ ابن اشعث اور حجاج میں پہلے سے مخالفت تھی اور دونوں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس خط نے دل میں چھپی ہوئی بدگمانی کو بے نقاب کر دیا۔ ابن اشعث اس کو پڑھتے ہی بگڑ گیا اور اس نے وہیں ایک مجمع کرکے لوگوں کو حجاج کی مخالفت پر ابھارا، اہل فوج حجاج کے مظالم سے پہلے ہی نالاں تھے بڑے بڑے سردار اس کے حامی ہو گئے۔ شروع میں یہ مخالفت صرف حجاج کے ساتھ تھی لیکن بعد میں اس نے عبدالملک کی مخالفت کی صورت اختیار کر لی۔ ابن اشعث اپنے حامیوں کی جماعت لئے ہوئے عراق پہنچا، ادھر حجاج نے ایک فوج گراں کے ساتھ ابن اشعث کے مقابلہ کے لئے عراق سے کوچ کیا، دو ماہ تک جنگ ہوتی رہی، ابن اشعث کے ساتھ بہت سے علماء اور قراُ تھے جن کے سرگروہ سعید بن جبیرؒ تھے۔

(۱) ابن جریر طبری ج ۸ ص ۹۳۔

ابن اشعث کی شکست:

ابتداءً ابن اشعث کی قوت مضبوط تھی، مگر جب مقابلہ کی زُد پر حکومت بھی آ گئی تو اس کا زور گھٹ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ دیر جماجم میں شکست فاش کھانی پڑی ابن اشعث تو بھاگ کر سیستان چلا گیا، ابن جبیرؒ پھرتے پھراتے مکہ چلے آئے۔ یہاں کے والی خالد بن عبداللہ قشری نے گرفتار کر کے انہیں حجاج کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا[1] انہیں دیکھتے ہی غیظ و غضب سے بے قابو ہو گیا، پھر دونوں میں حسب ذیل مکالمہ ہوا:

حجاج: تمہارا نام کیا ہے؟

سعید: سعید بن جبیر

حجاج: نہیں! بلکہ شقی بن کثیر۔

ابن جبیر: میری ماں بہ نسبت تمہارے میرے نام سے زیادہ واقف تھیں۔

حجاج: وہ بھی بد بخت اور تم بھی بد بخت ہو۔

ابن جبیر: غیب کا علم کسی دوسری ہی ذات کو ہے۔

حجاج: میں تمہاری دنیا کو دہکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔

ابن جبیر: اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے تو میں تم کو معبود بنا لیتا۔

حجاج: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟

ابن جبیر: وہ امامِ ہدیٰ اور نبی رحمت تھے۔

حجاج: علی اور عثمان کے بارہ میں کیا رائے ہے؟

ابن جبیر: اگر میں وہاں گیا ہوتا اور وہاں کے رہنے والوں کو دیکھا ہوتا تو بتا سکتا تھا۔

حجاج: خلفا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

ابن جبیر: میں ان کا اجارہ دار نہیں ہوں۔

حجاج: ان میں تم کو سب سے زیادہ پسند کون ہے؟

ابن جبیر: جو میرے خالق کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

حجاج: خالق کے نزدیک کون سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟

---

(1) ابن جریر طبری ج ۸ ص ۲۰۷ ملخصاً۔

ابن جبیر: اس کا علم اس ذات کو ہے جو ان کے بھیدوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے

حجاج: میں چاہتا ہوں کہ تم میری تصدیق کرو۔

ابن جبیر: اگر میں تم کو محبوب رکھتا تو ہرگز تمہاری تکذیب نہ کرتا۔

حجاج: تمہیں کیا ہو گیا کہ ہنستے نہیں ہو۔

ابن جبیر: وہ مخلوق کس طرح ہنسے جو مٹی سے پیدا کی گئی ہے، حالانکہ مٹی کو آگ کھا جاتی ہے۔

حجاج: پھر ہم کیوں ہنستے ہیں؟

ابن جبیر: سب دل برابر نہیں ہیں!

اس کے بعد حجاج نے موتی، زبرجد اور یاقوت منگوائے اور ان سب کو اپنے سامنے جمع کیا۔ حضرت ابن جبیرؒ بولے ''اگر تم نے ان چیزوں کو اس لئے جمع کیا ہے کہ ان کے ذریعہ روزِ قیامت کے خوف سے بچ جاؤ تو درست ہے ورنہ یاد رکھو قیامت کا ایک جھٹکا دودھ پلانے والی عورتوں کو ان کے شیر خوار بچوں سے غافل کر دے گا اور جو چیزیں دنیا کے لئے جمع کی جائیں ان میں صرف وہی عمدہ اور پسندیدہ چیزیں ہیں جو پاکیزہ اور طیب ہوں۔'' اس کے بعد حجاج نے عود اور بانسری بجانے کا حکم دیا۔ ابن جبیر بانسری کی آواز سن کر رو پڑے۔ حجاج بولا ''اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ تو ایک تفریحی چیز ہے۔' ابن جبیر نے کہا ''نہیں! یہ تو ایک صدائے غم ہے، بانسری کے بجنے نے مجھ کو وہ بڑا دن یاد دلا دیا جبکہ صور پھونکا جائے گا، اور عود ایک ناحق کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے اور اس کے تار ان بکریوں کے پٹھوں کے ہیں جو ان کے ساتھ قیامت کے دن اٹھائی جائیں گی۔'' اس گفتگو کے بعد حجاج بولا ''سعید! تمہاری حالت قابل افسوس ہے'' ابن جبیر نے جواب دیا ''وہ شخص افسوس کے قابل نہیں ہے جو آگ سے نجات پا گیا ہو، اور جنت میں داخل کر دیا گیا ہو۔'' پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

حجاج: کیا یہ صحیح ہے کہ تم کوفہ میں آئے جبکہ وہاں ایک شخص بھی غیر عربی نہیں تھا اور میں نے تم کو وہاں کا امام و قاضی بنایا؟

ابن جبیر: کیوں نہیں!

حجاج: کیا یہ درست نہیں ہے کہ تمہارے عہدۂ قضاء پر مامور ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ نے شور و غل مچایا اور مطالبہ کیا کہ ہمارا قاضی عربی النسل ہونا چاہئے۔ تو میں نے تمہاری بجائے ابو بردہ ابن ابی موسیٰ اشعریؒ کو قاضی بنا دیا، مگر ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ وہ تمہارے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں؟

ابن جبیر: ہاں یہ بھی صحیح ہے۔

حجاج: کیا میں نے تم کو اپنا ندیمِ خاص نہیں بنایا حالانکہ میرے خاص اہل مجلس سب عرب کے بڑے بڑے سردار تھے؟

ابن جبیر: یہ بھی درست ہے۔

حجاج: کیا میں نے پہلی ہی ملاقات میں تم کو ایک لاکھ کی بیش قرار رقم نہیں دی کہ تم اس کو اربابِ ضرورت پر خرچ کرو۔ پھر میں نے تم سے اس کا کوئی حساب بھی نہیں مانگا؟

ابن جبیر: بیشک یہ بھی بجا ہے۔

حجاج: پھر (ان احسانات کے باوجود) تم کو میری مخالفت پر کس چیز نے آمادہ کیا؟

ابن جبیر: عبدالرحمٰن بن اشعث کی بیعت نے جس کا طوق میری گردن میں تھا۔

حجاج یہ سن کر قابو سے باہر ہو گیا، اور کہنے لگا ''کیا پہلے سے امیر المؤمنین عبدالملک کی بیعت کا طوق تمہاری گردن میں نہیں تھا، بخدا! اب میں تم کو قتل کیے بغیر نہیں رہوں گا۔ (۱)

ابن جبیر: اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو وقت مقرر کر دیا ہے میں اس پر ضرور اس کے پاس پہنچوں گا۔

حجاج نے جلادوں کو حکم دیا کہ ان کو لے جاؤ اور قتل کر دو۔ اس پر ابن جبیرؒ نے کلمۂ تشہد پڑھا اور کہا ''اے حجاج اس کو میری طرف سے یاد کر لو، تاکہ حشر میں میری اور تمہاری پھر ملاقات ہو جلاد ابن جبیرؒ کو لے کر چلنے لگے تو انہیں ہنسی آ گئی۔ حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو پوچھا ''تمہیں ہنسی کیوں آئی؟'' بولے ''اللہ کے خلاف تیری جرأت اور تیرے متعلق اللہ کی شانِ بردباری دیکھ کر'' انہوں نے یہ کہہ کر قبلہ کی طرف رخ کیا اور آیت پڑھی ''اِنِّیْ وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین.'' حجاج ابن جبیر کا قبلہ رو ہونا بھی برداشت نہیں کر سکا۔ حکم دیا ''قبلہ سے ان کا رخ پھیر دو'' فرمایا:

''فاینما تولوا فثم وجه اللہ ان اللہ واسع علیم.''

''تم جس طرف بھی اپنا رخ کرو گے اللہ ادھر ہی ہوگا۔ بیشک اللہ وسیع اور علیم ہے۔''

حجاج نے حکم دیا ''انہیں زمین کے بل لٹا دو'' ابن جبیر نے پڑھا:

''منھا خلقنا کم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃ اخریٰ.''

---

(۱) یہ واقعہ طبری ج ۸ ابن اثیر ج ۴ اور ابن خلکان ج ا ص ۲۰۵-۲۰۶ میں اسی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے ہم نے موقع ومحل گفتگو کے پیشِ نظر کسی قدر تفصیل بدل دی ہے۔

''ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹا دیں گے اور پھر دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں گے۔''

غیر معمولی استقامت:

بالآخر حجاج نے حکم دیا کہ ''قتل کر دیئے جائیں'' یہ حکم سن کر ایک شخص رونے لگا۔ ابن جبیر نے پوچھا ''کیوں روتے ہو؟ وہ بولا'' آپ کے قتل پر'' فرمایا'' اس پر رونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ کو یہ واقعہ پہلے سے معلوم ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

''ما اصاب من مصيبة فى الارض ولا فى انفسكم الا فى كتاب من قبل ان نبراها.''

''زمین میں یا تمہارے نفسوں پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ سب کتاب میں ان کے پیدا کرنے سے پہلے لکھ دی گئی تھیں۔''

عمر بن سعید کہتے ہیں کہ ابن جبیرؒ نے مقتل میں جانے سے پہلے اپنے صاحبزادے کو بلایا، وہ آئے تو باپ کو دیکھ کر رونے لگے۔ حضرت ابن جبیرؒ نے فرمایا: ''بیٹے! روتے کیوں ہو؟ تمہارے باپ کی عمر ستاون سال کی تو ہوگئی، اب اس کے بعد زندہ رہنا کیا ضروری تھا۔''

قتل ہونے کا وقت قریب آیا تو حجاج نے پھر پوچھا ''بولئے آپ کس کروٹ قتل ہونا چاہتے ہیں'' فرمایا'' قصاص تیرے سامنے ہے، جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ اب جس طرح تو پسند کرلے کر'' جلاد شمشیر برہنہ لئے ہوئے پہلے سے موجود تھا۔ حجاج کی زبان سے قتل کا حکم نکلنا تھا کہ جلاد کی تلوار دفعتہً ابن جبیرؒ کے سر پر چمکی اور عشق الٰہی کے سودا سے بھرا ہوا سر کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہوا زمین پر آ گرا۔

شہادت کے بعد کے حالات:

قتل ہونے سے پہلے ابن جبیرؒ نے دعا کی تھی ''اے اللہ میرے بعد تو حجاج کو کسی پر مسلط نہ کر کہ وہ اس کو قتل کر سکے'' یہ دعا مقبول ہوئی، چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ابن جبیر کی شہادت کے چھ ماہ بعد حجاج بھی مر گیا، اور ان چھ مہینوں میں کسی اور کو قتل نہ کر سکا، شہادت کے وقت ایک عجیب واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت ابن جبیرؒ کے جسم سے عام مقتولوں کے برخلاف خون

زیادہ نکلا، یہاں تک کہ بہہ کر حجاج کے جائے نشست کے نیچے آ گیا۔ حجاج کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے فوراً اطباء کو بلا کر وجہ دریافت کی۔ انہوں نے کہا ''خون، روح کے تابع ہوتا ہے، تم نے اس سے پہلے جن لوگوں کو قتل کیا ہے خوف و دہشت کی وجہ سے ان کی روح پہلے ہی پرواز کر چکی تھی، پھر ان میں خون کہاں سے آتا؟ لیکن ابن جبیرؒ کا معاملہ ان کے برعکس تھا ان پر خوف و دہشت طاری نہیں ہوئی اور قتل کے وقت روح ان کے اندر موجود تھی۔ (۱)

یہ واقعہ شہادت شعبان ۹۴ھ میں پیش آیا۔ سمعانی کے نزدیک اس وقت ان کی عمر ترپین سال کی، اور ابن قتیبہ کی رائے میں انچاس سال کی تھی۔ (۲)

حجاج پر اثر:

حضرت ابن جبیرؒ کا خونِ ناحق رنگ لایا، اور حجاج پر عرصۂ زیست تنگ ہو گیا حجاج مرض الموت میں مبتلا تھا کہ خواب میں انہیں دیکھا کہ اس کے کپڑے پکڑ کے کھینچ رہے ہیں اور کہتے ہیں ''اے دشمنِ خدا! تو نے مجھ کو کیوں قتل کیا تھا'' حجاج یہ خواب دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اور آنکھ کھلی تو اس وقت بھی اس کا بدن خوف سے کانپ رہا تھا، اس پر بار بار سکرات الموت طاری ہوتے تھے اور جب ذرا ہوش آتا تھا تو کہتا تھا ''میں اپنے اور ابن جبیرؒ کے معاملہ کو کیا کروں؟ اسی طرح کا ایک وحشت انگیز خواب عبدالملک نے بھی دیکھا تھا۔ (۳)

حسن بصریؒ پر اثر:

حضرت ابن جبیرؒ کے اس قتلِ ناحق نے اکابر تابعین میں غم و ماتم کی صفیں بچھا دیں۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ''اے خدا! ثقیف کے فاسق (حجاج) سے اس کا انتقام لے۔ خدا کی قسم اگر تمام روئے زمین کے رہنے والے ان کے قتل میں شریک ہوتے تب بھی خدا ان کو منہ کے بل دوزخ میں جھونک دیتا۔ (۴)

مزار:

حضرت سعیدؒ کا مزار شہر واسط میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے، جہاں ان کا جسمِ مبارک سپرد خاک کر دیا گیا تھا لوگ اس سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ (۵)

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۶۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶۔ (۳) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۶۔

(۴) ایضاً۔ (۵) شذرات الذہب۔

حلیہ:

حلیہ یہ تھا رنگ سیاہ، سر اور ڈاڑھی دونوں سپید، خضاب لگانا پسند نہ کرتے تھے [1] عمامہ باندھتے تھے اور پیچھے کی جانب ایک بالشت شملہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ [2]

اولاد:

اولاد میں تین لڑکے تھے: عبداللہ، محمد اور عبدالملک۔ [3]

سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

سلیمان نام، ابوایوب کنیت۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے غلام تھے۔ انہوں نے ان کو مکاتب کر دیا تھا۔ اس غلامی کے توسل سے ان کو حرم نبوی میں آنے جانے کا شرف حاصل تھا۔ جب تک آزاد نہیں ہو گئے ازواج مطہرات نے ان سے پردہ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں، میں نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپؓ نے آواز پہچان کر فرمایا، تم نے بدلِ کتابت ادا کر دیا یا نہیں میں نے عرض کیا ''جی ہاں! ابھی تھوڑا سا باقی ہے'' ارشاد ہوا ''اندر چلے آؤ۔ جب تک تمہارے ذمہ کچھ بھی باقی ہے تم غلام رہو گے؟

فضل وکمال:

حضرت سلیمان خداداد ذہانت وجوہرِ قابل رکھتے تھے۔ پھر خانوادۂ نبوت میں بودوباش نے ان کے جوہر کو اور چمکا دیا تھا۔ اس بنا پر وہ مدینہ کے ممتاز ترین علماء میں ہو گئے ابن سعد فرماتے ہیں ''وہ ثقہ عالم، بلند مرتبت فقیہ، کثیر الحدیث تھے، اور لوگوں کا ان کی جلالتِ شان و کثرتِ علم پر اتفاق ہے، ان کا شمار مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ہوتا تھا۔ ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں ''سلیمان بن یسار مدنی ثقہ، قابل اعتماد واعتبار اور فاضل وعابد تھے۔

---

(۱) ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۷۔

قرأت

حضرت سلیمانؒ کو تمام علومِ دینیہ، قرآن، حدیث، فقہ میں کمال حاصل تھا مدینہ کے مشہور قرائمیں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"وکان من فقهاء المدینة وقرائهم." (۱)

حضرت سلیمان مدینہ کے فقہاء اور قراء میں سے تھے۔

فقہ:

قرأت کی طرح فقہ میں بھی کمال تھا۔ اس میں ان کو امامت واجتہاد کا مرتبہ حاصل تھا حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں "وکان من ائمة الاجتهاد" وہ اجتہاد کے اماموں میں سے تھے۔ (۲)

سعید بن المسیبؒ عہدِ تابعین کے نامور فقیہ تھے، مگر ان کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو وہ اس کو حضرت سلیمانؒ کے پاس بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے "آج جو علماء باقی رہ گئے ہیں سلیمان بن یسارؒ ان سب میں بڑے عالم ہیں" امام نسائیؒ نے ان کو امام تسلیم کیا ہے۔ محمد بن حنیفہؒ کے صاحبزادے حسن فرماتے تھے "سلیمان ابن یسارؒ ابن میبؒ سے زیادہ سمجھدار (افہم) ہیں ابو الزناد فرماتے تھے "سلیمان ان سات فقہاء میں سے ہیں جو اربابِ فقہ وصلاح اور اصحابِ فضل ہیں (۳) امام مالکؒ نے ان کا مرتبہ حضرت ابن میبؒ کے بعد تسلیم کیا ہے۔

مسائلِ طلاق کے بہترین عالم تھے۔ قتادہ کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ مدینہ گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں مسائلِ طلاق کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے سلیمان بن یسارؒ کا نام بتایا۔ (۴)

حدیث:

حضرت سلیمانؒ جس خانۂ اقدس کی غلامی کا شرف رکھتے تھے وہ حدیث کا سرچشمہ تھا اس لئے قدرتی طور پر وہ اس سے زیادہ سیراب ہوئے۔ چنانچہ علامہ ابن سعدؒ ان کو "کثیر الحدیث" لکھتے ہیں۔ ابوزرعہؒ بھی انہیں "ثقہ" کہتے ہیں ان کے خاص اساتذہ حسب ذیل ہیں:

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۴ص۲۲۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۸۵۔

(۳) تہذیب التہذیب ج۴ص۲۲۹۔ (۴) ابن خلکان ج۱ص۲۱۳۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ وحضرت میمونہؓ، حضرت ام سلمہؓ، فاطمہ بنت قیسؓ، حمزہ بن عمرو الاسلمیؓ، زید بن ثابتؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، جابر مقداد بن اسودؓ، ابورافعؓ، ابوسعیدؓ، ابو ہریرہؓ، ربیع بنت معوذؓ، سلمہ بن صخرؓ، فضل بن عباسؓ۔

تلامذہ:

تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

عمرو بن دینار، عبداللہ بن دینار، عبداللہ بن الفضل، ابوالزناد، سالم ابوالنصر، صالح بن کیسان، عمرو بن میمون، محمد بن ابی حرطہ، زہری، مکحول، نافع مولیٰ ابن عمر، یحیٰ بن سعید انصاری، یعلی بن حکیم، یونس بن سیف وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم۔ (۱)

زہد واتقاء:

ان علمی خوبیوں کے باوجود عمل وروح کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام کے مالک تھے۔ ابوزرعہ کا مقولہ گزر چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ سلیمان بن یسارؒ مدینہ کے فاضل اور زاہد ومتقی تھے۔ عجلی فرماتے تھے۔

"مدنی تابعی ثقة مامون فاضلٌ عابد." (۲)

"وہ مدنی تھے تابعی، معتمد ومعتبر، مامون فاضل، اور عبادت گزار۔"

تمام فضائل اخلاق کا منبع خشیت ربانی ہے یہ اس سے بھرپور تھے مصعب بن عثمانؒ فرماتے ہیں: "سلیمان بہترین خوش رو نوجوان تھے ایک مرتبہ ان کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے اپنی باتوں سے ان کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا، حضرت سلیمانؒ نے اس کی مقاومت کی اور گھر سے نکل کر بھاگ گئے۔ (۳)

حضرت میمونہؓ نے اپنا ولاء حضرت ابن عباسؓ کو مرحمت کر دیا تھا۔

وفات:

زمانۂ وفات کے متعلق بڑا اختلاف ہے۔ غالب یہ ہے کہ ۱۰۷ھ میں وفات پائی جبکہ ان کی عمر تہتر سال کی تھی۔ (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۸، ۲۲۹۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۳۰۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۵۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹۔

حضرت مجاہد بن جبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

مجاہد نام، ابوالحجاج کنیت۔ عبداللہ بن ابی السائب المخزومی کے غلام تھے [۱] حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ [۲]

فضل وکمال:

حضرت مجاہدؒ غلام تھے مگر علم وفضل کے مہر درخشاں تھے امام نووی لکھتے ہیں: ''دو تابعی امام ہیں اور ان کی جلالت وامامت پر سب کا اتفاق ہے [۳] حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ''وکان احدا وعیۃ العلم'' وہ علم کا ایک ظرف تھے۔ [۴] علامہ ابن سعد لکھتے ہیں: ''کان فقیھا عالما ثقۃ کثیر الحدیث'' وہ فقیہ عالم، معتبر اور کثیر الحدیث تھے [۵] تفسیر، حدیث اور فقہ ان سب میں کمال حاصل تھا۔

تفسیر:

انہوں نے حبرِ امت، ترجمان القرآن، حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر پڑھی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں ''میں نے ابن عباسؓ سے تیس مرتبہ قرآن پڑھا۔ ایک ایک آیت پر میں رکتا تھا اور اس کے شانِ نزول اور دوسرے امور سے متعلق سوال کرتا جاتا تھا'' تعلیم کا شوق اتنا تھا کہ حضرت ابن عمرؓ کی رکاب پکڑ کر ہی کھڑے ہو جاتے، اور سوالات کرنے لگتے تھے [۶]۔ حضرت ابن عباسؓ و ابن عمرؓ کی توجہ خاص نے انہیں اپنے عہد کا بڑا مفسر بنا دیا۔ مصعب فرماتے ہیں:

> ''کان اعلمھم بالتفسیر مجاھدٌ وبالحج عطاء.''
>
> ''تابعین میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد اور مسائل حج کے بڑے عالم عطاء تھے۔''

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۳۔

(۴) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۶۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۔

قتادہ نے کہا ''جو علماء باقی رہ گئے ہیں ان میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد ہیں (۱) خصیف نے بھی ان کو اعلمہم بالتفسیر تسلیم کیا ہے۔ حافظ ذہبی ان کو ''امام مفسر لکھتے ہیں (۲) معلوم ہوتا ہے کہ امم سابقہ اور تاریخ قدیم سے متعلق اہل کتاب سے بھی سوالات کرتے رہتے تھے، چنانچہ اعمش سے کسی نے پوچھا کہ لوگ تفسیرِ مجاہد کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟'' فرمایا ''ان کا خیال ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھتے تھے۔ (۳)

قرأت:

تفسیر کے ساتھ فنِ قرأت کے بھی عالم تھے۔ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر ان کو ''مقری'' لکھتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت سے واقف نہیں تھے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ ''اگر میں نے ابن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھا ہوتا تو مجھ کو بہت سے مواقع پر حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ (۴)

حدیث:

حدیث میں ان کو حفاظ کا مرتبہ حاصل تھا۔ امام ذہبیؒ ان کو ''حافظ حدیث'' اور امام نوویؒ ''امام حدیث'' لکھتے ہیں: ابن سعدؒ نے انہیں ''کثیر الحدیث'' لکھا ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان کے حفظ کے اس درجہ معترف تھے کہ فرماتے تھے ''کاش نافع (مولیٰ ابن عمرؓ) کا حفظ بھی تمہاری طرح ہوتا۔'' (۵)

مجاہد حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔ اکابر صحابہ اس وقت موجود تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضراتِ ذیل سے حدیث حاصل کی۔ حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ابوسعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، سعید ابن ابی وقاصؓ، رافع بن خدیجؓ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، جویریہ بنت الحارث ام ہانیؓ۔ تابعین میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ، طاؤسؒ، عبداللہ بن السائبؒ، عبداللہ بن سنجرہؒ، عبدالرحمٰن بن صفوانؒ، عمر بن اسودؒ، مورق العجلیؒ وغیرہم سے تلمذ رکھتے تھے۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳۔

(۴) ایضاً۔ (۵) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵۔

تلامذہ:

ان کے خوشہ چینانِ علم کا دائرہ وسیع تھا۔ جن میں لائق ذکر حسبِ ذیل حضرات ہیں:
ایوب سختیانی، عطاء، عکرمہ، ابن عون، عمرو بن دینار، ابو الحق سبیعی، ابوالزبیر، مکی، یونس بن ابی اسحاق، قتادہ، عبیداللہ بن ابی یزید، ابان بن صالح، سلیمان الاعمش، سلیمان الاحول، مسلم البطین، طلحہ بن مصرف، عبداللہ بن کثیر القاری۔ (۱)

فقہ:

قرآن و حدیث میں بصیرت رکھنے کے باعث فقہ میں بھی امتیاز خاص رکھتے تھے چنانچہ ابن حبان فرماتے ہیں:

"کان فقیھا ورعا عابدا متقنا."

"مجاہد فقیہ، پرہیز گار، عبادت گزار، اور پختہ علم والے تھے۔"

امام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ، علامہ ذہبیؒ، تینوں ان کے تفقہ پر متفق ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے مکہ کے مفتیانِ کرام کے جہاں نام گنائے ہیں وہاں مجاہد بن جبیرؒ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۲)

زہد و ورع:

ان علمی کمالات کے ساتھ عملی فضائل و اخلاق کے بھی جامع تھے۔ ابن حبان کا قول اوپر گزر چکا ہے، جس میں وہ مجاہد کو ورع عابد کہتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں خلوص ہوتا تھا، سلمہ بن کہیل کہتے ہیں "میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے علم خالصاً لوجہ اللہ حاصل کیا ہو۔ مگر عطاء طاؤس اور مجاہد کو۔ (۳)

دنیا سے بے تعلقی:

جس کو علم کی حقیقی لذت اور عبادت الٰہی کا ذوق لطف میسر آجائے دنیا سے اسے کیا دلچسپی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہدؒ بھی بسا اوقات دنیوی علائق سے الگ تھلگ رہنے کے باعث غمگین نظر آتے تھے۔ اعمش کا بیان ہے "ان سے کسی نے غمگین رہنے کا سبب دریافت کیا" تو فرمایا:

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۔ (۲) اعلام الموقعین جز اول مطبع منیری ص ۱۹۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳۔

''ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ تھام کر فرمایا ''تم دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا راستہ عبور کرنے والا رہتا ہے۔ (۱)

فصاحت وبلاغت:

کلام، نہایت فصیح وبلیغ اور شیریں ہوتا تھا۔ اعمش فرماتے ہیں کہ جب مجاہدؒ بولتے تھے تو ان کے منہ سے موتی برستے تھے۔ (۲)

وضع میں سادگی:

ظاہری زیبائش اور آرائش سے نفور تھے۔ اعمشؒ فرماتے ہیں: میں مجاہد کو دیکھتا تھا، تو (ان کی ظاہری حالت کے باعث) انہیں حقیر سمجھتا تھا، وہ اپنی ظاہری وضع سے ایک مالکِ خر معلوم ہوتے تھے جس کا گدھا گم ہو گیا ہو، اور وہ اس کی وجہ سے غمگین بیٹھا ہو۔ (۳)

عجائب عالم کا شوق:

عجائبات عالم کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ جس کسی عجیب چیز کا ذکر سنتے تھے اس کو دیکھنے جاتے تھے چنانچہ علامہ ذہبیؒ نے ان کے چاہِ بابل پر جانے اور وہاں ہاروت وماروت کو دیکھنے کا ذکر کیا ہے، ہمارے خیال میں اس روایت میں رنگینی عنوان کا بھی دخل ہے۔ (۴)

وفات:

سنہِ وفات میں روایات مختلف ہیں۔ ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ میں ٹھیک اس وقت جبکہ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز تھے، جاں جانِ آفریں کے سپرد کردی، وفات کے وقت عمر تراسی سال کی تھی۔ (۵)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۵۲۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۵۲۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷۔

(۴) ایضاً ص ۸۶ و ۸۷۔ (۵) ایضاً۔

عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عطا نام والد کا نام اسلم تھا اور ابو رباح کنیت ۔خود حضرت عطاء کی کنیت ابو محمد تھی ۔یمن کے ایک مقام جند میں ۲۷ھ میں پیدا ہوئے ۔حضرت عثمان کی خلافت کا عہد تھا، ابتدائی تربیت مکہ معظّمہ میں ہوئی ۔آل میسرہ بن ابی خثیم فہری کے غلام تھے ۔

فضل وکمال:

فضل وکمال اور زہد واتقاء کے لحاظ سے بڑے بلند مرتبت تابعی تھے ۔ابن سعد فرماتے ہیں:

"کان ثقة فقيها عالما كثير الحديث."[۱]

''وہ بڑے معتبر فقیہہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے ۔''

حافظ ابن حجر انہیں یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"وكان من سادات التابعين فقها وعلما وورعا وفضلا."[۲]

''عطاء فقہ، علم، ورع اور فضل کی وجہ سے سادات تابعین میں سے تھے ۔''

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں ''وہ مکہ کے مفتی اور مشہور امام تھے، بڑے بڑے ائمہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے ۔[۳] امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے ''علم کا خزانہ خدا اسی کو دیتا ہے جسے محبوب رکھتا ہے، اگر علم کسی کے ساتھ مخصوص ہوتا تو عالی نسب اس کے زیادہ حقدار تھے ۔مگر عطاء حبشی غلام تھے یزید بن حبیب نوبی، حسن بصری اور ابن سیرین غلام تھے ۔[۴]

قرآن:

حضرت عطاءؒ ایک حبشی اور بدشکل غلام تھے، لیکن وہ جن بزرگوں کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے انہوں نے ان کو قرآن کی تفسیر، حدیث اور فقہ، غرض کہ تمام متداولہ اسلامی علوم

---

(۱) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ ۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۳ ۔

(۳) تہذیب الاسماء نووی ج ۱ ص ۳۳۳ ۔ (۴) مختصر صفوۃ الصفوۃ ص ۱۵۸ ۔

میں ماہر بنا دیا تھا، مگر قرآن کے ساتھ شغف زیادہ تھا۔ اس کا مستقل درس دیتے تھے۔ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں انہ کان یعلم الکتاب (۱)

حدیث:

قرآن کی طرح حدیث کے بھی امام تھے، انہوں نے عبادلۂ اربعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے او دوسرے جلیل القدر صحابۂ کرام، حضرت معاویہؓ، اسامہ بن زیدؓ، جابر بن عبداللہؓ، زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن السائب، مخزومی، عقیل بن ابی طالبؓ، عمرو بن ابی سلمہؓ، رافع بن خدیجؓ، ابودرداءؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ، اور ام ہانیؓ اور ام سلمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سماع حدیث کی تھی۔ (۲)

تلامذہ:

ان کے دامانِ تربیت سے جو حضرات فیضیاب ہو کر نکلے ان کی فہرست بڑی طویل ہے ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔ ابواسحٰق السبیعی، مجاہد، زہری، اعمش، اوزاعی، ابن جریج، عمرو بن دینار، ابن اسحاق، یزید بن ابی حبیب، سلمہ بن کہیل، امام ابوحنیفہ، عبدالملک بن ابی سلیمان، قتادہ۔ (۳)

احترامِ حدیث:

سماع و درس کے وقت حدیث کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ حدیث کی روایت کے درمیان میں اگر کوئی بولتا تھا تو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ معاذ بن سعید الاعور کہتے ہیں: ایک مرتبہ ہم حضرت عطاءؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ ایک شخص نے کوئی حدیث بیان کرنی شروع کی درمیان میں ایک شخص نے اس کو ٹوک دیا۔ عطاء کو یہ دیکھ کر غصہ آیا، فرمایا ''یہ کیا اخلاق ہیں یہ کیسی طبیعتیں ہیں، بخدا بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو اگرچہ میں اس کا اس سے زیادہ عالم ہوتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے وہ حدیث خود مجھ ہی سے سنی ہو، تاہم میں اس کو بڑی خاموشی سے سنتا ہوں اور اس پر یہ ظاہر کرتا ہوں

---

(۱) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۹۹۔ (۳) ایضاً۔

کہ گویا میں نے وہ حدیث اس سے قبل کسی سے سنی ہی نہیں۔'' عمرو بن العاصم کہتے ہیں۔ میں نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے بیان کی تو فرمایا ''بخدا میں اپنا جوتہ نہیں اتاروں گا جب تک کہ اس کو خود مہدی سے نہیں سن لوں گا۔''(۱)

فن حدیث میں ان کا مرتبہ:

امام نوویؒ فرماتے ہیں ''لوگ ان کی توثیق، جلالت اور امامت پر متفق ہیں امام محمد الباقر فرماتے تھے ''جہاں تک ہو سکے عطا کی حدیثیں لو(۲)'' حافظ ذہبی ان کو مفتی اہل مکۃ ومحدثہم اور ابن سعد انہیں ''کثیر الحدیث'' لکھتے ہیں۔

فقہ:

قرآن وحدیث کی مہارت نے ان کو فقہ کا بھی امام بنا دیا تھا۔ ان کے عہد کے بڑے بڑے ائمہ فقہ ان کی فقاہت پر متفق ہیں۔ عمرو بن سعید کی والدہ محترمہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ میں تشریف لاتے تو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر متفرق مسائل دریافت کرتے تھے۔ آپ فرماتے ''تم میرے لئے مسائل جمع کر رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس ابن ابی رباح موجود ہیں۔(۳) ربیعہ خود بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، مگر وہ بھی فرماتے تھے ''عطاء فتویٰ میں تمام اہل مکہ سے سبقت لے گئے ہیں''(۴) ابراہیم بن کیسان کا بیان ہے کہ خلفاء بنو امیہ قافلہ ہائے حج میں اعلان کرا دیتے تھے کہ عطا کے سوا کوئی دوسرا شخص فتویٰ نہ دے۔(۵)

حضرت ابن عمرؓ کی طرح حضرت ابن عباسؓ بھی فرمایا کرتے تھے:

''**یا اهل مکة تجتمعون علی وعندکم عطاءٌ.**''

''اے اہل مکہ! تم میرے پاس جمع ہو جاتے ہو، حالانکہ تمہارے پاس عطاء ہیں۔''

امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے ''میں نے عطاء سے افضل کسی کو نہیں پایا۔''(۶) محمد بن عبداللہ الدیناج کہتے تھے ''میں نے عطاء سے بہتر کوئی مفتی نہیں دیکھا۔ ان کی مجلس ذکر الٰہی کی مجلس ہوتی تھی، ان سے جو بات پوچھی جاتی اس کا جواب بہت عمدہ طریقہ پر دیتے تھے۔''(۷)

---

(۱) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۳۴۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۴۔

(۴) ایضاً۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً۔

اپنے عہد میں فتوے کے مرکز تھے۔ علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں ''کہ اہل مکہ کے مفتی صرف دو بزرگ تھے ایک مجاہد اور دوسرے عطاء مگر عطا مجاہد پر بھی سبقت لے گئے تھے۔ (۱)

مناسکِ حج کا علم:

یوں تو فقہ کی تمام جزئیات پر مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے۔ مگر خصوصیت سے مسائل حج کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلم المنقری کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ابوجعفر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ناگاہ عطاء بن ابی رباحؒ گزرتے ہوئے نظر آئے۔ اس پر ابوجعفر بولے 'اب روئے زمین پر کوئی شخص عطاءؒ سے زیادہ مناسکِ حج کا علم رکھنے والا نہیں ہے'' (۲) قتادہ فرماتے تھے ''عطاء ان بزرگوں میں سے ہیں جو مناسکِ حج کے بڑے عالم تھے'' (۳) خلفاءِ عہد مناسکِ حج کی تعلیم کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک خدمت اقدس میں خود حاضر ہوا اور آپ نے اس کو مناسکِ حج کی تعلیم دی۔ (۴)

حضرت عطاءؒ کے فیض صحبت سے معمولی حیثیت کے انسان مسائلِ حج کے خاصے عالم ہو جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ابن خلکان نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے وہ یہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں ''ایک مرتبہ حج کے ارکان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سر کا حلق کرانا چاہا، ایک حجام مل گیا، میں نے پوچھا، کیا لوگے؟ بولا ''عبادات میں شرط نہیں ہوتی، تم بیٹھ کر خط بنوالو۔'' میں ذرا قبلہ سے مڑ کر بیٹھ گیا، حجام نے یہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ رو بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر میں نے چاہا کہ حجام سر کے بائیں جانب سے آغاز کرے تو اس پر اس نے کہا، ''اپنی دائیں جانب ادھر کردو'' وہ برابر سر کا حلق کرتا رہا اور میں خاموش تھا۔ وہ بولا ''تکبیر کہو'' چنانچہ میں نے تکبیر کہی، حلق رأس سے فراغت کے بعد میں نے چاہا کہ اپنے کجاوہ کی طرف چلا جاؤں، اس نے پوچھا ''کہاں جاتے ہو''؟ میں نے کہا ''جائے قیام پر'' کہنے لگا ''دو رکعتیں تو پڑھ لو پھر چلے جانا'' امام اعظمؒ فرماتے ہیں اس شخص کی یہ باتیں سن کر میں نے خیال کیا کہ یہ سب معلومات ضرور اس کو کسی سے حاصل ہوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا ''میں نے عطاء بن ابی رباح کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔'' (۵)

---

(۱) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۷۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴۔ (۳) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵۔

(۴) مختصر صفوۃ الصفوۃ ص ۱۹۵۔ (۵) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۹۔

بیوع کا علم:

مناسک حج کے علاوہ کتب البیوع کے بھی علامہ متبحر تھے، خود ان کے صاحبزادہ یعقوب ابن عطاء فرماتے ہیں "میرے باپ کو خرید وفروخت کے مسائل سب مسائل سے زیادہ محفوظ تھے۔"(۱)

افتاء میں احتیاط:

مگر اس کمال تفقہ کے باوجود جو بات ان کو معلوم نہیں ہوتی تھی اس میں اپنی رائے کو دخل نہیں دیتے تھے۔ عبدالعزیز بن رفیع کا بیان ہے "ایک مرتبہ عطاء سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "میں نہیں جانتا" لوگوں نے کہا "تو پھر کیا آپ اپنی رائے نہیں بتائیں گے؟" فرمایا مجھ کو اللہ سے اس بات میں شرم آتی ہے کہ زمین میں میری رائے کی اطاعت کی جائے۔"(۲) تاہم جب کبھی وہ رائے سے کام لیتے تھے، اس کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ ابن جریج کہتے ہیں "عطاء کوئی بات بیان کرتے تو میں پوچھتا" یہ علم ہے یا رائے ہے؟" اگر وہ کسی صحابی کا اثر ہوتا تو فرماتے "علم" ورنہ رائے ہوتی تو صاف کہہ دیتے "یہ رائے ہے۔"(۳)

خلوص وللہیت:

علم کے لئے وجاہت طلبی یا کسی اور دنیوی غرض سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہوتا۔ حضرت عطاءؒ انتہا درجہ بے لوث تھے۔ سلمہ کہتے ہیں "میں نے صرف تین بزرگ دیکھے ہیں جنہوں نے علم خالصتاً لوجہ اللہ حاصل کیا ہے۔ طاؤس، مجاہد اور عطاء۔(۴)

فراست:

ان میں فراست وذکاوت بھی غیر معمولی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ نے اپنی مجلس میں فرمایا "منافق کی تین خاص علامتیں ہیں۔ کوئی بات کہے تو جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، اور وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے۔" جناب عطاءؒ نے یہ سنا تو فرمایا "یہ تینوں عادتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں موجود تھیں۔ انہوں نے بات جھوٹ کہی

---

(۱) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۲۔ (۳) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۱۔

امانت میں خیانت کی، اور وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کی لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کی نسل میں نبی پیدا کیا۔'' جس نے یہ سن کر فرمایا: ''**وفوق کل ذی علم علیم**'' ہر صاحب علم کے اوپر ایک علم والا ہے۔ (۱)

فصاحت وبلاغت اور پرگوئی:

حضرت عطاؒ زیادہ تر خاموش رہتے تھے اور اگر بولتے بھی تھے تو ذکر اللہ کے سوا کوئی اور چیز مذکور نہیں ہوتی تھی اور اس انداز میں اس کو بیان کرتے تھے کہ خدا کی طرف سے تائید معلوم ہوتی تھی۔ اسماعیل بن امیہ شہادت دیتے ہیں۔'' **كان عطاء يطيل الصمت فاذا تكلم يخيل الينا انه يؤيد.** '' (۲) کوئی شخص کوئی سوال کرتا تو جواب بڑی پرگوئی سے دیتے تھے۔ (۳) حافظ ذہبی ان کو ''فصیح کثیر العلم'' لکھتے ہیں۔ (۴)

ہردلعزیزی:

ان اوصاف وکمالات نے ان کو لوگوں میں سب سے زیادہ ہردلعزیز بنادیا تھا، امام اوزاعی کا بیان ہے ''جس دن عطاء کا انتقال ہوا وہ روئے زمین پر سب لوگوں سے زیادہ پسندیدہ تھے۔ (۵)

سعید بن ابی عروبہ کہتے تھے ''کسی مسئلہ پر اگر حسنؒ، سعید بن المسیبؒ، ابراہیمؒ اور عطاءؒ جو انصار کے ائمہ ہیں جمع ہو جائیں تو پھر مجھ کو کسی مخالف کا ڈر نہیں ہے۔ (۶)

زہد وورع:

علم وفضل کے بحر بے کراں ہونے کے ساتھ ان میں زہد وورع بھی اسی درجہ کا تھا۔ حافظ ذہبی کا ارشاد ہے ''عطاء کے زہد، خداپرستی اور علم کے مناقب بہت ہیں۔ (۷)

حافظ ابن حجر کا مقولہ پہلے گزر چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: عطاء علم اور ورع کے لحاظ سے سادات تابعین میں شمار کئے جاتے تھے۔'' والدین کے انتقال کے بعد اپنی وفات تک

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۱۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔

(۴) ایضاً۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۱۔ (۶) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۳۔

(۷) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳۔

برابر ان کی طرف سے مساکین کو کھانا کھلاتے رہے۔ ابو نعیم کہتے ہیں یہ ان کی طرف سے صدقۃ الفطر تھا۔ (۱)

قوتِ ایمانی:

تمام نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کی اصل ایمان ہے یہ اگر نہ ہو تو عنداللہ کسی عمل کا اعتبار نہیں۔ حضرت عطاءؒ اس میں بھی نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ عبدالرحمٰن فرماتے ہیں "اللہ کی قسم میں تمام روئے زمین کے لوگوں کا ایمان حضرت ابو بکرؓ کے ایمان کے اور تمام اہل مکہ کا ایمان حضرت عطاءؒ کے امان کے برابر نہیں دیکھتا۔ (۲)

عبادت:

عبادت کا عالم یہ تھا کہ بیس برس تک مسجد کا فرش ان کا بستر رہا۔ (۳) تہجد میں روزانہ دو سو یا اس سے زائد آیات پڑھتے تھے۔ ابو معاویۃ المغربی کہتے تھے "میں نے سجدہ کے نشان حضرت عطاءؒ کی دونوں آنکھوں کے درمیان دیکھے ہیں۔ (۴) گویا وہ اس طرح ان بزرگوں کی صف میں داخل تھے۔ جن کے متعلق قرآن مجید نے **"سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود"** کی شہادت دی ہے، ان کا کوئی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتا تھا محمد بن عبداللہ الدیباج کا بیان ہے۔

"انما کان مجلسہ ذکر اللہ لا یفتر." (۵)

ان کی مجلس اللہ کا ذکر ہوتا تھا جس میں وہ کبھی تساہل نہیں کرتے تھے۔

نماز نہایت خشوع وخضوع سے ادا کرتے تھے۔ **و کان من احسن الناس صلاۃ.** (۶)

حج:

مستقل قیام گاہ مکہ معظمہ ہی تھا تقریباً ہر سال حج کرتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں انہوں نے ستر حج کئے تھے۔ (۷)

---

(۱) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶۔ (۲) ایضاً ص ۳۴۵ و ۳۴۶۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۲۔

(۴) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔

(۶) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۲۔ (۷) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹۔

اتباعِ حدیث

اتباع حدیث کا بڑا اہتمام کرتے تھے، امام شافعیؒ ان کو اس طرح داد دیتے ہیں:

"ولیس فی التابعین احدٌ اکثر اتباعًا للحدیث من عطاءٍ." (۱)

"تابعین میں عطاء سے زیادہ کوئی اتباع حدیث کرنے والا نہیں تھا۔"

خلوت گزینی:

تنہائی کو پسند کرتے تھے، بسا اوقات خاموش رہتے تھے کوئی کچھ پوچھتا تو اس کو تشفی بخش جواب دیتے تھے۔

جلالت شان:

ان کے علمی وقار کے سامنے بڑے بڑے لوگ سر تسلیم و اطاعت خم کرتے تھے اور خلفاءؒ کی مجلسوں میں ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا جاتا تھا۔ قتادہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھ سے سلیمان بن ہشام نے پوچھا کیا اب مکہ میں کوئی بڑا فاضل ہے؟ میں نے جواب دیا "ہاں! بڑا فاضل کیا! تمام جزیرۃ العرب میں علم کے لحاظ سے کوئی اس کے برابر نہیں ہے۔ اور وہ عطاء ابن ابی رباح ہیں۔ (۲)

متفردات:

جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مسائل کے متعلق ان کے غرائب مشہور ہیں، مثلاً وہ فرماتے تھے کہ کوئی شخص سفر کی نیت سے چلے تو اس کے لئے شہر سے باہر نکلنے سے قبل ہی نماز کا قصر جائز ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ ابن منذر وغیرہ کی روایت کے مطابق ان کی رائے تھی کے اگر عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں واقع ہو جائیں تو صرف عید کی نماز پڑھی جائے۔ جمعہ یا ظہر کی نہیں۔ (۳)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۱۔

(۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۴۔

حلیہ:

یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس طرح معنوی و باطنی محاسن وفضائل سے نوازا تھا صورت وشکل کے اعتبار سے وہ ایسے نہیں تھے، رنگ کوے کی طرح سیاہ تھا ناک چپٹی تھی آنکھوں میں کانا پن تھا، جسم پر رعشہ کی کیفیت طاری رہتی تھی، پاؤں میں ننگ تھا، آخر میں نابینا بھی ہوگئے تھے، بال نہ بالکل گھونگریالے تھے اور نہ بالکل صاف سپاٹ بلکہ درمیانی درجہ کے۔ (۱)
سبحان اللہ! خاک کے پردہ میں ہیرے کی کنی ہوتی ہے۔

وفات:

مکہ معظمہ میں بعمر اٹھاسی برس ۱۱۵ھ میں وفات پائی۔ میمونؒ کو اس کی اطلاع ہوئی فرمایا ''افسوس! عطاء اپنے بعد کوئی اپنا مثل چھوڑ کر نہیں گئے۔ (۲)

طاؤس بن کیسانؒ

نام ونسب:

طاؤس نام، ابوعبدالرحمن کنیت، بحیر بن ریسان حمیری کے غلام تھے ان کے والد اہل فارس میں سے تھے آل حمدان سے موالات کر کے یمن کے مشہور مردم خیز شہر جند میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ (۳)

علم وفضل:

علم وفضل کے اعتبار سے طاؤس کبار تابعین میں سے تھے، علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

"وھو من کبار التابعین والعلماء والفضلاء الصالحین." (۴)

''وہ کبار تابعین علماء اور فضلاء صالحین میں سے تھے۔''

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں ''ان کی جلالت وفضیلت، اور وفورِ علم پر سب کا اتفاق ہے۔ (۵)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۰۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶۔ (۳) ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲۔

(۴) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۵۱۔ (۵) ایضاً۔

عمرو بن دینارؒ فرماتے تھے"میں نے طاؤس جیسا کوئی نہیں دیکھا۔" ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں"وہ امام اور تابعین میں سب سے زیادہ حلال وحرام کو جاننے والے تھے۔"(۱)

حدیث:

حدیث کے جلیل القدر حافظ تھے عبدالملک بن میسرہ نے خود ان سے نقل کیا ہے کہ میں نے پچاس صحابہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے جن صحابہ کے سرچشمۂ فیض وکرم سے سیراب ہوئے ان کے اسماءِ گرامی حسبِ ذیل ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، ام المومنین حضرت عائشہ، سراقہ ابن مالک، صفوان ابن امیہ، جابر رضی اللہ عنہم۔(۲)

حبرِ امت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلمیذ خاص تھے۔ ابن عیینہؒ فرماتے ہیں۔ میں نے عبداللہ بن یزید سے پوچھا"تم کس کے ساتھ ابن عباسؓ کے پاس جاتے تھے؟" فرمایا"عطاء اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ" میں نے کہا"اور طاؤس؟" بولے"وہ! طاؤس تو ان کے پاس خواص کے ساتھ جاتے تھے۔"(۳)

تلامذہ:

تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، ان میں جو زیادہ مشہور ہیں وہ یہ ہیں:

خود ان کے صاحبزادہ عبداللہ، وہب بن منبہ، سلیمان التیمی، سلیمان الاحول، ابوالزبیر، امام زہری، ابراہیم بن میسرہ، حبیب بن ابی ثابت، حکم بن عتبہ، حسن بن مسلم، سلیمان بن موسیٰ الدمشقی، عبدالملک بن میسرہ، عمرو بن دینار، مجاہد بن جبیر، لیث بن ابی سلیم، عمرو بن مسلم الجندی، قیس بن سعد المکی رحمۃ اللہ علیہم۔(۴)

حدیث میں احتیاط:

حدیث روایت کرتے تھے تو بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک حرف کو صاف طریقہ سے ادا کرتے تھے۔ لیث بن ابی سلیم کہتے ہیں:

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۲۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔

(۳) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۳۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔

"کان طاؤس یَعُدُّ الحدیث حرفاً حرفاً."

"طاؤس حدیث کا ایک ایک حرف شمار کرتے تھے۔"

یحیٰی بن معینؒ اور ابوزرعہؒ دونوں ان کو "ثقہ" قرار دیتے ہیں۔ (۱)

فقہ:

حدیث کی طرح فقہ میں بھی بڑا پایہ رکھتے تھے۔ ابن خلکان ان کو فقیہ جلیل القدر ممنبہ الذکر بتاتے ہیں۔ (۲) حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

"کان طاؤس شیخ اھل الیمن وبرکتھم ومفتیھم له جلالةٌ عظیمةٌ." (۳)

"طاؤس اہل یمن کے شیخ، ان کے لئے برکت اور ان کے مفتی تھے، ان کی جلالتِ شان بہت بڑی ہے۔"

قیس بن سعد کہتے تھے "طاؤس کی وقعت ہمارے ہاں وہی ہے جو ابن سیرینؒ کی اہل بصرہ میں ہے۔" (۴) ابن عماد الحنبلی کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ طاؤس حلال وحرام کے مسائل تابعین میں سب سے زیادہ جانتے تھے۔

ابن معینؒ سے کسی نے پوچھا "آپ کو طاؤس زیادہ پسند ہیں یا سعید بن جبیرؒ فرمایا: "میں ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا۔"

فتویٰ میں احتیاط:

باینھمہ علم وفضل فتویٰ دینے میں بہت محتاط تھے۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا فرمایا "اگر میں کہوں تو ڈرتا ہوں، اور خاموش رہوں تو اس سے بھی خوف کرتا ہوں، اور کلام وسکوت کی درمیانی راہ اختیار کروں تو اس سے بھی ڈرتا ہوں۔

جلالتِ شان:

بے حد عابد وزاہد تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ "وہ یمن کے عبادت گزار لوگوں میں شمار

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۵ ص۹۔ (۲) ابن خلکان ج۱ ص۲۳۳۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۵۴۔ (۴) تہذیب التہذیب ج۵ ص۹۔

ہوتے تھے۔''[1] سجدہ کا نشان ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان صاف نظر آتا تھا بسترِ مرگ پر بھی کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے۔[2] چالیس حج کئے تھے۔[3] طواف میں کلام نہ کرتے تھے، فرماتے تھے **فانما الطواف صلوۃ** (طواف نماز ہے)[4] ان اعمال صالحہ کا ہی طفیل تھا کہ مستجاب الدعوات تھے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ''میں گمان کرتا ہوں کہ طاؤس جنتی آدمی ہیں۔''[5]

شوقِ ثواب:

ہر کام میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے صاحبزادہ عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے والد طاؤس کے ہمراہ حج کرنے آتے تھے۔ یمن سے مکہ تک کا راستہ ایک ماہ میں طے ہوتا تھا۔ مگر میرے والد واپسی میں قصداً دور دراز کے راستوں سے گزرتے تھے اور گھر دو ماہ میں پہنچتے تھے۔ ہم ان سے اس کی وجہ دریافت کرتے تو فرماتے ''مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آدمی جب تک اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا وہ سفر میں ہی رہتا ہے۔''[6]

دنیا سے استغناء:

حضرت عطاءؒ کے احوال میں سلمہ بن کہیل کا مقولہ گزر چکا ہے کہ ''میں صرف تین بزرگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے علم خالصتاً لوجہ اللہ حاصل کیا تھا ان تین میں ایک حضرت طاؤس بھی ہیں۔'' چنانچہ آپ دنیا اور اہل دنیا سے مکمل استغناء رکھتے تھے اور ہمیشہ ایمان و اعمال صالحہ کی دعا کرتے رہتے تھے۔ محمد بن سعید کا بیان ہے ''طاؤس کی عام دعا یہ تھی ''اے اللہ تو مجھ کو مال اور اولاد سے محروم کر دے اور ایمان و عمل سے بہرہ اندوز فرما۔[7]

ارباب ثروت و حکومت سے بے نیازی:

جس کی آنکھوں میں کوکبۂ جلالِ خداوندی سمایا ہوا ہو اور جو خود اقلیم علم و عمل کا تاجدار ہو وہ کسی بادشاہ یا حاکم کو کب نظر میں لا سکتا ہے۔ حضرت طاؤسؒ کا بھی یہی حال تھا ابن عیینہؒ کا بیان ہے ''حکومت سے بچنے والے صرف تین بزرگ تھے۔ ابوذر غفاریؓ اپنے عہد میں، طاؤس اپنے

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔ (۴) ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔ (۶) ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵۔ (۷) ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳۔

عہد میں، اور ثوری اپنے زمانہ میں''(۱) عمرو بن دینارؒ فرماتے ہیں ''لوگوں کے قبضہ میں جو کچھ ہوتا ہے، میں نے حضرت طاؤس سے زیادہ اس سے بچنے والا اور پاکدامن کوئی نہیں دیکھا(۲) خود ان کا مقولہ تھا ''میں نے ارباب شرف و دول سے زیادہ کسی کو شر انگیز نہیں دیکھا۔''(۳)

ایک مرتبہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے پاس گئے جو اس وقت گورنر تھا، وقت صبح کا تھا اور ٹھنڈا، طاؤس جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ محمد بن یوسف نے اپنے ملازم سے کہا کہ ایک طیلسان لا کر طاؤس کو اُڑھا دو'' اس نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔ حضرت طاؤسؒ برابر اپنے کاندھوں کو حرکت دیتے رہے، یہاں تک کہ وہ طیلسان گر پڑا۔ محمد بن یوسف یہ دیکھ کر غضبناک ہو گیا۔ وہب بن منبہ نے طاؤس پر اظہار ناراضگی کیا اور فرمایا ''اگر اس طیلسان سے آپ کو ایسا ہی استغناء تھا تو محمد بن یوسف کو ناراض کرنے کی کیا ضرورت تھی آپ اسے لے لیتے اور پھر اس کو فروخت کر کے قیمت مساکین کو دے دیتے'' طاؤس بولے ''اگر مجھ کو اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میرے بعد یہ کہتے کہ طاؤس نے طیلسان قبول کر لیا تو میں قبول کر لیتا۔''(۴)

اربابِ دولت و ثروت کے ادنیٰ سے ادنیٰ احسان کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ نعمان بن زبیر الصنعانی فرماتے ہیں 'ایک مرتبہ یمن کے حاکم نے طاؤس کے پاس پانچ سو دینار بطور ہدیہ بھیجے، مگر انہوں نے ان کو قبول نہیں کیا اور وہ واپس کر دیئے گئے۔(۵)

اس حد درجہ استغناء کی وجہ سے ان کی نگاہ میں امیر و غریب سب یکساں تھے ابراہیم بن میسرہ کا بیان ہے ''میں نے طاؤس کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی نگاہ میں شریف و غیر شریف دونوں برابر ہوں۔''(۶)

تحصیلداری کا عہدہ:

محمد بن یوسف نے کچھ دنوں کے لئے انہیں تحصیلدار بھی بنا دیا تھا، مگر انہوں نے کس شان سے تحصیل داری کی، اس کی روئیداد سنئے۔ ابراہیم فرماتے ہیں۔ میں نے طاؤس سے دریافت کیا ''آپ کس طرح تحصیلداری کرتے تھے؟'' فرمایا: میں باقیدار کے پاس جا کر کہتا تھا ''خدا تم پر رحم کرے، اس نے تم کو جو عطا کیا ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرو'' اس کہنے پر اگر وہ زکوٰۃ دے دیتا تو ہم لے لیتے، ورنہ ہم اس سے کچھ نہ کہتے تھے۔(۷)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۵ ص۱۰۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ابن سعد ج۵ ص۳۹۳۔ (۴) ابن سعد ج۵ ص۳۹۴

(۵) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۸۴۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ابن سعد ج۵ ص۳۹۴۔

خلفاء کو نصیحت:

بے لوث و بے غرض ہونے کی وجہ سے خلفاء کو برملا نصیحت کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو لکھ کر بھیجا ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے سب کام اچھے ہوں تو اچھے لوگوں کو عہدہ دار بنائیے،'' آپ نے یہ سن کر فرمایا ''میری بھلائی کے لئے یہ نصیحت بہت کافی ہے۔''(۱)

انہی کے فیض صحبت و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان میں جو جرأتِ حق گوئی پائی جاتی تھی اس کا اثر اولاد میں بھی موجود تھا۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''ایک مرتبہ خلیفۂ وقت ابوجعفر منصور نے حضرت طاؤسؒ کے صاحبزادہ عبداللہؒ اور امام مالک بن انسؒ دونوں کو بلایا۔ یہ تشریف لے گئے تو تھوڑی دیر تک ابوجعفر منصور سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اٹھا کر اس نے ابن طاؤس سے کہا ''آپ اپنے والد ماجد کی کوئی روایت سنائیے۔'' بولے ''مجھ سے میرے باپ نے حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی سلطنت میں شریک کیا (بادشاہ بنایا اور اس کے باوجود اس نے ظلم کو اپنے حکم میں جائز رکھا'' منصور یہ سن کر منقبض ہوگیا مالک بن انس کو اندیشہ ہوا کہ عبداللہ بن طاؤس قتل کردیے جائیں گے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد منصور نے ابن طاؤس سے کہا کہ ذرا یہ دوات مجھ کو دینا، منصور نے تین مرتبہ دوات مانگی، مگر ابن طاؤس نے نہیں دی۔ منصور نے دوات نہ دینے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا ''مجھ کو ڈر ہے کہ تم اس سے کوئی معصیت کی بات نہ لکھ دو کہ اس کی پاداش میں **اعانت علی الاثم** کا مرتکب ہو کر میں بھی پکڑا جاؤں۔'' منصور یہ سن کر برہم ہوگیا اور دونوں کو چلے جانے کا حکم دیا، ابن طاؤسؒ بولے ''ہم یہ ہی تو چاہتے تھے، امام مالک بن انس فرماتے ہیں ''میں نے دراصل طاؤس کے صاحبزادہ کا فضل اسی دن سے جانا ہے۔''(۲)

ورع واتقاء:

مباح چیزیں جن میں کسی درجہ کا کوئی شائبہ قباحت ہو، ان سے احتراز کرنا عین تقویٰ ہے۔ حضرت طاؤسؒ اس کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے ''ایک مرتبہ انہوں نے ایک جماعت کو دیکھا

---

(۱) ابن خلکان ج ا ص ۲۳۳۔ (۲) ابن خلکان ج ا ص ۲۳۳۔

کہ قرآن مجید کی تجارت کررہی ہے، تو فرط الم سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ (۱) لیث بیان کرتے ہیں کہ طاؤس سابوری غلام اوراون کی تجارت کومکروہ سمجھتے تھے۔ (۲) ایک مرتبہ انہوں نے قریش کے چند لوگوں کو دیکھا کہ بیت اللہ کا طواف کررہے ہیں، اوران کی وضع اسلاف کی وضع سے بدلی ہوئی ہے۔ فرمایا ''لوگو! تم کو کیا ہو گیا کہ ایسے لباس پہنتے ہو جو تمہارے بزرگوں نے نہیں پہنے اور ایسی رفتار سے چلتے ہو کہ ناچنے والے بھی اس طرح نہیں چلتے۔'' (۳)

جو خطوط ان کے پاس آتے تھے وہ اکٹھے ہو جاتے تو غالباً ازراہ احتیاط ان کو جلا ڈالتے تھے۔ ابن طاؤسؒ فرماتے ہیں ''میرے باپ اس کو بہت برا جانتے تھے کہ کوئی شخص اللہ کا واسطہ دے کر کسی چیز کا سوال کرے (۴) فرماتے تھے ''اگر کوئی نصرانی یا یہودی تم کو سلام کرے تو اس کے جواب میں ''علاک السلام'' کہو۔'' (۵)

رحم دلی:

رحم دلی بھی بدرجہ غایت تھی، ایک مرتبہ ایک چور کو دیکھا کہ لوگ اس کو پکڑ کر لے جارہے ہیں۔ آپ نے ایک دینار اس کا فدیہ دیا اور رہا کرالیا۔ (۶)

خوداعتمادی:

ان کو اپنے علم پر پورا بھروسہ بھی تھا، حبیب بن ابی ثابت کہتے ہیں ''مجھے ایک مرتبہ حضرت طاؤسؒ نے فرمایا ''میں جب تمہارے سامنے کوئی حدیث بیان کروں اور اس کی توثیق بھی کردوں، پھر تم اس کے متعلق کسی سے دریافت نہ کرو۔'' (۷)

لباس:

بالطبع فقر پسند تھے، لباس میں عموماً سادگی پسند کرتے تھے'' ان کے صاحبزادہ سے کسی نے پوچھا ''آپ کے والد سفر میں کیا پہنتے تھے''؟ بولے ''وہ صرف دو قمیصوں پر کفایت کرتے تھے۔ ان کے نیچے پاجامہ نہیں پہنتے تھے'' ابن زاذان کا بیان ہے ''میں نے طاؤسؒ کو دیکھا کہ دو پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی حنا کا خضاب بھی استعمال کرتے تھے۔ بعض روایتوں سے

---

(۱) ابن سعد ج۵ ص۳۹۳۔ (۲) ابن سعد ج۵ ص۳۹۲۔ (۳) ابن سعد ج۵ ص۳۹۵۔ (۴) ابن سعد ج۵ ص۳۹۳۔ (۵) ابن سعد ج۵ ص۳۹۳۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً۔

معلوم ہوتا ہے کہ عموماً وہ چہرہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے صرف رات کو اسے اٹھاتے تھے، عمامہ باندھتے تھے، اور اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ اس کے ایک حصہ کو ٹھوڑی کے نیچے لے جا کر بہ طور ڈھاٹے کے باندھا جائے۔ (۱)

زندہ دلی:

مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل زاہد خشک تھے بلکہ اسلامی تہواروں میں بڑی خوشی سے شریک ہوتے تھے۔ اور خوشیاں مناتے تھے۔ عید کے موقع پر اپنی تمام جواری کو خواہ سیاہ فام ہوں یا غیر سیاہ فام، حکم کرتے تھے کہ اپنے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگائیں۔ (۲)

وفات:

پہلے گزر چکا ہے، حج چالیس کئے تھے چنانچہ وفات بھی بسلسلۂ حج ہی ہوئی۔ ذی الحج ۱۰۶ھ کی ساتویں تاریخ تھی، ابھی مکہ مکرمہ میں ہی مقیم تھے کہ روح قفس عنصری سے ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی (۳) اس وقت آپ کی عمر کچھ اوپر نوے سال کی تھی۔ (۴) جنازہ میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ جنازہ کا چلنا دشوار تھا، ابراہیم بن ہشام امیر مکہ نے پولیس کا انتظام کرایا۔ عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب بھی شریک جنازہ تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپ حضرت طاؤسؒ کے جنازہ کو کاندھا دے رہے ہیں، اور ہجوم کی وجہ سے آپ کی ٹوپی گر گئی ہے، اور چادر پیچھے سے پھٹ گئی ہے۔ خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک نے نماز پڑھائی، اور پھر ان کے جسم کی امانت مکہ کی خاک پاک کے سپرد کر دی گئی، (۵) لوگوں نے دعا کی ''اللہ تعالیٰ طاؤس پر رحم کرے، انہوں نے چالیس حج کئے تھے۔ (۶)

---

(۱) ابن سعد، ج ۵ ص ۳۹۲۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴۔

(۴) ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵۔ (۵) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۳۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔

سلیمان بن مہرانؒ (اعمش)

نام ونسب:

سلیمان نام، ابو محمد کنیت، ان کے والد کا نام مہران تھا، مہران نسلاً عجمی تھے آبائی وطن طبرستان تھا۔ پھر کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، بنو کاہل کے غلام تھے، اور اسی نسبت سے کاہلی کہلاتے تھے۔ (۱)

پیدائش:

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے دن یعنی عاشور یکم محرم ۶۰ھ کو دنباوند میں پیدا ہوئے جورے الجبال کا ایک علاقہ ہے۔ (۲)

فضل وکمال:

اعمشؒ کے والد کوفہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے جو اس زمانہ میں اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اعمشؒ کی نشو ونما نہیں ہوئی۔ ابتداءً اگر چہ غلام تھے، مگر فطری استعداد وصلاحیت اور طبعی شوق علم کے لئے غلامی مانع نہ ہو سکی، انہوں نے بڑی توجہ اور محنت سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ وہ علما، کوفہ کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔ حافظ ذہبی ایسا نقاد انہیں ''شیخ الاسلام'' اور ''الحافظ الثقہ'' کہتا ہے۔ عیسیٰ ابن یونسؒ کہتے تھے ''ہم نے اور ہمارے پیشرو لوگوں نے اعمشؒ کا مثل نہیں دیکھا'' حافظ ابن حجر بھی انہیں ''علامتہ الاسلام'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ تمام مذہبی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ ابن عیینہؒ فرماتے ہیں ''اعمشؒ کتاب اللہ کے بڑے قاری احادیث کے بڑے حافظ، اور علم فرائض کے ماہر تھے۔ (۳) ابن مدینی کا بیان ہے۔ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں علم چھ بزرگوں نے محفوظ رکھا ہے۔'' مکہ میں عمرو بن دینار نے۔ مدینہ میں زہری نے، ابو اسحٰق السبیعی اور اعمشؒ نے کوفہ میں اور قتادہؒ اور یحییٰؒ بن ابی کثیر نے بصرہ میں۔ (۴)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۔ (۲) ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹ و تاریخ خطیب۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳۔

قرآن مجید کا علم:

یوں تو حضرت اعمشؒ تمام اسلامی علوم میں ہی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے مگر قرآن مجید کے ساتھ انہیں خاص شغف تھا۔ حضرت شعبہ ان کا ذکر کرتے تھے تو فرماتے تھے: ''قرآن، قرآن''۔ عمرو بن علی کہتے ہیں ''صدقِ مقال کی وجہ سے لوگ حضرت اعمش کو ''قرآن'' ہی کہنے لگے تھے'' حافظ ابن حجر انہیں ''علوم قرآنیہ کا سردار'' لکھتے ہیں (۱) ہشیم فرماتے ہیں:

''مَارَاَیْتُ بِالْکُوْفَةِ اَحَدًا اَقْرَاُ لِکِتَابِ اللهِ مِنْهُ۔'' (۲)

''میں نے کوفہ میں ان سے زیادہ قرآن کا بہتر قاری نہیں دیکھا۔''

قرآن مجید کا درس دیتے تھے طلحہؒ بن مصرف نے انہی کے پاس قرآن پڑھا تھا۔ مگر آخر عمر میں کبر سن اور ضعف کے باعث درس ترک کر دیا تھا، پھر بھی ماہ شعبان میں تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھاتے تھے۔ لوگ اپنے اپنے قرآن لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اعمشؒ کی قرأت کے مطابق اصلاح کرتے جاتے تھے۔ آپ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔ (۳)

حدیث:

حدیث میں ان کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ابن عمار فرماتے ہیں ''محدثین میں اعمشؒ سے زیادہ کوئی ثقہ نہیں ہے''۔ عجلی کہتے ہیں ''اعمش ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے اور اپنے عہد کے سب سے بڑے محدث اہل کوفہ تھے۔ (۴) علامہ حافظ ذہبی انہیں ''الحافظ الثقہ'' لکھتے ہیں، ابن عیینہ انہیں **احفظھم للحدیث** بتاتے ہیں (۵)۔ یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ جریر، اعمشؒ سے کوئی روایت کرتے تھے تو اس کے بعد فرمایا کرتے تھے ''یہ شاہی خلعت ہے۔''

امام زہریؒ اہل عراق کے علم کے قائل نہیں تھے۔ اسحٰق بن رشد نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ کوفہ میں بنو اسد کا ایک غلام ہے جو چار ہزار حدیثیں بیان کرتا ہے۔ امام زہری نے کہا ''چار ہزار!'' اسحٰق بولے ''ہاں چار ہزار'' اگر آپ کہیں تو میں اس کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پیش کروں؟'' فرمایا ''ہاں لاؤ'' چنانچہ انہوں نے بعض روایتیں سنائیں۔ اسحٰق کہتے ہیں زہری

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵۔

روایات پڑھتے جاتے تھے اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ پھر فرمایا ''خدا کی قسم! یہ وہ علم ہے جس کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ یہ کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا''(۱) شعبہ فرماتے ہیں:

''ماشفانی احدٌ فی الحدیث ماشفانی الاعمش.''(۲)

''مجھ کو حدیث میں کسی نے اتنی شفا نہیں دی جس قدر کہ اعمش نے شفا دی ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات انہیں خصوصیت کے ساتھ زیادہ یاد تھیں قاسم بن عبدالرحمٰن کے پاس سے ایک مرتبہ حضرت اعمشؒ گزرے تو انہوں نے فرمایا ''یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔''(۳)

ابن معین اعمش عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ کو اجود الاسانید کہتے تھے (۴) ابوبکر بن عیاش فرماتے ہیں کہ ہم حضرت اعمشؒ کو ''سید المحدثین'' کہتے تھے۔(۵)

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ مرویات اعمش کی تعداد چار ہزار تھی مگر ابن مدائنی کل تیرہ سو بتاتے ہیں(۶) ان کی روایات کے معتبر ہونے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ لوگ صداقت کی وجہ سے انہیں ''قرآن'' کہتے تھے۔

احادیث کی کثرتِ روایت کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا ''تم لوگ جب حدیث سننے کے لئے کسی کے پاس جاتے ہو تو اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہو۔ خدا کی قسم یہ لوگ شرا لناس ہیں۔(۷)

اساتذہ:

حضرت اعمشؒ نے جن بزرگوں سے سماعِ حدیث کیا تھا ان کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

عبداللہ بن ابی اوفیٰ، زید بن وہب، ابووائل، ابوعمرو الشیبانی، قیس بن ابی حازم عکرمہ، معرور بن سوید۔ ابراہیم النخعی رحمہم اللہ۔

---

(۱) ابن سعد ج۶ ص ۳۳۹۔ (۲) تہذیب التہذیب ج۴ ص ۲۲۳۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج۹ ص ۱۰۔

(۴) تہذیب التہذیب ج۴ ص ۲۲۵۔ (۵) تاریخ خطیب بغدادی ج۹ ص ۱۱۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص ۱۴۵۔

(۷) ابن سعد ج۶ ص ۳۳۹۔

حضرت انس بن مالکؓ سے ملاقات ثابت ہے، روایت ثابت نہیں ہے۔ اسی بنا پر حضرت اعمشؒ کی جو روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں ان کو مرسل قرار دیا گیا ہے۔ ابن المنادیٰ کی ایک روایت ہے کہ اعمش نے ایک مرتبہ ابو بکرۃ الثقفی کو دیکھا تو حدیث سننے کے اشتیاق میں جا کر ان کی رکاب پکڑ لی، ابو بکرہ بولے "بیٹا اس فعل سے تم نے اپنے رب کا اکرام کیا ہے" لیکن حافظ ابن حجر اس روایت کو غلط فاحش قرار دیتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ اعمش ۰۵۹ھ یا ۰۶۱ھ میں تولد ہوئے تھے اور ابو بکرہ ۰۵۱ھ یا ۰۵۲ھ میں انتقال کر چکے تھے، اس بناء پر دونوں میں کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔ (۱)

تلامذہ:

تلامذہ میں جو زیادہ مشہور اور نامور ہوئے ان کے نام یہ ہیں: شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، زائدہ، وکیع، عبیداللہ بن موسیٰ، ابراہیم بن طہمان، جریر بن حازم وغیرہم رحمہم اللہ۔

فقہ و فرائض:

قرآن و حدیث کی طرح فقہ میں عموماً اور فرائض میں خصوصاً بڑا کمال رکھتے تھے۔ ابن عیینہ ان کو "**اعلمهم بالفرائض**" فرائض کے سب سے بڑے عالم بتاتے ہیں۔

مغیرہ کا بیان ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد فرائض میں ہم نے اعمش کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ابن عیینہ ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں کہ اعمش اپنے ساتھیوں سے چار چیزوں میں بڑھ گئے۔ ان میں وہ فرائض کا بھی شمار کرتے ہیں۔ (۲)

استغناء و خودداری:

ان علمی کمالات کے ساتھ خدا نے انکو حد درجہ مستغنی اور فقر منش بنایا تھا امیروں اور شاہوں کا جاہ و حشم ان کی چشمِ قناعت کو خیرہ نہیں کر سکتا تھا۔ امام شعرانی لکھتے ہیں "اعمش کو روٹی تک میسر نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ان کی مجلس میں اغنیاء و سلاطین سب سے زیادہ فقیر معلوم ہوتے تھے۔ (۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۲۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳۔

(۳) طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۳۸۔

عیسیٰ بن یونس کا بیان ہے ''فقر و حاجت کے باوجود اغنیاء و سلاطین حضرت اعمش کی نگاہ میں سب سے زیادہ حقیر تھے۔''(۱)

ایک دفعہ خلیفہ ہشام نے ان کو لکھا کہ میرے پاس حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل اور حضرت علیؓ کے معائب لکھ کر بھیج دو۔'' انہوں نے قاصد کے سامنے ہی وہ خط ایک بکری کے منہ میں رکھ دیا اور اس نے چبا کر اس کو پارہ پارہ کر دیا۔ پھر قاصد سے فرمایا ''جاؤ یہ تمہاری تحریر کا جواب ہے۔'' قاصد بولا اگر میں یوں ہی واپس چلا گیا تو قتل کر دیا جاؤں گا۔'' لوگوں نے یہ سن کر حضرت اعمشؒ سے درخواست کی کہ جواب ضرور لکھ دیجئے۔ آپ نے یہ دیکھ کر جواب لکھا۔

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امابعد اگر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات میں تمام دنیا کی خوبیاں جمع ہوں تب بھی ان سے تمہاری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات میں تمام دنیا کی برائیاں جمع ہو جائیں تو ان سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تم کو چاہئے کہ اپنے نفس کی خبر لو۔''(۲)

بے لاگ تنقید:

وہ چونکہ کسی سے کوئی غرض اور طمع نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اپنی رائے کے اظہار میں بھی بڑے بے باک تھے۔ کسی کی خفگی اور خوشنودی کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکر بن عیاشؒ کہتے ہیں ''ایک مرتبہ ہم چند محدثین کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے آخر میں اعمشؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے پوچھا۔ کس کس کے پاس سے ہو کر آئے ہو؟'' ہم نے ایک ایک کا نام لیا اور وہ ہر ایک کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے رہے۔ کسی کو کہا: ''وہ تو ایک پھٹا ہوا طبل ہے'' کسی کے متعلق فرمایا ''وہ اڑنے والا پرندہ ہے'' اور کسی کے بارہ میں بولے ''وہ دف ہیں۔''(۳) غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض انہیں تند مزاج کہتے تھے۔

لباس میں سادگی:

کمالِ استغناء کی وجہ سے لباس کا بھی کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ ابن عیینہؒ فرماتے ہیں

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج۹ ص۸ (۲) ابن خلکان ج۱ ص۲۱۳ (۳) تاریخ خطیب ج۹ ص۱۱

''ایک مرتبہ ہم نے اعمش کو دیکھا کہ پوستین الٹی پہن رکھی تھی اور جو قبا زیب تن تھی بوسیدگی کی وجہ سے اس کے دھاگے ان کے پیروں پر لٹک رہے تھے۔ پھر خود ہی فرمایا'' کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا تو پھر بھی میرے پاس کوئی آتا۔ اگر میں بقال ہوتا تو لوگ مجھ سے سودا خریدتے ہوئے استکراہ کرتے۔

ایک مرتبہ عیسیٰ بن موسیٰ (جو اس زمانہ میں حاکم تھا) نے قراء کو عطیہ دینے کا حکم دیا، چنانچہ حضرات اپنے اپنے ملبوسات کے ساتھ تشریف لائے۔ اعمش بھی آئے تو اس شان سے کہ چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو ان کی نصف پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔ گھر میں داخل ہو کر فرمایا'' یہاں ابن ابی لیلیٰ ہیں اور یہاں ابن شرمہ۔ تم ہم کو ان لمبی لمبی دیواروں سے نجات دو۔'' عیسیٰ یہ سن کر بولا'' آج ہمارے پاس اعمش کے سوا کوئی قاری (یعنی واقعی قاری) آیا ہی نہیں، تم جلدی جلدی ان کے صلہ کا بندوبست کردو۔ (۱)

زہد وعبادت:

علمی و اخلاقی کمالات کے ساتھ اپنے وقت کے سب سے بڑے عابد وزاہد بھی تھے خریبی کا قول ہے'' اعمش کا جس دن انتقال ہو گیا، انہوں نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو ان سے زیادہ عبادت گزار ہو۔ وہ صاحب سنت تھے۔ (۲)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں'' وہ علم نافع اور عمل صالح دونوں میں سردار تھے۔ (۳) یحییٰ قطان کے سامنے کسی نے اعمش کا ذکر کیا تو فرمانے لگے'' وہ بڑے عابد وزاہد تھے نماز باجماعت کے پابند تھے، اور ہمیشہ صف اول میں رہتے تھے۔ وکیع کا بیان ہے'' اعمش نے تقریباً ستر سال تک تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہونے دی۔'' (۴)

جامعیت:

ان سب علمی و عملی فضائل نے ان کو مجموعۂ کمالات بنا دیا تھا، چنانچہ عیسیٰ بن یونس نے فرمایا'' ہم نے اور ہم سے پہلے کسی قرن نے اعمش ایسا بزرگ نہیں دیکھا۔'' یحییٰ فرماتے ہیں، اعمش صاحب فضل وقرآن تھے۔ اور وہ بہت بلند مرتبہ انسان تھے۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۶۔ (۲) ایضاً ص ۶۰۵۔

(۳) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۴۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۴۰

ظرافت:

مگراس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ بالکل زاہد خشک مزاج تھے، بلکہ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

"وكان لطيف الخلق مزاحًا."

"وہ بڑے خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے۔"

ایک مرتبہ چند لوگ ان کے پاس سماع حدیث کے لئے آئے۔ اعمش باہر نکلے تو فرمایا۔"اگر میرے گھر میں وہ نہ ہوتا جو مجھ کو تم سے زیادہ مبغوض ہے (یعنی بیوی) تو میں گھر سے نہ نکلتا۔" ایک دفعہ ان میں اور بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی۔ حضرت اعمش نے ثالثی کے لئے کسی شخص کو بلایا۔ اس شخص نے آ کر حضرت اعمش کی بیوی سے کہا "تم اپنے شوہر کی آنکھوں کے چندھے پن اور ان کی پنڈلیوں کے بدنما ہونے کو نہ دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کتنے بڑے امام ہیں اور ان کی کیا شان ہے اعمش بولے "خدا تم کو رسوا کرے، تم نے تو اور میری بیوی کو میرے عیوب بتا دیئے۔"

ایک دفعہ داؤد بن عمر نے جو خود جولاہا تھا پوچھا "جولاہے کی امامت کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا "اس کے پیچھے اگر نماز بے وضو پڑھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے" ایک مرتبہ اعمش بیمار تھے۔ امام ابوحنیفہ ان کی عیادت کو تشریف لائے، دیر تک بیٹھے رہے، چلنے لگے تو فرمایا "میں اتنی دیر تک آپ کے پاس بیٹھا، اس سے تو آپ پر بڑا بار ہوا ہوگا" اعمش بولے "آپ اپنے گھر میں ہوتے ہیں تو بھی میرے لئے بھاری ہی ہوتے ہیں"[۱] (اس میں امام اعظم کی جلالتِ علم کی طرف تلمیح ہے)۔

فصاحت:

گفتگو بڑی فصیح و بلیغ ہوتی تھی۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وكان فصيحًا"[۲]

تحقیر نفس:

اس پایہ کے مجموعۂ کمالات ہونے کے باوجود اپنی ذات کو بالکل حقیر و ہیچ سمجھتے تھے انہوں نے وصیت کی تھی "میں مرجاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع نہ کرنا اور مجھ کو میرے رب

---

(۱) یہ واقعات ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ سے ماخوذ ہیں۔ (۲) تاریخ بغدادی جلد ۹ ص ۵۔

کے پاس لے جا کر دفن کر دینا۔ میں اس سے فروتر ہوں کہ لوگ میرے جنازہ میں شریک ہوں۔ [1]

وفات:

باختلاف روایت ۱۴۷ھ یا ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ [2] انتقال کے بعد جریر نے خواب دیکھا۔ پوچھا ''اے ابومحمد! کیا حال ہے؟'' فرمایا ''ہم نے مغفرت کی وجہ سے نجات پائی۔ الحمدللہ رب العالمین۔ [3]

ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ایوب نام، ابوبکر کنیت۔ والد کا نام کیسان تھا اور کنیت ابوتمیمہ نسلاً کوئی ان کو عبری کہتا ہے اور کوئی جہنی۔ سختیانی کے لقب سے علامہ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق اسی لئے مشہور تھے کہ بصرہ میں بکرے کی دباغت دی ہوئی کھالیں فروخت کرتے تھے [4]۔ حضرت ایوبؒ قبیلہ غنزہ یا جہینہ کی غلامی میں تھے۔ [5]

فضل وکمال:

ایوبؒ غلام تھے، لیکن کشورِ علم وعمل کے تاجدار تھے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں ''سب ان کی جلالت و امامت، حفظ اور ثقاہت، وفورِ علم، فہم اور سیادت پر متفق ہیں۔ [6] علامہ ابن سعد تحریر فرماتے ہیں ''ایوب ثقہ اور حدیث میں ثبت تھے، جامع اور عدل تھے، متقی، کثیر العلم اور حجۃ تھے۔'' [7] ابن عیینہ فرماتے ہیں۔ لم الق مثله (میں ان کے مثل سے نہیں ملا) ابن ابن عماد الحنبلی ان کو احد الاعلام لکھتے ہیں۔ حماد بن زید فرماتے ہیں جن لوگوں سے میں نے مجالست کی ہے، ایوبؒ ان سب میں افضل تھے اور اتباع سنت میں سب سے زیادہ شدید تھے۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں ''ایوب علماء کے سردار، حفاظ حدیث کے امام، ثقہ اور بیدار مغز بزرگوں میں سے تھے [8]

---

(۱) طبقات کبریٰ امام شعرانی ج اص ۳۸۔ (۲) ابن سعد ج ۶ ص ۲۴۰۔ (۳) خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۳۔

(۴) تہذیب الاسماء قسم اول ج اص ۱۳۱۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۳۹۷۔ (۶) ابن سعد ج ۷ قسم دوم ص ۱۴۔

(۷) تہذیب الاسماء ج اص ۱۳۱۔ (۸) شذرات الذہب ج اص ۱۸۱۔

لوگ انہیں ''مبذ العلماء'' کہتے تھے۔ ہشام بن عروہ کہتے تھے ''میں نے بصرہ میں ایوبؒ کا مثل نہیں دیکھا۔'' ابوعثمان نے حضرت حسن بصریؒ سے سنا کہ وہ ایوب کو بصرہ کے نوجوانوں کا سردار کہتے تھے۔ ابن عوان فرماتے ہیں ''محمد بن سیرینؒ کی وفات ہوگئی تو ہم نے اپنا مرجع ایوب کو بنالیا۔ ابوحاتم کہتے ہیں: **ثقة لایسأل من مثله** (وہ ایسے ثقہ ہیں کہ ان کے مثل کے متعلق سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ ایک مرتبہ محمد بن سیرینؒ نے کوئی حدیث بیان کی۔ مسلم بن کیسان نے ان سے پوچھا ''آپ سے یہ روایت کس نے نقل کی ہے؟ فرمایا ''الثبت الثبت ایوب نے۔''(۱)

حدیث:

حضرت ایوبؒ کا خاص فن حدیث تھا، حافظ ذہبی ایسا نقادِفن ان کو "الحافظ احدا لاعلام" لکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے اجلۂ ائمہ سے سماع حدیث کیا تھا عمرو بن سلمہ الجرمی، ابوالعالیہ الریاحی، سعید بن جبیر، ابوقلابہ، عبداللہ بن شقیق، ابن سیرین حمید بن بلال، قاسم بن محمد، عبدالرحمٰن بن القاسم، نافع بن عاصم، عطاء، عکرمہ، اعرج عمرو بن دینار ان کے شیوخ تھے رحمہم اللہ۔

تلامذہ:

ان کے حلقۂ تلمذ میں جو لوگ شامل تھے ان میں سے اکثر آسمان علم وفضل پر مہر جہانتاب بن کر چمکے، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

اعمش، قتادہ، حماد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، شعبہ، امام مالک، ابن اسحٰق، سعید بن ابی عروبہ وغیرہم رحمہم اللہ۔ (۲) ان کی مرویات کی تعداد آٹھ سو اور بعض کے نزدیک دو ہزار ہے۔ (۳)

مرویات کا پایہ:

ثقاہت کے اعتبار سے ان کی مرویات کا جو پایہ ہے اس کا اندازہ ایسے ہوگا کہ شعبہ نے ان سے کسی ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا۔ انہوں نے فرمایا: مجھ کو اس میں شک ہے۔ حضرت شعبہ بولے:

''**شکک احب الی من یقین غیرک۔**'' (۴)

''آپ کا شک مجھ کو دوسرے کے یقین سے زیادہ محبوب ہے۔''

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۲۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ص ۳۹۷، ۳۹۸۔

(۳) تہذیب الاسماء ج ۱ص ۱۳۲۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱ص ۳۹۸۔

امام نسائیؒ انہیں ثقہ، ثبت بتاتے ہیں ابو حاتم فرماتے ہیں ''ان جیسا ثقہ دیکھا ہی نہیں گیا۔'' ابن خیثمہ کہتے ہیں: ''ایوب ابن عون سے زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں'' امام مالکؒ فرماتے ہیں:

''وکان من العالمین العاملین الخاشعین.''

''وہ عالم، عامل اور اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے۔''(۱)

احتیاط فی الحدیث

اس کمالِ ثقاہت کے باوجود وہ حدیث بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حماد بن زید فرماتے ہیں ''میں نے ایوب اور یونس سے زیادہ سوال کا جواب دینے میں کوئی محتاط نہیں دیکھا۔ جواب سے پہلے وہ سائل کے حافظہ کا امتحان کر لیتے تھے کہ کہیں وہ اسے غلط نقل نہ کر دے۔ حماد بن یزیدؒ کا بیان ہے کہ کوئی شخص حضرت ایوبؒ سے کوئی سوال کرتا تھا تو وہ جواب سے قبل اس سوال کا اعادہ کراتے تھے۔ اگر اس اعادہ میں وہ ذرا بھی خلط ملط اور تغیر کر دیتا تو حضرت ایوبؒ اس کا جواب نہیں دیتے تھے۔ پھر جواب میں بھی صرف احادیث سنا دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اپنی طرف سے حکم کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ان سے کوئی سوال کیا فرمایا ''مجھے معلوم نہیں'' وہ بولا اپنی رائے ہی بتا دیجئے'' ارشاد ہوا ''میری رائے بھی کچھ نہیں ہے۔''

ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا ''آپ رائے سے کام نہیں لیتے؟'' اس کے جواب میں فرمایا ''کسی نے گدھے سے کہا تو جگالی کیوں نہیں کرتا؟ بولا، میں باطل چیز کا چبانا برا جانتا ہوں'' اس سے آپ کی غرض یہ تھی کہ اپنی رائے کا ظاہر کرنا بھی ایسا ہی ہے۔

فقہ:

حدیث کی طرح فقہ کے بھی امام تھے۔ حضرت شعبہ انہیں ''سید الفقہاء'' کہتے ہیں۔ (۲) حماد کہتے ہیں ''ہمارے فقہاء ایوب، ابن عون اور یونس ہیں رحمہم اللہ۔''(۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸۔ (۲) ابن سعد ق ۲ ج ۷ ص ۱۴۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۱۔

احترامِ حدیث:

طبیعت میں خشوع وخضوع بہت تھا، اوراس بناپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سنتے ہی رو پڑتے تھے۔امام مالکؒ فرماتے ہیں ''ہم حضرت ایوبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کا ذکر آتا تھا تو بے ساختہ رونے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کی حالت پر رحم آتا تھا۔''(۱)

امام مالکؒ ہی ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ''میں نے جب دیکھا کہ ایوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا ادب احترام کرتے ہیں تو پھر میں نے ان سے حدیثیں لکھنی شروع کردیں۔ (۲)

انکساری وتواضع:

اس پایہ کے محدث اورفقیہ ہونے کے باوصف مزاج میں انکساری حد سے زیادہ تھی۔وہ ہمیشہ اس سے خائف رہتے تھے کہ علم کا پندار اور عجب وغرور پیدا ہوجائے۔ چنانچہ فرماتے تھے ''کون شخص اس سے محفوظ ہوسکتا ہے کہ وہ حدیث بیان کرے اور دیکھے کہ اس طرح اس نے جماعت میں کوئی امتیاز پیدا کرلیا ہے اوراس بناپراس کے دل میں کوئی عجب پیدا ہوجائے۔''(۳)

علماء کے لئے بڑا ابتلایہ ہوتا ہے کہ وہ کسی موقع پر کسی مسئلہ کی نسبت اپنی لاعلمی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔مگر حضرت ایوب اس سے بالکل مستثنیٰ تھے۔ان کو کسی مسئلہ کے متعلق علم نہیں ہوتا تھا تو وہ برملا اس کا اعتراف کرلیتے تھے۔ابن شوذب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایوبؒ سے اگر کبھی ایسا مسئلہ پوچھا جاتا جس سے وہ واقف نہیں ہوتے تھے تو بے تکلف فرمادیتے''**لیسئل اھل العلم**'' (اہل علم سے دریافت کرو) (۴)

شہرت سے نفرت:

اس انکساری اور تواضع کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ شہرت سے حد درجہ نفور تھے یہاں تک کہ عام مجمعوں اورلوگوں کی نظروں سے بچ کر وہ ایسے راستوں سے جاتے تھے جہاں کوئی انہیں نہ دیکھ سکے۔

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ص ۱۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸۔

(۳) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۴۔ (۴) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۴۔

حماد بن زیدؒ کہتے ہیں ''ایک مرتبہ میں حضرت ایوبؒ کے ساتھ چل رہا تھا مجھ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ایسے ایسے راستوں سے نکلے کہ میں متحیر تھا، انہیں وہ راستے کس طرح معلوم ہو گئے۔ اور یہ محض اس لئے تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ وہ ایوبؒ جا رہے ہیں تاہم راستہ میں اگر کوئی مل جاتا تو سلام کرنے میں سبقت کرتے۔ لوگ اس کے جواب میں اضافے کر کے سلام کرتے۔ حضرت ایوب پر اس سے خشوع طاری ہو جاتا تھا اور فرمانے لگتے ''اے اللہ میں یہ نہیں چاہتا، اے اللہ میں یہ نہیں چاہتا۔''

وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کے ساتھ چلے۔ حماد بن زیدؒ بیان کرتے ہیں' ایک مرتبہ میں بازار جا رہا تھا راستہ میں ایوب مل گئے، وہ ایک جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے، حضرت ایوبؒ کو دیکھ کر میں ان کے ہمراہ ہو گیا تو فرمانے لگے ''تم اپنے بازار جاؤ'' شعبہ بیان کرتے ہیں ''بسا اوقات میں اپنی ضرورت سے ان کے ساتھ جانا چاہتا تو وہ مجھے اجازت نہ دیتے۔ اور گھر سے نکل کر گلیوں میں ادھر ادھر ہو جاتے تھے تاکہ لوگ انہیں نہ جانیں۔'' (۱)

زہد و عبادت:

علمی کمال کے ساتھ زاہد و عابد بھی تھے۔ انہوں نے چالیس حج کئے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے تھے۔ "کان من عباد الناس وخيارهم" (۲) (ایوب بڑے عبادت گزار اور بہترین بزرگ تھے) مگر اس کے باوجود فرمایا کرتے تھے' جب صلحاء کا ذکر کیا جائے گا تو میں ان سے الگ ہوں گا۔'' (۳)

عبادت کا اخفاء:

تمام رات عبادت کرتے رہتے تھے، مگر صبح کے وقت آواز ایسی کر لیتے تھے جس سے معلوم ہو کہ ابھی اٹھے ہیں۔ (۴) اس زمانہ کے عام عابدوں اور زاہدوں کا لباس یہ تھا کہ وہ چست قمیض پہنتے تھے حضرت ایوبؒ میں اخفا کا جذبہ اس قدر تھا کہ انہوں نے یہ لباس ہی ترک کر دیا تھا۔ اپنی قمیص ڈھیلی ڈھالی رکھتے تھے۔ سعید نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا ''ابو عروہ! پہلے زمانہ میں دامن لٹکا کر چلنے میں شہرت تھی اور اب سمیٹ کر چلنے میں ہے۔'' (۵)

ان کا مقولہ تھا کہ انسان کو خواہ کتنا ہی بڑا زاہد ہو اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ ضروری ہے کہ وہ اپنے زہد کو لوگوں کے لئے عذاب نہ بنائے۔ (۶)

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۵ و ۱۶۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔
(۴) ایضاً۔ (۵) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۵۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔

اہلِ حکومت سے اجتناب:

اربابِ حکومت کی ملاقات سے ہمیشہ مجتنب رہتے تھے یہاں تک کہ انہیں کسی خلیفہ کا اپنے مکان پر آنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا ''مجھ کو میرا بیٹا بکر سب سے زیادہ محبوب ہے، مگر اس کے باوجود میں اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کروں۔ یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہشام یا کوئی اور خلیفہ میرے پاس آئے۔[1]

یزید بن ولید کے ذاتی دوست تھے۔ مگر جب وہ والی خلافت ہوا تو آپ نے دعاء کی ''اے اللہ! میرے ذکر کو چھپالے'' یعنی اب یزید میری شہرت کی وجہ سے بار بار یاد نہ کرے۔[2]

خوش خلقی:

اس قدر عابد و زاہد اور شہرت و وجاہت سے نفور ہونے کے باوجود خوش اخلاق بھی انتہا درجہ کے تھے۔ کوئی ان کے مکان پر آتا تھا تو حتی الوسع ان کی خاطر مدارات کرتے اور بشاشت وجہ کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ حماد بن زیدؒ کا بیان ہے ''میں نے حضرت سے زیادہ کوئی خندہ رو نہیں دیکھا[3] عیدالفطر کے موقع پر خاص اہتمام کرتے تھے۔ اس دن اپنے تمام پڑوسیوں کے ہاں حصے بھیجتے تھے[4] جو احباب ملتے تھے اُن سے بڑی گرم جوشی سے ملاقات کرتے تھے۔

ربیع بن مسلم کہتے ہیں ''ایک مرتبہ میں حضرت ایوبؒ کا ہم سفر تھا۔ ابطح میں ہم قیام پذیر تھے کہ ایک فربہ اندام شخص آیا جس نے اس وقت موٹا لباس پہن رکھا تھا، اس نے حضرت ایوب کو دریافت کیا میں نے اطلاع کی، آپ تشریف لائے تو اس شخص کو دیکھ کر اس کے گلے سے لپٹ گئے۔ لوگوں نے پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' آپ نے فرمایا یہ ''سالم بن عبداللہؓ ہیں۔''[5]

عیادت و تعزیت:

آپ کے پاس بہت سے ایسے آدمی آتے تھے جن سے آپ ناآشنایانہ معاملہ کرتے تھے۔ لیکن اگر وہ بیمار ہو جاتے تو آپ ان کی عیادت کو تشریف لے جاتے اور ان کا انتقال ہو جاتا تو تعزیت کے لئے ان کے مکان پر جاتے تھے اور اس درجہ دل سوزی کا اظہار فرماتے کہ وہ شخص آپ

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ص ۱۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲۔

(۴) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۔ (۵) ایضاً ص ۱۵۔

کا بہت ہی بڑا مکرم و محترم معلوم ہوتا تھا۔ شام میں ثقیف کے ایک غلام یعلیٰ بن حکیم کا انتقال ہوگیا۔ اس نے صرف ایک ماں چھوڑی تھی۔ حضرت ایوبؒ کو خبر ہوئی تو تین دن تک برابر تعزیت کے لئے یعلیٰ کی ماں کے پاس اس کے مکان پر جاتے رہے، آپؒ دیر تک وہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے تلامذہ واحباب بھی آپؒ سے ملنے وہیں چلے جاتے تھے۔ (۱)

کرامات:

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے آپؒ صاحبِ کرامات بھی تھے۔ ابویعمر کا بیان ہے کہ حضرت ایوبؒ مکہ کے راستہ میں تھے اہل کارواں کو پیاس لگی، مگر انہوں نے اس کو ظاہر نہیں کیا۔ حضرت ایوبؒ نے باصرار دریافت کیا تو انہوں نے افشاء کردیا۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا ''تم کسی پر ظاہر تو نہیں کروگے؟'' لوگوں نے اقرار کرلیا تو آپ نے ایک دائرہ بنایا۔ اور دعا مانگی نتیجہ یہ ہوا کہ پانی ابلنے لگا جس سے سب خوب جی بھر کر سیراب ہوئے اور انہوں نے اپنے اونٹوں کو بھی پانی پلایا۔ پھر آپ نے اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پانی ابلنا بند ہوگیا۔ (۲)

حلیہ:

سر پر بڑے بڑے بال رکھتے جس کو سال بسال (غالباً حج کے موقع پر) منڈوا دیتے تھے اور زیادہ بڑے ہوجاتے تھے تو ان میں مانگ نکالتے تھے، توند بڑھی ہوئی تھی ازار باندھنے پر بھی ناف ظاہر رہتی تھی۔ سر اور داڑھی پر سرخ خضاب استعمال کرتے تھے۔ (۳)

وفات:

۶۳ برس کی عمر میں بمرضِ طاعون بصرہ میں ۱۳۱ھ وفات پائی۔ انہوں نے ایک سرخ چادر عرصہ سے کفن کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ اور اس کو وہ احرام کی حالت میں اور رمضان کی تیسویں شب میں اوڑھتے تھے، مگر یہ اتفاقاً مکہ میں چوری کرلی گئی تھی۔ (۴)

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴۔

(۳) ابن سعد ج ۷ ص ۱۴ و ۱۵۔ (۴) ایضاً ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۔

حضرت مکحول الدمشقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

مکحول نام، ابوعبداللہ یا ابوایوب کنیت۔ ان کے نسب سے متعلق روایات مختلف ہیں۔ حافظ ابن حجر نے کئی روایتیں نقل کی ہیں، جن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسلاً عجمی تھے اوران کے والد کا نام سہراب تھا۔ بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ مصری تھے اور بعض سے ان کا ہذلی یعنی عرب ہونا دریافت ہوتا ہے۔

اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق حضرت مکحول کا خود اپنا بیان یہ ہے کہ میں پہلے عمرو بن سعید بن العاص کا غلام تھا۔ انہوں نے مجھ کو مصر میں قبیلۂ ہذیل کے ایک شخص کو دے دیا۔ اس بیان سے ان دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے، جن میں سے ایک سے ان کا عمرو بن سعید کی غلامی میں ہونا اور دوسری سے ہذلی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (1)

شوقِ علم:

ہذلی نے آزاد کر دیا تو آپ کو تحصیلِ علم کا شوق ہوا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے طویل طویل سفر کیے خود ان کا اپنا بیان ہے ''میں مصر میں اس وقت تک مقیم رہا جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو گیا کہ یہاں علم نہیں ہے اور جو کچھ علم تھا وہ میں حاصل کر چکا تھا۔ یہاں سے روانہ ہو کر میں عراق آیا۔ جب یہاں کا تمام علم بھی میں نے حاصل کر لیا تو یہاں سے بھی روانہ ہوا اور سرچشمۂ علوم و معارف مدینہ میں پہنچ کر اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کا سامان کرنے لگا غرض کہ انہوں نے طلب علم میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان لیا تھا، اور جہاں سے جتنا کچھ علم ملا اسے اپنے دامانِ شوق میں سمیٹ لیا، وہ خود فرماتے ہیں:

''طفت الارض فی طلب العلم.''

''میں نے علم کی طلب میں زمین کا چکر لگایا تھا۔''

مدینہ میں جس شانِ انہماک سے انہوں نے علم حاصل کیا اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

---

(1) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۱۔

"فلم ادع بهما علماً الا حویت علیه." [۱]

''مدینہ اور عراق میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس کو میں نے حاصل نہ کیا ہو۔''

فضل وکمال:

ان کے اس شوق وذوق اور محنت وجستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ''سرخیل علماء عصر بن گئے'' امام زہریؒ فرماتے تھے: علماء تین ہی ہیں۔ ان میں سے ایک مکحول ہیں [۲]۔ ابن یونسؒ کہتے ہیں وہ ''فقیہ وعالم تھے۔ ابن عمار ان کو اہل شام کا امام بتاتے ہیں۔ عجلی انہیں تابعی ثقہ کہتے ہیں۔ سلیمان بن موسیٰ کہتے تھے مکحول کا علم شام سے ہم تک پہنچا تو ہم نے اس کو قبول کرلیا۔ [۳]

حدیث:

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے انہوں نے مدینہ، عراق، شام اور مصر میں علم حاصل کیا تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کو کن صحابہ سے لقاء حاصل ہے۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انہوں نے حضرت انسؓ سے ملاقات کی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں نے دمشق کی مسجد میں حضرت انسؓ کو دیکھا، میں نے ان کو سلام کیا اور ان سے پوچھا کہ جنازہ اٹھانے اور اس میں شریک ہونے کے بعد وضو کرنا چاہئے یا نہیں؟ فرمایا ''ہم نماز میں تھے اور نماز کی طرف آئے ہیں پھر اس کے درمیان وضو کی کیا ضرورت ہے؟'' [۴]

شیوخ:

حضرت انسؓ کے علاوہ ان کے شیوخ کبار یہ ہیں:

واثلہ بن اسقع، ابوامامہ، محمود بن الربیع، عبیداللہ بن محیریز، عبسہ بن ابی سفیان، جبیر بن نفیر، سلیمان یسار، شرجیل بن السمط، طاؤس بن کیسان، عراک بن مالک، کثیر بن مرہ وقاص بن ربیعہ، ام الدرداء الصغریٰ رحمہم اللہ [۵] مگر امام شعبیؒ سے خصوصیت کے ساتھ استفادہ کیا تھا۔ ان کا بیان ہے "لم ارمثلہ" (میں نے ان جیسا نہیں دیکھا) ان بزرگوں کے علاوہ قاضی شریح کی مجلسوں میں بھی شریک رہے ہیں۔ [۶]

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱۔ (۴) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۱۔
(۵) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۰۔ (۶) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۰ و ۱۶۱۔

تلامذہ:

ان کے خوشہ چینیوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ان میں مشہور یہ ہیں: امام اوزاعی، عبدالرحمٰن بن یزید، عکرمہ بن عمار، محمد بن الولید الزہری، محمد بن اسحٰق، حجاج بن ارطاۃ، برد ابن سنان، زید بن واقد، ثور بن یزید، ایوب بن موسیٰ، محمد بن راشد، ثابت بن ثوبان وغیرہم رحمہم اللہ۔

ثقاہت:

حضرت مکحولؒ کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ فرماتے تھے ''جس کسی چیز کو میں اپنے سینہ میں محفوظ رکھتا تھا، اس کی ضرورت پیش آتی تو فوراً یاد آجاتی تھی۔'' اس بناء پر ملک ملک کی خاک چھاننے کے بعد جو کچھ انہوں نے سنا تھا ان کے خزانۂ حافظہ میں جمع تھا[1] علامہ ابن سعد انہیں تابعین شام کے تیسرے طبقہ میں شمار کرتے ہیں۔[2] ابن یونس کہتے ہیں ''ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے'' [3] حافظ ذہبی انہیں تابعین کے تیسرے طبقہ اور کبار حفاظ میں شامل مانتے ہیں۔[4]

فقہ:

حدیث میں امامت وکمال کے ساتھ وہ فقہ کے بھی مُسلّم امام تھے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں ''میں نے شام میں مکحول سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔[5] سعید بن عبدالعزیز کہتے تھے مکحول زہری سے بڑے فقیہ تھے۔[6] مروان بن محمد کا بیان ہے کہ کوئی شخص مکحول سے زیادہ فتویٰ میں بصیرت رکھنے والا نہیں تھا۔[7] لیکن اس کمال تفقہ کے باوجود وہ فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں ''وہ اس وقت تک فتویٰ نہیں دیتے تھے جب تک کہ پہلے ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم'' نہ پڑھ لیتے تھے اور کسی مسئلہ میں حکم بیان کرنے کے بعد صاف طور سے فرمادیتے تھے ''یہ میری رائے ہے اور خطا بھی ہوتی ہے اور صواب بھی۔ ''[8]

خوفِ خدا:

ان علمی کمالات کے ساتھ اخلاقی و باطنی محاسن سے بھی بحصہ وافر بہرہ اندوز تھے خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ کرا رکھی تھی۔

رب باعذ مکحولاً من النار (ابن سعد) اے رب تو مکحول کو دوزخ سے دور رکھ۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۰۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۱۴۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۱۔ (۵) ایضاً ج ۱ ص ۱۰۲۔ (۶) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۷۔

(۷) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱۔ (۸) شذرات الذہب۔

انفاق فی سبیل اللہ:

حضرت مکحول ان مجاہدین میں سے تھے جن کو خلافت کی طرف سے وظائف ملتے تھے مگر حضرت مکحولؒ اپنے وظیفہ سے خود جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کرتے تھے۔[1] اور دوسرے مجاہدین کو بھی مدد دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کو کہیں سے دس ہزار دینار کی رقم خطیر ملی تو انہوں نے اس میں سے پچاس پچاس دینار مجاہدین کو گھوڑا خریدنے کے لئے دیئے تھے۔[2]

ایک الزام اور اس کا ازالہ:

مکحول کی نسبت ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ قدریہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے علامہ ابن سعد نے بعض ایسی روایتیں بھی نقل کی ہیں جن سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کا دامن اس الزام سے بالکل پاک تھا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں ''تابعین میں سے صرف حسن اور مکحول دو بزرگ تھے جن کے متعلق شہرت تھی کہ قدریہ عقائد رکھتے ہیں۔ ہم نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے ان کے علاوہ حضرت مکحول کے ایک شاگرد سعید بن عبدالعزیز بھی اس عقیدہ سے ان کی برأت کی شہادت دیتے تھے۔[3] جوزجانی فرماتے ہیں۔

یتوهم علیه القدر وهو سعی علیه ان پر قدر کا شبہ کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت وہ ان پر اتہام ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''یحییٰ بن معین کہتے تھے کہ مکحول قدری ہیں مگر پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔[4]

عام حالات:

مکحول انگوٹھی پہنتے تھے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ نماز پڑھتے وقت ایک ڈھیلا ڈھالا طیلسان زیب بدن فرماتے تھے اور زبان میں کچھ لکنت بھی تھی۔

وفات:

باختلاف روایت ۱۱۲ھ۔ ۱۱۳ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ۔

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۱۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶۔

(۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱۔ (۴) ایضاً ص ۲۹۳۔

منصور بن زاذان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

منصور نام، والد کا نام زاذان تھا، عراق کے مشہور شہر واسط کے باشندہ تھے بنوثقیف کی غلامی میں ہونے کی وجہ سے ثقفی کہلاتے تھے۔ (۱)

فضل وکمال:

حضرت منصورؒ نے اپنے عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے استفادہ کیا تھا اس بنا پر وہ واسط کے جلیل المرتبت علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

"وکان ثقة حجةً صالحًا متعبداً کبیر الشان." (۲)

''منصور معتبر، حق کی دلیل، صالح، عبادت گزار اور بڑی شان والے تھے۔''

شیوخ:

انہوں نے خصوصیت کے ساتھ حضرت حسن بصریؒ کے ساتھ مجالست کی تھی۔ ان کے علاوہ آپ کے اساتذۂ کرام یہ ہیں:

انس بن مالکؓ، ابو العالیہ الریاحی، محمد بن سیرین، عطاء بن ابی رباح، میمون ابن ابی سبیب، معاویہ بن قرۃ، حمید بن ہلال، قتادہ، عمرو بن دینار، حکم بن عتیبہ، عبدالرحمٰن بن القاسم، محمد بن الولید بن مسلم الغزی۔

تلامذہ:

ان کے بھتیجے مسلم بن سعید الواسطی، حبیب بن الشہید، جریر بن حازم، خلف بن خلیفہ، ہشیم ابوحمزہ، ابوعوانہ وغیرہ ان کے تلامذہ ہیں۔ (۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱۲۴۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۶۔

ثقاہت:

کیفیت کے اعتبار سے ان کی روایتیں معتبر ہوتی تھیں۔ عبداللہ بن احمد اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ منصور شیخ ثقہ تھے۔ ابن معین، ابو حاتم اور امام نسائیؒ انہیں ثقہ مانتے ہیں اور عجلی انہیں ثقہ ثبت کہتے تھے۔ (۱)

قرآن مجید سے شغف:

منصور کے صحیفۂ محاسن و کمالات کا روشن باب عبادت و ریاضت تھا ان کو قرآن مجید سے حد درجہ شغف تھا رات کو نماز میں قرآن مجید پڑھنا شروع کرتے تو چاشت کے وقت تک ختم کر دیتے تھے، جب وہ سجدۂ قرآن ادا کرتے تو لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے پورا ایک قرآن ختم کرلیا ہے۔ (۲) بلکہ بعض روایتوں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ فجر اور عصر کے درمیان ایک قرآن ختم کر دیتے تھے۔ (۳)

قرآن مجید حتی الوسع جلد پڑھنا چاہتے تھے مگر پڑھ نہ سکتے تھے۔ ہشام بن حسان کا بیان ہے ''ایک مرتبہ میں نے حضرت منصورؒ کے ساتھ مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھی تو میں نے دیکھا کہ دوسری رکعت میں وہ سورۂ نحل تک پہنچ گئے۔'' (۴)

رمضان میں خصوصیت کے ساتھ یہ شوق تیز تر ہو جاتا تھا، روزانہ کئی قرآن ختم کرتے تھے۔ نماز میں اس زور کا گریہ طاری ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی وجہ سے عمامہ تر ہو جاتا تھا۔ نماز شروع کرنے سے قبل گیارہ سجدے کرتے تھے۔ (۵)

تجرّد:

عبادت میں انہماک کے باعث وہ لوگوں سے الگ تھلگ اور علائق دینویہ سے زیادہ تر مجرد رہا کرتے تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں: ''وکان من المتقشفین المتجردین'' (۶) ابن عماد الحنبلی انہیں ''زاهد البصرة وشیخها'' لکھتے ہیں۔ (۷)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۶۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۶۰۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۷۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴۔ (۵) حلیۃ الاولیاء ابو نعیم ج ۳ ص ۵۸۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۷۔
(۷) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۱۔

ان پر خوف خدا اس قدر مسلط تھا کہ غم وحزن و سرور مفرط پر ترجیح دیتے تھے خلف بن خلیفہ بیان کرتے ہیں کہ منصورؒ بسا اوقات فرمایا کرتے تھے "غم اور رنج سے انسان کی نیکیوں میں زیادتی ہوتی ہے، اور اس کے برخلاف اکڑنا اور اترانا انسان کی برائیوں میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں۔[1]

وفات:

حضرت منصورؒ اپنے علم وفضل اور زہد وعبادت کی وجہ سے بلا قید ملت و مذہب ہر دلعزیز خلق تھے۔ ۱۳۱ھ میں مرضِ طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اخیر عمر میں واسط سے ستائیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام مبارک ہے، منصور وہاں منتقل ہو گئے تھے۔[2] جنازہ اٹھا تو اس میں ہر مذہب کے آدمی شریک تھے۔ عباد بن عوام کہتے ہیں۔ میں منصورؒ کے جنازہ میں شریک تھا میں نے دیکھا کہ اس میں ایک طرف عیسائی بھی تھے اور ایک طرف یہودی بھی۔ ہجوم اس قدر تھا کہ میرے ماموں نے میرے گم ہو جانے کے ڈر سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔[3]

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۳۴۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۸۰۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۳۴۔

میمون بن مہران رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

میمون نام، ابوایوب کنیت۔ والد کا نام مہران تھا۔ مہران بنونصر بن معاویہ کے مکاتب غلام تھے۔ بدلِ کتابت ادا کرنے کے بعد آزاد ہو گئے تھے۔

پیدائش:

میمون ۴۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ابتداً یہ قبیلۂ ازد کی ایک شاخ ثمالہ کی ایک عورت کے غلام تھے۔ اس نے ان کو آزاد کر دیا تھا اس کے بعد بھی یہ کوفہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب محمد بن عبدالرحمٰن اشعث نے حجاج کے خلاف معرکہ آرائی کی جس کو حربِ جماجم کہا جاتا ہے، تو میمون کوفہ چھوڑ کر جزیرہ میں آبسے تھے، خود میمون بیان کرتے ہیں کہ جنگ جماجم کا آغاز ۸۰ھ میں ہوا تھا اس حساب سے کم وبیش چالیس سال کی عمر میں جزیرہ منتقل ہو گئے تھے۔

فضل وکمال:

ام نمر کی غلامی کے باوجود میمون نے تحصیل علم میں کوتاہی نہیں کی انہوں نے عمر کے چالیس برس کوفہ میں ہی بسر کئے تھے جو اس وقت اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے صرف ذوق خداداد تھا، انہوں نے اکابر امت سے استفادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میمون ائمہ روزگار میں سے ہو گئے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں ''کان ثقۃ کثیر الحدیث'' حافظ ذہبی ان کو امام وپیشوا قرار دیتے ہیں۔ اور جزیرہ کا نمایاں عالم بتاتے ہیں سلیمان بن موسیٰ الفقیہ کا بیان ہے ''ہشام کی خلافت میں چار بزرگ تھے جن کو علماء انام کہا جاتا تھا۔ حسن بصری، مکحول دمشقی، میمون بن مہران اور شہاب الدین زہری، ابوالملیح کہتے تھے ''میں نے کوئی شخص میمون سے افضل نہیں دیکھا۔ (۱)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳۔

حدیث:

فن حدیث میں مسلم الثبوت امام تھے، انہوں نے صحابۂ کرام میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعین میں سعید بن جبیرؒ، نافع مولیٰ ابن عمر مقسمؒ مولی ابن عباسؓ، یزید بن عاصمؒ سے استفادہ کیا تھا۔''

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا مشہور نام یہ ہیں، خود ان کے فرزند عمرو بن میمون، حمید الطّویل، ایوب، جعفر بن برقان، جعفر بن ابی وحشیہ، حبیب بن الشہید، علی بن الحکم النبانی، حکم بن عتیبہ، ابوفروۃ یزید بن سنان الرہادی، حجاج بن تمیم، سالم بن مہاجر، ابوالملیح الرقی۔ (۱)

ان کی مرویات کا پایہ:

کیفیت کے لحاظ سے ان کی مرویات کا پایہ بلند تھا۔ علامہ ابن سعد کا قول پہلے گزر چکا ہے ابوعروبہ انہیں تابعین کے حلقۂ اول میں شمار کرتے ہیں۔ احمد کہا کرتے تھے ''میمون بن مہران حضرت عکرمہ سے زیادہ ثقہ ہیں۔ (۲) عجلی کہتے ہیں '' تابعی ثقہ ابوزرعہ اور امام نسائی بھی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔

فقہ:

فقہ میں وہ تمام علماءِ جزیرہ میں ممتاز تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں:

''وکان الغالب فی الجزیرۃ فی الفتویٰ والفقۃ.'' (۳)

''فتویٰ اور فقہ میں جزیرہ میں سب پر غالب تھے۔''

تحصیلِ علم کے زمانہ میں ہی ان کو فقہ میں اچھی مہارت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں ''میں مدینہ میں آیا تو دریافت کیا کہ یہاں کا سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ لوگوں نے حضرت سعید بن المسیبؒ کا نام لیا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوالات کرنے لگا۔ سعید نے فرمایا ''تم تو اس شخص کی طرح سوالات کرتے ہو جو ان تمام چیزوں کا ماہر ہو جو آج سے پہلے تک یہاں موجود رہی ہیں۔ (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۳۹۰۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ابن سعد ج ۷ق ۲ص ۱۷۸۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۳۹۱

لوگوں کو ان کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ عبدالکریم فرماتے ہیں ''اے اہل رقہ ہم کو تمہارا علم نہیں ہے۔ بس جو علم ہمارے پاس میمون بن مہران کی جانب سے آتا ہے ہم اس کو قبول کر لیتے ہیں اور جس شخص کو ہم ان کے جادہ سے منحرف دیکھتے ہیں اسے رد کر دیتے ہیں۔ (۱)''

ان علمی کمالات کے باعث حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایسا مردم شناس بزرگ میمونؒ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ آپ میمونؒ کو دیکھتے تو فرماتے: ''جب میمونؒ اور ان کے مثل اس دنیا میں نہیں رہیں گے تو لوگ مضطرب ہو جائیں گے۔'' مگر خود حضرت میمونؒ کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے کہا ''جب تک آپ اس دنیا میں رہیں گے لوگوں کی حالت بہتر رہے گی'' آپ نے فرمایا: ''جاؤ اپنا کام کرو، لوگ تو اس وقت تک بہتر حالت میں رہیں گے، جب تک وہ اپنے رب سے ڈرتے رہیں گے۔ (۲)''

ولایت خراج:

میمونؒ اپنی معاش کے لئے کپڑوں کی تجارت کا کام کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان کی دیانت و امانت پر اعتماد کر کے انہیں خراج وصول کرنے کا مہتمم بنا دیا تھا، لیکن میمون اس درجہ محتاط تھے کہ وہ اس کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس اپنا استعفاء بھی بھیج دیا تھا، مگر اس کو باب خلافت میں منظور نہیں کیا گیا (اور حضرت عمرؒ نے لکھا کہ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، صرف درہم کا معاملہ ہے، تم اسکو حق سے لوگے اور حق کی جگہ ہی میں رکھو گے) اس کے بعد حضرت عمرؒ کی خلافت کے اختتام تک آپ برابر اس کارِ خیر کو انجام دیتے رہے۔ اس سے قبل محمد بن مروان کی طرف سے آپ بیت المال کے سر دفتر تھے۔ میمون خراج کی ولایت کا تمام کام اپنی دکان میں ہی بیٹھ کر انجام دیتے تھے آپ کے صاحبزادے عمرو بن میمون دفتر کے محافظ تھے۔

حضرت عمرؒ کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس کے عہد میں بھی چند ماہ تک خراج کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مگر پھر مستعفی ہو گئے۔ بعض دوستوں نے استعفا واپس لینے کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا ''میری آنکھیں جاتی رہتیں،'' اور تذکرۃ الحفاظ میں ہے ''میری انگلیاں کٹ جاتیں، یہ مجھ کو زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ میں کسی عہدہ کا انچارج ہوتا،'' کسی نے دریافت کیا ''حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف سے بھی فرمایا: ہاں! وہ عہدہ حضرت عمرؒ کی طرف سے پیش کیا جاتا یا کسی اور کی جانب سے۔''(۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱۔ (۲) ایضاً ص ۳۹۲۔ (۳) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۷۸۔

قضا:

عہدۂ خراج ہی نہیں، بلکہ حضرت عمر نے میمون کی جامعیت وفقاہت کی قدر کرتے ہوئے انہیں جزیرہ کا قاضی بھی بنادیا تھا۔ (۱)

معصیت سے اجتناب:

حضرت میمونؒ پر خشیت ربانی کا بڑا غلبہ تھا، ممنوعات سے بہت اجتناب کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادہ عمرو بن میمون کا بیان ہے کہ میرے والد (فرائض کے علاوہ) زیادہ نماز روزہ نہیں کرتے تھے مگر معصیت کے قریب جانے کو برا جانتے تھے۔ (۲)

عبادت:

اگر چہ عموماً وہ فرائض وسنن کے علاوہ زیادہ عبادت نہ کرتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی ہزار ہزار رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ سترہ دن میں سترہ ہزار رکعتیں پڑھیں۔ (۳)

سلامت روی:

حضرت میمون جلیل القدر عالم ہونے کے باوجود بے حد سلیم الطبع تھے۔ اگر اپنی کسی رائے کے خلاف کوئی مضبوط دلیل سنتے تھے تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ بعض دلائل کی بناء پر آپ کا خیال یہ تھا کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں فرمایا ''آپ کی کیا رائے ہے، وہ شخص افضل ہے جس نے مال کے خرچ کرنے میں عجلت کی (یعنی حضرت عثمانؓ) یا وہ جس نے خون بہانے میں عجلت کی (یعنی حضرت علیؓ) یہ استدلال سن کر حضرت میمونؒ نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا، اور فرمایا کہ اب آئندہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہوں گا۔

وفات:

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۱۷ھ میں وفات پائی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عبادت کرنے کے باعث پیٹ میں کوئی سخت تکلیف ہوگئی تھی اس کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۹۲۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۳۹۱۔ (۳) ایضاً ص ۳۹۲۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۳۹۲۔

سلمہ بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

سلمہ نام، ابو حازم کنیت۔ فارس کے رہنے والے تھے، والد کا نام دینار تھا۔ اسود بن سفیان مخزومی کے غلام تھے۔ بعض لوگوں نے ان کو بنو شجع کا غلام بتایا ہے مگر علامہ ابن حجر نے اس کو وہم قرار دیا ہے۔

فضل وکمال:

سلمہ نسلاً عجمی اور غلام تھے، مگر ان کے ذاتی شوقِ علم اور اسلام کے فیضِ مساوات نے ان کو سرآمد روزگار بنادیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں ''سلمہ واعظ زاہد، مدینہ کے عالم اور شیخ تھے [۱] علامہ نووی انہیں ''الفقیه المشهور بالمحاسن'' لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان کی ثقاہت وجلالت اور ثناء پر سب کا اتفاق ہے۔[۲] ابن خزیمہ فرماتے ہیں:

''لم یکن فی زمانه احدٌ مثله.'' [۳]

''ان کے زمانہ میں کوئی ان جیسا نہیں تھا۔''

حدیث:

حدیث کے بڑے حافظ تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں: ''کان ثقة کثیر الحدیث.'' [۴]

شیوخ:

انہوں نے صحابۂ کرام میں سہل بن سعدی الساعدیؓ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایتیں کی ہیں مگر ان کے صاحبزادے نے یحییٰ بن صالح سے بیان کیا جو شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ میرے والد نے سہل بن سعدؓ کے علاوہ کسی اور صحابی سے...... سماع کیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے [۵] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں حضرت سہلؓ کے علاوہ کسی اور سے سماع ثابت نہیں ہے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۲۵۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۹۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۲۵۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔ (۵) ایضاً۔

غیر صحابی علماء میں ایک جماعت کثیر سے روایتیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں:

ابو امامہ بن سہل بن حنیف، سعید بن المسیب، عامرُ بن عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن ابی قتادہ، نعمان بن ابی عیاش، یزید بن رومان، عبیداللہ بن مقسم، ابراہیم بن عبدالرحمٰن، ابو صالح السمان، ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن، ابن المکندر وغیرہم رحمہم اللہ۔

تلامذہ:

جن بزرگوں نے سلمہ سے روایتیں نقل کی ہیں اور ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں ان میں سے مشہور علماء کے نام یہ ہیں:

امام زہری، عبیداللہ بن عمرو بن الحق، ابن عجلان، ابن ابی ذئب، مالک، حماد سلیمان بن بلال، سعید بن ابی ہلال، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابوغسان المدنی، ہشام بن سعد، وہیب بن خالد، ابوصخر حمید بن زیاد الخراط، اسامہ بن زید لیثی (۱)۔ ثقاہت کے اعتبار سے ان کی روایتیں معتبر ہوتی تھیں۔ امام احمد بن حنبل، ابوحاتم، عجلی، اور امام نسائی انہیں ''ثقہ'' کہتے ہیں۔ ابن حبان نے بھی ان کا شمار ثقات میں کیا ہے۔ (۲)

فقہ:

فقہ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

"وکان فقیہ النفس مناقب ابی حازم کثیرۃٌ وکان فقیھًا ثبتاً کثیر العلم کبیر القدر." (۳)

''سلمہ نفس کے فقیہ تھے ان کے مناقب بہت ہیں اور وہ فقیہ معتبر تھے ان کا علم بہت اور ان کا مرتبہ بڑا تھا۔''

علامہ نووی انہیں **"الفقیہ المشہور بالمحاسن"** لکھتے ہیں: اس کمال تفقہ کے باعث ہی چند دنوں تک وہ مدینہ کے قاضی رہے تھے۔ (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴

وعظ:

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہ مستقلاً وعظ بھی کہتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی دونوں انہیں ''القاص الواعظ'' (قصہ گو اور واعظ) لکھتے ہیں۔

وسیلۂ معاش:

اتنے بڑے عالم کامل ہونے کے باوجود کھجوروں کی تجارت کر کے معاش حاصل کرتے تھے۔ (۱)

زہد و عبادت:

وہ جس طرح علماءِ مدینہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے زہد و عبادت کے لحاظ سے بھی ان میں ممتاز تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں ''سلمہ مدینہ کے مشہور عابد و زاہد تھے۔ (۲)

امراء و سلاطین سے استغناء:

خودداری کا عالم یہ تھا کہ امراء و سلاطین سے الگ تھلگ رہتے تھے، خود جانا تو در کنار بلائے بھی جاتے تب بھی نہیں جاتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہری کی وساطت سے خلیفۂ وقت سلیمان بن عبدالملک نے ان کو بلایا تو آپ نہیں گئے اور یہ کہلا بھیجا ''اگر اس کو مجھ سے کچھ کام ہے تو اسے میرے پاس آنا چاہئے۔ رہا میں تو مجھ کو اس کی طرف کوئی حاجت نہیں ہے۔

حکمت مآبی:

ان اخلاقی و علمی کمالات کے ساتھ قدرت نے انہیں حکمت و فرزانگی سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کہتے ہیں ''میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کے منہ سے حکمت بہ نسبت ابوحازم کے زیادہ قریب ہو۔ (۳) ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ سلمہ کی برابر کسی شخص کے پاس حکمت و وعظ کی باتیں نہیں تھیں۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵۔ (۴) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۸۔

اقوالِ حکیمانہ:

آپ کے بعض حکیمانہ مقولے مشہور ہیں جن کو حافظ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے ان سے آپ کی حکمت کا اندازہ ہوسکتا ہے، فرماتے ہیں ''ہر وہ عمل جس کی وجہ سے موت کا خوف کیا جاتا ہوا سے ترک کردو، پھر تم جب مروگے تو موت تمہیں ضرر نہیں پہنچائے گی۔'' ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کے اور اپنے تعلق کو درست رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسرے بندگانِ خدا کے درمیانی تعلقات کو بہتر بنادیتا ہے۔ اور جو شخص اپنے اور اللہ کے تعلق کو خراب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسرے بندوں کے تعلقات کو خراب کردیتا ہے، ایک شخص کے ساتھ رکھ رکھاؤ رکھنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام اشخاص کے ساتھ نباہ کی کوشش کی جائے۔'' ایک مرتبہ خلیفہ ہشام نے آپ سے دریافت کیا ''میں امورِ سلطنت کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوسکتا ہوں؟ فرمایا ''یہ تو بہت آسان ہے، ہر چیز کو اس کے جائز طریقہ سے حاصل کرو اور پھر جائز مصارف میں ہی خرچ کرو۔'' ہشام بولا ''یہ تو صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیقِ خاص سے خواہشاتِ نفس سے بری رکھا ہو۔ (۱)

وفات:

۱۴۹ھ میں وفات پائی۔ (۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ و ۱۲۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ص ۱۲۶۔

عبداللہ بن عون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبداللہ نام ابوعون کنیت، عبداللہ بن درہ کے غلام تھے۔

پیدائش:

''سیل جارف'' سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ (۱)

فضل وکمال:

کوفہ کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں میں نے ایوب، یونس، تیمی اور ابن عون جیسے فضلا کسی ایک شہر میں یکجا نہیں دیکھے۔ (۲) حضرت شعبہؒ فرماتے تھے ''میں نے ابن عون، ایوب اور یونس جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے کہ عراق میں ابن عون سے زیادہ سنت کو جاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ہشام بن حسان کہتے تھے ''میری دونوں آنکھوں نے ابن عون جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ (۳) حافظ ذہبی ان کے علم وفضل کی داد ان لفظوں میں دیتے ہیں:

"لابن عون جلالة مجيبة ووقع في النفوس لانه كان اماماً في العلم راسًا في التاله و العبادة حافظا لانفاسه كبير الشان." (۴)

''ابن عون کی بڑی شان اور دلوں میں بڑی وقعت تھی، کیونکہ وہ علم میں اور عبادت وخدا پرستی میں سردار تھے اپنے انفاس کی حفاظت کرتے تھے (یعنی بیکار وقت ضائع نہیں کرتے تھے اور بلند شان والے تھے۔''

ابن عماد حنبلی انہیں امام اور شیخ **اهل البصرة وعالمهم** لکھتے ہیں۔ (۵)

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۷۔

(۳) یہ سب اقوال تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷ و ۱۴۸ سے ماخوذ ہیں۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸۔

(۵) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰۔

حدیث:

ابن عون بصرہ کے رہنے والے تھے۔ مگر علم حدیث کے شوق میں انہوں نے مختلف شہروں کے ائمہ حدیث سے کسبِ فیض کیا تھا اور متعدد مراکز حدیث کے موتیوں کو اپنے دامانِ طلب میں جمع کرلیا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے پاس احادیث کا ایسا عمدہ ذخیرہ اکٹھا ہوگیا تھا جو کسی کے پاس نہیں تھا، ابن مدائنی فرماتے ہیں ''ابن عون کے پاس ایسی عمدہ اسانید جمع ہوگئی تھیں جو ان کے کسی ساتھی کے پاس نہیں تھیں، انہوں نے مدینہ میں قاسم اور سالم سے بصرہ میں حسن بصری اور محمد بن سیرین سے، کوفہ میں شعبی اور نخعی سے مکہ میں عطاء اور مجاہد سے، شام میں مکحول اور رجاء بن حیوۃ سے سماع حدیث کیا تھا۔ (۱) یعنی وہ اس عہد کے تمام بڑے بڑے سرچشمہائے علم وفضل سے سیراب ہوئے تھے۔

ان بزرگان حدیث کے علاوہ انہوں نے جن سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حافظ ابن حجر نے ان کی ایک طویل فہرست دی ہے، ان میں سے بعض نام یہ ہیں۔

ثمامہ بن عبداللہ بن انس، انس بن سیرین، ابراہیم النخعی، زیاد بن جبیر، امام شعبی، سعید بن جبیر، موسیٰ بن انس بن مالک، ہشام بن زید بن انس اور حضرت نافع رحمہم اللہ۔

ان اکابرِ اسلام کے فیض نے ابن عون کو بصرہ کا مرجع علم بنادیا تھا۔ وہیب کہتے تھے بصرہ کا امر صرف چار لوگوں پر منحصر تھا۔ ایوب، یونس، تیمی، ابن عون۔ (۲)

علامہ ابن سعد انہیں ثقۃ کثیر الحدیث لکھتے ہیں: (۳) ابن مبارک کہتے تھے میں نے جن جن لوگوں کا تذکرہ سنا تھا، ملاقات کے بعد سب کو کمتر پایا، بجز ابن عون، سفیان اور حیوۃ کے، پھر ان تینوں میں بھی ابن عون کا حال یہ تھا کہ میں چاہتا تھا کہ ان کے دامن سے وابستہ ہوجاؤں اور اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک کہ میں نہ مرجاؤں۔ ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں اور اپنے عہد کا سردار کہتے ہیں۔ امام نسائی ایک جگہ انہیں ثقۃ مامون اور دوسرے مقام پر ثقۃ ثبت کہتے ہیں۔ حضرت شعبہ فرماتے ہیں کہ ''ابن عون مجھ سے کوئی روایت بیان کریں اور فرمائیں ''میرا گمان ہے کہ میں نے یہ سنا ہے یہ بالیقین مجھ کو زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اس روایت کو ان کے علاوہ کسی دوسرے ثقہ سے سنوں۔'' (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۷۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۶۔

(۳) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۴۔ (۴) تہذیب التہذیب۔

ان پر لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ عثمان بتی کہتے تھے ''کسی شخص کی شہادت اس کے باپ کے حق میں جائز نہیں ہے لیکن ابن عونؒ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (۱)

احتیاط فی الحدیث:

کمال علم و فضل اور نہایت ثقاہت کے باوجود وہ روایتِ حدیث میں بڑی احتیاط کرتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے راستہ چلنا بند کر دیا تھا۔ بکار بن محمد کا بیان ہے کہ حضرت ابن عون نے مجھ سے کہا کہ '' بھتیجے لوگوں نے میرا راستہ بند کر دیا ہے۔ میں اپنی ضرورت کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں آ جا سکتا ہوں۔'' بکاء کہتے ہیں اس سے ابن عونؒ کی مراد یہ تھی کہ لوگ ان سے حدیثیں پوچھتے تھے۔ (۲) احتیاط کا یہ عالم تھا کہ احادیث بیان کرتے بھی تھے تو ہر ایک شخص کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے بلکہ جن کو صاحبِ ذوق وصلاحیت سمجھتے تھے ان کو احادیث سناتے تھے۔ بکار کا بیان ہے کہ ابن عون کے صرف چند مخصوص بھائی تھے جن کے سامنے وہ احادیث بیان کرتے تھے اور جماعت کو سماعِ حدیث کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ (۳)

محمد بن سیرین ایک مرتبہ ان کے پیچھے چلنے لگے، غالباً سماعِ حدیث کے لئے ابن عون نے پوچھا ''تمہیں کچھ کام ہے؟ بولے نہیں'' فرمایا'' تو پھر واپس چلے جاؤ''۔

محمدؒ کے ساتھ ابن عونؒ خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ابن عونؒ انہیں احادیث سناتے۔ جس کو وہ کہہ دیتے کہ کیا عمدہ ہے، اسے بیان کرتے تھے۔ اور جس پر وہ یہ نہیں کہتے تھے اسے بیان نہیں کرتے تھے۔ (۴)

خشوع:

احادیث بیان کرتے وقت ایک خاص قسم کا خشوع وخضوع اس خیال سے طاری ہو جاتا تھا کہ کہیں انہوں نے حدیث میں زیادتی یا کمی نہ کر دی ہو، اس خشوع کا یہ عالم ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آ جاتا تھا۔ (۵)

---

(۱) حاشیہ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۸۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔ (۳) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔

(۴) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔ (۵) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔

تلامذہ:

روایت میں بڑے محتاط تھے،اس کے باوجود ان کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا،اوراس سے بڑے بڑے ائمہ حدیث پیدا ہوئے۔مثلاً حضرت اعمشؒ ،سفیان ثوری ،شعبہ اور ابن مبارکؒ عام تلامذہ میں قابل ذکر یہ ہیں۔

داؤد بن ہند، یحییٰ القطان، بشر بن المفضل ،ازہر بن سعد السمان، معاذ بن معاذ نضر بن شمیل، یزید بن ہارون، ابوالعاصم، محمد بن عبداللہ (رحمہم اللہ)۔

زہدوورع:

علم وفضل کے ساتھ حضرت ابن عونؒ کے مکارم اخلاق کا طغرائے امتیاز زہد وورع تھا۔ بکار بن محمد کا بیان ہے کہ ''میں نے ابن عونؒ کو کبھی کسی سے مذاق کرتے، شعر پڑھتے، اور جھگڑتے نہیں دیکھا۔انہیں اپنے کام سے کام تھا۔ (۱)

قرہ کہتے تھے''ہم ابن سیرین کے زہد وورع پر تعجب کرتے تھے مگر ابن عونؒ نے تو ان کی یاد بھی بھلادی۔''امام اوزاعیؒ فرماتے تھے''ابن عونؒ اور سفیانؒ کی وفات کے بعد تو سب لوگ برابر ہوگئے۔'' (۲) ابن حباب کا بیان ہے کہ''ابن عون عبادت و ریاضت، زہد وورع، سنت کی پابندی، اربابِ بدعت پر تشدد اور فضل وکمال کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے سردار تھے۔ (۳) علم کی ذمہ داری شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے، فرماتے تھے''میں چاہتا ہوں کہ علم کی ذمہ داری سے برابر سرابر عہدہ برا ہو جاؤں۔'' (۴) ورع کا یہ عالم تھا کہ کبھی سچی یا جھوٹی قسم نہیں کھائی۔

عقیدہ میں تشدد:

صحابۂ کرامؓ کے پاک اور صاف عقائد کے سختی کے ساتھ پابند تھے اور ان میں مبتدعانہ خیالات کی آمیزش کو پسند نہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ ان کے سامنے فرقہ ''قدریہ'' کا ذکر آیا تو فرمانے لگے''میری عمر اس عقیدہ کی عمر سے زیادہ ہے۔ میں نے دو شخصوں معبد الجہنی اور سنہویہ کے علاوہ اسلاف میں کسی کو اس کا ذکر کرتے نہیں سنا۔اس طرح کے خیالات رکھنا شر ہے۔ (۵) وہ ایسے لوگوں کو سلام تک کرنے کے روادار نہیں تھے۔ (۶)

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۴۷و ۱۴۸۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۸۔

(۴) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔ (۵) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۷ (۶) ایضاً ص ۲۵۔

عبادت:

اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ جتنا وقت بچتا تھا اس کا بیشتر حصہ عبادت میں گزار دیتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتے اور ذکر اللہ کرتے رہتے تھے۔ آفتاب کے طلوع ہو جانے پر نماز پڑھتے اور پھر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھتے، اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ غسل کر کے بہترین لباس زیب تن فرماتے خوشبو لگاتے اور نماز جمعہ کے لئے نہ تو بہت پہلے جاتے اور نہ بالکل اخیر میں، بلکہ ہر امر میں اعتدال مرعی رکھتے تھے۔ جامع مسجد کبھی پا پیادہ آتے اور کبھی سواری پر آتے تھے، جمعہ کے فرض مسجد میں پڑھتے تھے اور سنن ونوافل گھر پر پڑھتے تھے۔ رمضان میں عبادت اور بڑھ جاتی تھی، فرض نماز باجماعت پڑھ کر گھر چلے جاتے اور تنہائی میں عبادت کرتے یہ ان کا معمول تھا جس میں وفات کے وقت تک فرق نہیں آیا۔ [1]

لہسن سے اجتناب:

لہسن سے منہ میں ایک طرح کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عونؒ عبادت زیادہ کرتے تھے، اس لئے وہ لہسن سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ ان کو اگر کسی کھانے میں لہسن کا اثر بھی محسوس ہو جاتا تھا تو اس کو نہیں چکھتے تھے۔

جہاد فی سبیل اللہ:

زہد وعبادت کے ساتھ ان میں جہاد کا بھی بڑا ولولہ تھا۔ خاص اسی مقصد کے لئے انہوں نے ایک اونٹنی پال رکھی تھی۔ علامہ ابن سعدؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے ایک رومی سے جنگ کر کے اس کو قتل کر دیا تھا۔

احسان میں اخفاء:

لوگوں پر احسان کرتے تھے، مگر بڑے اخفاء کے ساتھ۔

اخلاق:

عام لوگوں کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، حلم اور بردباری میں نمایاں مقام

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶ وتذکرۃ الحفاظ۔

رکھتے تھے۔ایک مرتبہ ان کے غلام نے ان کی ناقہ کے چہرہ پر ماردیا جس سے اس کی آنکھیں نکل آئیں۔ابن عون نے ناقہ کو اس حال میں دیکھا تو غلام سے صرف یہ فرمایا'' کیا مارنے کے لئے ناقہ کا صرف چہرہ ہی رہ گیا تھا۔اللہ تجھ کو برکت دے۔تو میرے پاس سے چلا جا، جا تو آزاد ہے''

بکار کا بیان ہے کہ میں نے ابن عونؒ کے ساتھ عرصہ دراز تک مصاحبت کی ہے میں نے کسی شخص کو ان سے زیادہ زبان پر قابو رکھنے والا نہیں دیکھا۔وہ اپنی لونڈی غلاموں بلکہ مرغی بکری تک کو برا بھلا نہیں کہتے تھے۔

لونڈی غلام تو پھر بھی اپنے ہی تھے۔وہ دشمنوں کو بھی برا نہیں کہتے تھے۔ابن عونؒ نے ایک عربی عورت سے شادی کرلی تھی، اس جرم میں بلال ابن بردہ نے ان کو زدوکوب کرایا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے بلال کے متعلق کبھی ایک حرف برا نہیں کہا۔ایک مرتبہ بعض لوگوں نے کہا کہ بلال نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا'' ایک آدمی مظلوم ہوتا ہے مگر پھر وہی ظلم کی شکایت کر کے ظالم بن جاتا ہے۔تم میں سے کوئی بھی بلال کے متعلق اتنا سخت نہیں ہے جتنا کہ میں ہوں۔لیکن میں اس کے ظلم کی شکایت کر کے ظالم نہیں بنوں گا۔''

پہلے گزر چکا ہے کہ ابن عونؒ لہسن بالکل نہیں کھاتے تھے۔بکار بن محمد کی ایک باندی عینا حضرت ابن عون کی خدمت کرتی تھی۔ایک مرتبہ اس نے آپ کے لئے کھانا تیار کیا جس میں لہسن ڈال دیا۔حضرت ابن عون کے سامنے کھانا آیا تو لہسن کی بو سونگھ کر کھانے سے دستکش ہو گئے اور ناگواری طبع کے باوجود اس سے صرف یہ کہا'' اللہ تم کو برکت دے۔تم اس کھانے کو میرے پاس سے اٹھالو' عینا کہتی ہے کہ میں نے کھانا تو اٹھالیا مگر ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے اور بھاگ کر میں نے سیرین کے گھر میں پناہ لی۔''(۱)

علالت:

آپ کو ذاتِ نبویؐ کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی، بڑی آرزو رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ خواب میں ہی جمال جہاں افروزِ نبویؐ کے دیدار سے شادکام ہو جائیں ان کی یہ تمنا برآئی اور وہ خواب میں دیدار جمالِ نبویؐ سے مشرف ہوئے۔اس شرف پر ایسے وارفتہ ہوئے کہ بالا خانہ سے اتر کر مسجد میں آنا چاہتے تھے کہ گر پڑے۔پیروں میں چوٹ آئی، مگر آپ نے اس کا علاج نہیں کرایا۔

---

(۱) یہ سب واقعات ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶، ۲۷، ۲۸ سے ماخوذ ہیں۔

وفات:

آخرکار یہ چوٹ ہی مرض الموت کا سبب بن گئی۔ آپ بیماری میں نہایت صابر وشاکر رہتے تھے زبان پر حرفِ شکایت نہیں لاتے تھے۔ بکار بن محمد کہتے ہیں ''ابن عونؒ بیماری کی حالت میں شیر سے زیادہ شاکر رہتے تھے۔'' آخر سانس تک قبلہ رو ہو کر خدا کا ذکر کرتے رہے۔ انجام کار اس قیدِ ہستی سے نجات پائی اور ۱۵۱ھ میں واصل الی اللہ ہو گئے۔

جنازہ:

جنازہ اٹھا تو اس شان سے کہ بے شمار خلقت شریکِ جنازہ تھی۔ مسجد کا صحن اور اس کی عمارت ناکافی ثابت ہوئی اور محراب میں رکھ کر نماز پڑھائی گئی۔

بارگاہِ نبوتؐ میں مقبولیت:

حضرت ابن عونؒ کو ذاتِ نبوی کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی تھی اس کی مقبولیت کی سند یہ ہے کہ ابن عونؒ کی زندگی میں بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں ''ابن عونؒ کی زیارت کرو۔''

ترکہ:

ترکہ میں نقد روپیہ کچھ نہیں چھوڑا، صرف دو مکان تھے، مرض الموت میں پانچویں حصہ کی وصیت اعزاء کے لئے کر گئے تھے۔ دس ہزار کا قرض چھوڑا تھا۔ اس کو ادا کرنے کے بعد وصیت پوری کر دی گئی۔

حلیہ:

خدا نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی دیا تھا۔ پھر مزاج بھی لطیف ونفیس پایا تھا۔ نرم اور باریک کپڑے پہنتے تھے اور خوشبو کا استعمال کثرت سے کرتے تھے پورا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلتے تھے۔ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے تو خادم تولیہ پیش کرتا اور آپ اس سے ہاتھ منہ صاف کرتے تھے۔ [1]

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶۔۲۹۔۳۹۰۔

عمرو بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عمرو نام، ابو محمد کنیت۔ باذان کے غلام تھے۔

پیدائش:

۴۶ھ یا اس کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

علم وفضل:

حضرت عمروؒ اس عہد کے اکثر دوسرے علماء وفضلاء کی طرح اگرچہ غلام تھے، لیکن اسلام نے غلاموں کو کسبِ فضل وکمال کے جو مواقع عنایت فرمائے ہیں، حضرت عمروؒ اس کی ایک روشن مثال تھے۔ اکابرِ امت ان کی جلالتِ علم کے مقر ہیں۔ حافظ ذہبی انہیں الحافظ الامام اور عالم الحرم لکھتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں: ''ان کی جلالت امامت اور ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے وہ ائمہ تابعین میں سے تھے''

حضرت عمرو بن دینارؒ کا علم نہایت وسیع تھا اور اس کی شہرت دور دور تھی۔ طاؤس نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے کو ہدایت کی کہ ''مکہ جاؤ تو عمرو بن دینارؒ سے ضرور ملنا ان کے کان علماء کے لئے خریطہ ہیں'' (کہ جو سنتے ہیں سب سینہ میں محفوظ کر لیتے ہیں) [1] ابن مہدی کہتے ہیں: حضرت شعبہ فرماتے تھے ''میں نے عمرو بن دینارؒ ایسا کوئی نہیں دیکھا۔'' [2]

حدیث:

حدیث ان کا خاص فن تھا۔ علامہ ذہبی انہیں حافظ حدیث تسلیم کرتے ہیں اور علامہ ابن سعد فرماتے ہیں:

''کان عمرو ثقة ثبتا كثير الحديث.'' [3]

عمرو ثقہ تھے، ثبت اور کثیر الحدیث تھے۔

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۳۵۳۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷۔ (۳) ابن سعد ج ۷ ص ۳۵۴۔

صحابہ میں انہوں نے جلیل القدر اساطین امت سے فیض حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، ابوالطفیل، سائب بن یزید رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور تابعین میں حضرت سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، طاؤس بن کیسان، عطاء بن ابی رباح، سالم بن عبداللہ، مجاہد، محمد بن علی۔ ابن ابی ملیکہ، سلیمان بن یسار اور امام زہریؒ وغیرہ سے حدیث سنی تھی۔

تلامذہ:

جنہوں نے ان سے استفادہ کیا ان میں زیادہ مشہور اور قابل ذکر یہ ہیں: ابن جریج دونوں حماد، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری اور ورقاء۔

مرویات کا پایہ:

ثبت اور ثقاہت کے لحاظ سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مسعر سے کسی نے ان کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: ثقۃ ثقۃ ثقۃ۔ حضرت شعبہ فرماتے ہیں ”میں نے ان سے زیادہ صاحب تثبت کوئی نہیں دیکھا۔[1] سفیان نے ایک مرتبہ سعد سے پوچھا ”آپ نے حدیثوں میں سب سے زیادہ متقن کس کو پایا؟“ فرمایا عمرو بن دینار، اور قاسم بن عبدالرحمٰن کو۔“ ابن عیینہ اور جریر انہیں ثقۃ ثبت صدوق کثیر الحدیث کہتے تھے۔[2]

حضرت عمرو بن دینار کی ذات مشتاقانِ حدیث کے لئے مرکز توجہ تھی لوگ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر ان کی روایات لکھتے تھے۔ سفیان فرماتے ہیں۔ ”ایوب مجھ سے پوچھتے تھے کہ عمرو بن دینارؒ نے فلاں شخص سے کیا کیا حدیثیں بیان کی ہیں میں ان کو بتانے کے بعد پوچھتا ”کیا آپ لکھنا چاہتے ہیں“ وہ کہتے ”ہاں“۔“[3] سفیان فرماتے تھے ”جو حدیث میں عمرو بن دینارؒ سے سنتا ہوں وہ مجھ کو اس حدیث سے زیادہ محبوب ہے جس کو بیس آدمیوں سے سنوں۔“[4]

روایت بالمعنی:

غایت احتیاط فی النقل کی وجہ سے وہ بسا اوقات روایت بالمعنیٰ کرتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں ”وکان یحدث علی المعنی“[5]

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ص ۱۰۶۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۰۔ (۳) ابن سعد ج ۷ ص ۳۵۳۔
(۴) تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ق ۱ ص ۲۷۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷۔

احتیاط:

حضرت عمرو بن دینار خاص خاص تلامذہ کو احادیث قلمبند کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت سفیان فرماتے ہیں "میں نے ایوب کے لئے اطرافِ حدیث لکھی تھیں پھر ان سے متعلق میں نے عمرو بن دینارؒ سے سوال کیا۔ لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر لکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ معمر کہتے ہیں 'ایک مرتبہ میں نے عمرو بن دینار سے سنا، فرمارہے تھے "لوگ ہم سے ہماری رائے دریافت کرتے ہیں، ہم ان کو بتادیتے ہیں، وہ اس کو پتھر کی لکیر جان کر قلمبند کرلیتے ہیں (حالانکہ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ) ممکن ہے ہم اس سے رجوع کرلیں۔" ایک دفعہ کسی نے ان سے کہا کہ "سفیان لکھتے ہیں" آپ یہ سن کر لیٹ گئے اور رونے لگے اور فرمایا "جو شخص مجھ سے سن کر لکھتا ہے وہ مجھے تنگی میں مبتلا کرتا ہے۔" سفیان کہتے ہیں "یہ سن کر میں نے وہ بات نہیں لکھی جس کو ہم یاد کرسکتے ہوں۔" (۱)

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ علامہ نووی ان کو مجتہد اصحاب مذہب میں شمار کرتے ہیں۔ (۲) ابن ابی نجیح کہتے ہیں "میں نے عمرو بن دینارؒ سے زیادہ فقیہہ کسی کو نہیں دیکھا، نہ طاؤس کو اور نہ عطاء و مجاہد کو۔ ابن ابی عیینہؒ فرماتے ہیں:

"ماكان عند نا افقه ولا اعلم ولا احفظ من عمرو بن دينار." (۳)

"ہمارے پاس عمرو بن دینار سے بڑا نہ کوئی فقیہ تھا نہ عالم اور نہ زیادہ حفظ حدیث والا۔"

مرکز علم مکہ کے مفتی (۴) لیکن اس کمال تفقہ کے باوجود فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ کسی مسئلہ میں اگر انہیں ذرا بھی شک ہوتا تھا تو اس کے متعلق لب کشائی کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے کسی چیز کی نسبت کوئی سوال کیا، آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سائل بولا "میرے دل میں اس مسئلہ کے بارے میں چند شبہات ہیں" آپ نے فرمایا "بخدا تمہارے دل میں ابوقبیس (پہاڑ) کی مانند کسی شک کا ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میرے دل میں بال برابر بھی شک ہو (یعنی مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے۔ (۵)

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ص ۳۵۳۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ قسم اول ص ۲۷۔
(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۰۔ (۵) ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳

عبادت:

علم وفضل میں نمایاں مقام رکھنے کے ساتھ بڑے عبادت گزار بھی تھے۔ وہ رات کے ایک حصہ میں سوتے تھے، ایک تہائی شب درس حدیث میں بسر کرتے تھے اور ایک تہائی رات نماز پڑھتے رہتے تھے۔ (۱)

جماعت کی پابندی:

نماز جماعت کے بڑے پابند تھے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں جبکہ نہایت درجہ ضعف و نقاہت کی وجہ سے اپاہج ہو گئے تھے، گدھے پر سوار ہو کر مسجد جاتے تھے جو ان کے مکان سے کافی فاصلہ پر تھی، پھر گدھے پر بھی خود سوار نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ان کا کوئی خادم یا شاگرد سوار کرتا تھا۔ سفیان کا بیان ہے کہ عمرو بن دینارؒ کسی حالت میں بھی مسجد میں آنا ترک نہیں کرتے تھے۔ ان کو گدھے پر سوار کر کے لے جایا جاتا تھا اس وقت میں کمسنی کی وجہ سے انہیں اٹھا نہیں سکتا تھا۔ پھر میں بڑا ہو کر ان کے اٹھانے پر قادر ہو گیا، ان کا گھر مسجد سے دور تھا۔ (۲)

خلوص وللہیت:

خلوص وللہیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی مذہبی وعلمی خدمات پر کسی قسم کا کوئی معاوضہ یا وظیفہ لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں ''ایک مرتبہ ابن ہشام نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کا وظیفہ جاری کیے دیتا ہوں آپ اطمینان سے گھر بیٹھے ہوئے فتویٰ دیتے رہیے۔ میں نے کہا'' کہ میں ایسا نہیں چاہتا۔'' چنانچہ وہ اخیر دم تک یونہی بلا معاوضہ خدمات انجام دیتے رہے۔ (۳)

سادگی:

مزاج میں بے حد سادگی تھی، کبرسن کے باعث سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے لیکن آپ نے خضاب لگانا پسند نہیں کیا۔ (۴)

وفات:

۱۲۶ھ میں وفات پائی، آپ کے بعد افتاء کی خدمت عبداللہ بن ابی نجیح کے سپرد ہوگئی۔ اس وقت آپ کی عمر اسی برس کی تھی۔ (۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳۔ (۳) ایضاً۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷۔ (۵) ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۴۔

سلیمان بن طرخان تیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

سلیمان نام، ابو معتمر کنیت۔ نساً مری تھے، بنو تیم میں بسلسلۂ غلامی سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی وجہ سے حافظ ذہبی انہیں مولاہم البصری، اور ابن عماد الحنبلی انہیں ''التیمی القیسی'' لکھنے کے بعد ''مَوْلَاهُمْ'' لکھتے ہیں۔

علم وفضل:

علم وکمال کے اعتبار سے وہ بصرہ کے علماءِ اعلام میں سے تھے۔ حافظ ذہبی اور ابن عماد الحنبلی انہیں حافظ، امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (۱)

حدیث:

حدیث کے ممتاز حافظ تھے۔ ابن سعد فرماتے ہیں۔ ''وکان ثقة کثیر الحدیث'' اس عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے حفظ واتقان کے معترف ہیں۔ حضرت سفیان فرماتے تھے بصرہ کے حفاظ میں ہیں۔ سلیمان التیمی، عاصم الاحول، داؤد بن ابی ہند۔

شیوخ:

صحابۂ کرام میں انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ اور تابعین میں حسن بصری، ابو عثمان، طاؤس، اعمش، قتادہ، اور ابو اسحاق سبیعی سے استفادہ کیا تھا۔

تلامذہ:

ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا، ممتاز تلامذہ یہ ہیں: شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابن المبارک، یزید بن ہارون اور ہوذہ بن خلیفہ۔ ابن علیہ، ابراہیم ابن سعد، جریر وغیرہم۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲ و شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۱۲۔

مرویات کا پایہ:

ثقاہت کے اعتبار سے وہ مسلم تھے، شعبہ کا بیان ہے کہ "میں نے سلیمان سے زیادہ کوئی سچا نہیں دیکھا، وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان کا رنگ بدل جاتا تھا۔" (۱)

حافظ ذہبی نے ان کی مرویات کی تعداد دو سو بتائی ہے۔ (۲)

عبادت و ریاضت:

حضرت سلیمانؒ کا اصل طغرائے امتیاز عبادت و ریاضت تھا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "و کان من العباد المجتھدین" ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں:

"و کان عابدًا صوامًا قانتاً للہ قواماً." (۳)

"سلیمان عابد، صائم النہار، خدا کے مطیع و فرمانبردار اور قائم اللیل تھے۔"

رات رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ صبح کی نماز رات کے وضو سے ہی پڑھتے تھے۔ ان کے صاحبزادے معتمر اور وہ خود رات میں مسجدوں کا چکر لگا کر کبھی نماز کسی مسجد میں پڑھتے اور کبھی کسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ صبح تک یہی کرتے رہتے تھے۔ (۴)

سعید بن عامر الضبعی کا بیان ہے کہ ہر سجدہ میں ستر مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ عصر سے مغرب تک تسبیح پڑھتے رہتے تھے، نماز کے علاوہ روزوں کا بھی حال یہی تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ روزہ رکھتے تھے، اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔

صدقہ و خیرات:

صدقہ و خیرات کثرت سے کرتے تھے۔ جریر کہتے ہیں "سلیمان پر کوئی ساعت ایسی نہیں آتی تھی کہ وہ اس میں خیر خیرات نہ کرتے ہوں۔ اگر صدقہ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا تو دو رکعت نماز ہی پڑھ لیتے تھے۔" غرضیکہ وہ خدا کی اطاعت اور بندگی سے کسی وقت بھی خالی نہیں ہوتے تھے۔ حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ "جب کبھی بھی سلیمان کے پاس ایسے وقت آتے جبکہ خدا کی عبادت کی جا سکتی، تو ہم انہیں خدا کی عبادت کرتے ہوئے ہی پاتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان میں معصیت کا مادہ ہی نہیں ہے۔"

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۰۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲۔

(۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۱۲۔ (۴) ابن سعد ج ۷۔ ق ۲ ص ۱۸۔

مواخذہ کا ڈر:

اس قدر زہد و عبادت کے باوجود مواخذۂ آخرت سے ہمیشہ خائف رہتے تھے ان سے کسی نے کہا ''سلیمانؒ! آپ تو آپ ہی ہیں۔ آپ کے مثل کون ہوگا؟ بولے ''ایسا نہ کہو، مجھ کو نہیں معلوم میرے رب کی طرف سے آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔ اس نے خود فرمایا ہے ''وبدالھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون'' اللہ کی طرف سے ان کے لئے وہ بات ظاہر ہوگی جس کا انہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔

قدریہ سے نفرت:

الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ان کا شعار تھا۔ اس بنا پر قدریہ فرقہ سے بہت بغض رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں رونے لگے۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا: ''ایک دفعہ میں نے ایک قدری کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے سلام کر لیا تھا۔ اب ڈرتا ہوں کہ کہیں اس پر مواخذہ نہ ہو۔'' حضرت سلیمان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ کوئی شخص ان کے پاس حدیث سننے کے لئے آتا تو وہ پہلے اس کا امتحان لیتے اس سے دریافت فرماتے کہ کیا زنا کا فعل بہ تقدیر الٰہی ہے؟'' وہ کہتا ''ہاں'' پھر آپ اس سے اس پر قسم لیتے اور اگر وہ قسم کھا لیتا تو آپ اسے پانچ احادیث سناتے تھے۔

نکتہ وری:

ہر زمانہ میں ایسے افراد رہے ہیں جو مذہب کے معاملہ میں خصوصاً سہولت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کسی خاص امام کی تقلید یا کسی خالص عالم کے مسلک کی پیروی پسند نہیں کرتے۔ بلکہ جس امام کے مسلک میں انہیں جو بات آسان معلوم ہوتی ہے۔ اسے اختیار کر لیتے ہیں اور دل کی تسلی کے لئے عذر یہ کر دیتے ہیں کہ ہر امام برحق ہے۔ اس قسم کے سہولت پسند افراد سے متعلق حضرت سلیمان التیمی نے کیا عجیب دیدہ ورانہ بات کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔''

''اگر تم ہر عالم کی رخصت یا اس کی لغزش کو اختیار کرنے لگو گے تو تم میں تمام شر ہی شر پیدا ہو جائیگا۔[1]

وفات:

ماہ ذوالقعدہ ۱۴۳ھ میں وفات پائی اس وقت ستاون (۵۷) سال کی عمر تھی۔[2]

---

(۱) صدقہ وخیرات کے عنوان سے یہاں تک کی سب معلومات تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۱۴۲و۱۴۳ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) ابن سعد ج ۷ ق ۲ص ۱۸ و تذکرۃ الحفاظ وتھذیب التھذیب ج ۴ص ۲۰۱۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

حسن نام، ابو سعید کنیت، والد کا نام یسار تھا۔

غلامی:

ان کے والدین غلام تھے، اس بارہ میں روایتیں مختلف ہیں۔ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد میسان کے قیدیوں میں سے تھے۔ربیع بنت نضرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا، دوسری روایت میں یہ ہے کہ ان کے والدین ایک انصاری کی غلامی میں تھے، انہوں نے بیوی کے مہر میں بنو سلمہ کو دے دیا تھا، جنہوں نے ان کو آزاد کر دیا تیسری روایت یہ ہے کہ ان کے والد زید بن ثابتؓ کے غلام تھے اور ان کی والدہ جن کا نام خیرہ تھا ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں۔ (1) اور واقعات مابعد سے معلوم ہوگا کہ یہی روایت زیادہ صحیح ہے۔

ولادت اور بچپن:

۲۲ھ (2) میں یعنی حضرت عمرؓ کی شہادت سے تقریباً دو سال پہلے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے ان کی والدہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں اس تقریب سے حضرت حسن کو ام سلمہؓ کے گھر میں تربیت پانے کا موقع ملا۔ان کی والدہ کسی کام سے باہر چلی جاتیں یا گھر میں ہی کسی کام میں مشغول ہوتی تھیں تو حضرت ام سلمہؓ حضرت حسنؒ کو دودھ پلا دیتی تھیں۔ (3)

---

(1) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۱۵۔

(2) حضرت بصری کی صحیح تاریخ ولادت کوئی نہیں لکھتا صرف اتنا لکھتے ہیں کہ عمرؓ کی خلافت کے ختم ہونے میں دو سال کی مدت باقی تھی کہ حضرت حسن پیدا ہوئے پھر حافظ ذہبی وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۱۰ھ میں حسن بصری کا انتقال ہوا تو ان کی عمر اس وقت اٹھاسی سال کی تھی اب اس میں اشکال یہ ہے کہ ۱۱۰ میں سے ۸۸ گھٹا دیئے جائیں تو ۲۲ھ نکلتا ہے۔اور حضرت عمرؓ کی وفات ذی الحجہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے اس لحاظ سے صرف ایک سال کا فرق رہتا ہے اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر کی شہادت ۲۱ھ کے آخری حصہ میں ہوئی تھی۔اور حضرت حسن بصریؒ ۲۲ھ کی اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ تھوڑی دنوں کا فرق ایسا کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔تقریباً دو برس کو رواۃ نے دو برس سے تعبیر کر دیا۔

(3) تہذیب الاسماء واللغات ج ا ق ا ص ۱۶۱

بلاشبہ یہ اتنا بڑا شرف ہے کہ کسی خوش نصیب کو ہی مل سکتا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ''حضرت حسنؒ میں جو غیر معمولی فصاحت اور حکمتیں پائی جاتی تھیں یہ سب اسی مقدس شیر خوارگی کے طفیل میں تھی۔''(۱)

حضرت ام سلمہؓ کے تعلق سے حضرت حسنؒ کو دوسری ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی آنے جانے کا موقع ملتا تھا، خود ان کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک جبکہ ان کی عمر تیرہ سال کی تھی وہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں میں بے تکلف آتے جاتے تھے۔

علم وفضل:

حضرت حسنؒ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ صحابہ کرام کی بڑی تعداد بقید حیات تھی پھر ان کی تربیت بھی ایسے مقام پر ہوئی تھی، جہاں دن رات علم ودین کے چرچے رہتے تھے اور خود ان کے اندر فطری استعداد وصلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم وعمل، فضل وکمال زہد واتقاء اور تمام اخلاقی وروحانی کمالات، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کا دامن پُر نہ ہو۔ علامہ ابن سعدؒ نے ان کے تمام اوصاف ایک سطر میں جمع کر دیئے ہیں فرماتے ہیں:

''کان عالماً رفیعًا ثقة حجة ماموناً عابدًا ناسکاً کثیر العلم فصیحًا جمیلًا وسیمًا۔'' (۲)

''حضرت حسنؒ عالم، بلند مرتبہ، معتمد، برہان، نیک خصلت، عبادت گزار، وافر العلم، فصیح، خوبصورت اور خوش رو تھے۔''

حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

''حافظٌ علامةٌ من بحور العلم فقیه النفس کبیر الشان عدیم النظیر ملیح التذکیر بلیغ الموعظة راسٌ فی انواع الخیر (۳)

حسنؒ حافظ، علامہ، علم کا سمندر، نفس کے فقیہ، بڑے شان والے، بے نظیر، پسندیدہ وعظ کہنے والے خوب نصیحت کرنے والے تمام انواع خیر میں سردار تھے۔

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات ج ا ق ا ص ۱۶۱۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۱۵۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۶۷۔

تفسیر:

تفسیر کی تعلیم انہوں نے بڑی محنت اور شوق سے حاصل کی تھی۔ ابوبکر الہذلی بیان کرتے ہیں "ایک دن مجھ سے سفاح نے دریافت کیا کہ تمہارے حسنؒ اس بلند مرتبہ کو کس طرح پہنچ گئے؟" میں نے کہا "انہوں نے بارہ برس کی عمر میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد وہ جب تک ایک سورۃ کی تفسیر و تاویل اور اس کی شان نزول معلوم نہیں کرلیتے تھے دوسری سورت نہیں پڑھتے تھے۔ (۱)

حدیث:

حدیث کی سماعت انہوں نے ان اساطین امت سے کی تھی جو مدینہ میں اس فن کے مرجع خلائق بزرگ تھے۔ صحابہ میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ ابوموسیٰ اشعریؓ عمران بن الحصینؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت معاویہؓ انسؓ، جابرؓ ان کے شیوخ تھے۔

بعض لوگوں کو حضرت حسن بصریؒ پر یہ اعتراض تھا کہ وہ تدلیس کرتے ہیں یعنی اپنے اصلی شیخ کا نام نہیں لیتے اور حدیث کو براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں یہ تھی کہ ان کے عہد میں حجاج کے مظالم اور اس کی سفاکیوں کا بڑا چرچا تھا، حضرت حسنؒ فرماتے ہیں "میں جس کسی حدیث میں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہتا ہوں، سمجھ لو کہ وہ میں نے حضرت علیؓ سے کی ہے لیکن (حجاج کی وجہ سے) میں ایک ایسے زمانہ میں ہوں کہ حضرت علیؓ کا نام نہیں لے سکتا۔" غالباً حضرت حسنؒ سے استفادہ کرنے والے اس راز کو جانتے تھے اور وہ ان کے ایسا کرنے پر پوچھ گچھ نہیں کرتے تھے۔ یونس بن عبید نے ان سے ایسا سوال کیا تو فرمایا "اے میرے بھتیجے آج تم نے مجھ سے ایک ایسی بات دریافت کی ہے جو آج تک کسی نے دریافت نہ کی تھی اور اگر تمہاری منزلت میرے دل میں نہ ہوتی تو میں اس بھید کو تم سے بھی بیان نہ کرتا۔" (۲)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۹۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶۔

اکابر علماء کی رائے:

بہر حال وہ بڑے بڑے علماء عصر کے نزدیک معتبر اور ثقہ تھے۔ اور وہ ان سے حدیثیں سنتے تھے۔ انس بن مالکؓ کہا کرتے تھے "حسنؒ سے دریافت کرو، ان کو سب کچھ محفوظ ہے اور ہم تو بھول گئے۔" عاصم الاحول کا بیان ہے "میں نے شعبی سے کہا کہ میں بصرہ جارہا ہوں، آپ کو وہاں کا کوئی کام ہو تو بتائیے" بولے "تم بصرہ پہنچو تو حسنؒ کو میری طرف سے سلام کہنا" میں نے کہا "میں تو ان کو پہچانتا نہیں ہوں" فرمایا "تم بصرہ میں داخل ہو تو دیکھنا وہاں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش رو اور پُر رعب کون ہے بس وہی حسن ہوں گے تم ان سے میرا اسلام کہہ دینا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں بصرہ کی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت حسنؒ کو دیکھا وہاں تشریف رکھتے ہیں اور لوگوں کا ایک جمِ غفیر ان کے اردگرد بیٹھا ہوا ہے۔ سلیمان التیمی کہتے تھے "حسنؒ شیخِ بصرہ ہیں" مطر الوراق کا قول تھا کہ جابر بن زید اہل بصرہ میں سب سے بڑے بزرگ مانے جاتے تھے، پھر جب حسنؒ آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ آخرت میں ہیں اور وہاں کی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے متعلق خبریں دے رہے ہیں۔"[1] عطا بن ابی رباح خود جلیل القدر محدث ہیں وہ فرماتے تھے "تم اس شخص (حسنؒ) کی طرف رجوع کیا کرو، وہ بہت بڑے عالم، امام اور مقتدا ہیں۔"[2]

تلامذہ:

علم و فضل کی اس عام شہرت کی وجہ سے ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔ ایوب، قتادہ، بکر بن عبداللہ مزنی، عطاء بن السائب، یونس بن عبید، منصور بن زاذان، مجاہد، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان۔[3]

فقہ:

تفسیر و حدیث کے علاوہ وہ فقہ کے بھی بڑے وسیع النظر امام تھے اور بصرہ کے مفتی بھی تھے۔ قتادہ کا بیان ہے "میں جس کسی فقیہ کے پاس بیٹھا میں نے دیکھا کہ وہ بھی حضرت حسنؒ کے فضل و کرم کا مرہون ہے" ایوب کہتے تھے "میں نے حسنؒ سے بڑا فقیہ کوئی نہیں دیکھا۔" بکر المزنی کہتے ہیں "جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے عالم کو دیکھے اس کو چاہیے

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۴ و ۲۶۵۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص تذکرہ حسن بصری۔

(۳) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۴

کہ حسن کو دیکھے کیونکہ ہمیں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو ان سے بڑا عالم ہو۔" حماد بن سلمۃ، یونس بن مبید اور حمید الطویل سے نقل کرتے ہیں کہ ہم نے فقہاء کو دیکھا لیکن حسنؒ سے زیادہ کسی کو مروت بس کامل نہیں پایا۔"

وسعت علم وحکمت:

ان علوم وفنون نے ان کو فضل وکمال اور حکمت وادب کا دریائے بے کنار بنا دیا تھا۔ ربیع بن انس سے منقول ہے، کہتے تھے:

"اختلفت الی الحسن عشر سنین او ماشاء اللہ فلیس من یوم الا اسمع منہ مالم اسمع قبل ذلک۔"

"میں حضرت حسنؒ کے پاس دس برس یا اس سے کم وبیش آتا جاتا رہا لیکن مجھ کو کوئی دن ایسا نہیں ملا جس میں میں نے ایسی بات سنی ہو جو میں اس سے پہلے سن چکا ہوں۔"

اعمشؒ کہتے ہیں "حسن حکمت کی باتیں خوب یاد کرتے تھے۔ پھر وہ ان کا اظہار کر ڈالتے تھے۔ حضرت ابوجعفر باقرؒ کے سامنے جب کبھی حسنؒ کا ذکر آتا تھا تو وہ فرماتے تھے "ذاک الذی یشبہ کلامہ کلام الانبیاء" (یہ تو وہ ہیں جن کا کلام انبیاء کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے)۔ (۱)

فصاحت وبلاغت:

گفتار، علمی مہارت وکمال کے علاوہ قدرت نے ان کو فصاحت وبلاغت کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس وصف میں وہ سب سے ممتاز تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں حضرت حسنؒ بصرہ کے سب سے زیادہ فصیح وبلیغ تھے۔ علامہ ابن سعد اور حافظ ذہبی دونوں ان کی فصاحت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ابن عون کہتے ہیں "میں حضرت حسنؒ کے لہجہ کو روبتہ بن العجاج کے لہجہ سے تشبیہ دیتا ہوں" (۲) ابوعمرو بن العلا کہتے ہیں "میں نے حجاج اور حسن سے زیادہ فصیح اور روبتہ اور عجاج سے بڑا شاعر کوئی نہیں دیکھا۔" (۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۵۔ (۲) ایضاً ص ۲۷۰۔ (۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۶۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

ایک مسلمان کے لئے سب سے زیادہ کٹھن اور دشوار مرحلہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے۔ قدرت نے حضرت حسنؒ کو جس بیدار قوتِ عمل کی دولت سے نوازا تھا اس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے اربابِ صولت وہیبت کی پرواہ نہ کرتے تھے اور جو امر حق ہوتا تھا اس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا کہ ''مجھ پر خلافت کا بار ڈال دیا گیا ہے، آپ ایسے لوگ تلاش کیجئے جو اس معاملہ میں میری امداد کریں۔'' حضرت حسنؒ نے جواب دیا ''لوگ دو ہی قسم کے ہیں، ابناءِ دنیا تو آپ کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ابناءِ آخرت، تو وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے۔ پس بہتر یہی ہے کہ آپ خدا سے مدد طلب کریں۔ ابن ہبیرہ کو یزید بن عبدالملک نے عراق وخراسان کی گورنری پر مامور کیا تو اس نے حضرت حسنؒ، ابن سیرینؒ اور شعبیؒ کو بلا کر کہا کہ خلیفہ نے مجھ کو فلاں معاملہ کی نسبت ایسا ایسا لکھا ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کے مطابق عمل کروں۔ اس پر ابن سیرینؒ اور شعبیؒ نے ایک ایسی بات کہی جس میں کچھ توریہ پایا جاتا تھا پھر حسن بصری کی باری آئی تو انہوں نے صاف صاف کہا ''ابو ہبیرہ! تو یزید کے معاملہ میں اللہ سے خوف کر، اور اس کے برعکس اللہ کے معاملہ میں یزید سے مت ڈر کیونکہ اللہ زیادہ طاقتور ہے وہ تجھ کو یزید کے شر سے بچا سکتا ہے، لیکن یزید تجھ کو اللہ کے قہر سے نہیں بچا سکتا۔ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ وہ تیرے پاس ایک فرشتہ بھیج دے جو تجھ کو تیرے تخت سے اتار دے اور تیرے وسیع محل میں سے نکال کر تنگنائے قبر میں پہنچا دے اس وقت سوائے تیرے عمل کے کوئی چیز تیرے کام نہیں آئے گی، تو خدا کی معصیت کرنے سے بچ، کیونکہ اللہ نے اس حکومت کو بندگانِ خدا اور دین کا مددگار بنایا ہے تو اس کو دین اور بندگانِ خدا کے خلاف استعمال مت کر، کیونکہ خدا کی معصیت میں کسی بندہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ناجائز اور حرام ہے۔'' (۱)

ابوبکر الہذلی کہتے ہیں ''حضرت حسنؒ نے کوئی درہم کسی تجارت میں نہیں لگایا کبھی کوئی عہدۂ سرکاری حاصل نہیں کیا اور وہ جس کسی چیز کا امر کرتے تھے پہلے اسے خود کرتے تھے۔ اسی طرح کسی چیز کے ترک کا حکم کرتے تو پہلے اسے خود ترک کر دیتے تھے۔ (۲)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ص ۱۳۷۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ص ۱۳۷۔

علمِ باطن:

حضرت حسنؒ علوم ظاہریہ کے علاوہ علمِ باطن کے زیور سے بھی آراستہ تھے چنانچہ تمام بڑے بڑے اربابِ تصوف نے آپ کا نام جلی عنوان سے لکھا ہے اور سب کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ سلسلۂ تصوف کے شیخ الشیوخ ہیں۔

خوفِ خدا:

تصوف میں اصل احسان یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حضور کا تصور ہر وقت رہے۔ حضرت حسن بصریؒ پر یہ کیفیت بہت غالب تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان سے ہر وقت خائف اور ترساں رہتے تھے۔ یونس بن عبیدؒ سے کسی نے دریافت کیا ''آپ کوئی ایسا شخص بھی جانتے ہیں جو حسن کی طرح عمل کرتا ہو۔'' کہنے لگے ''عمل کرنا تو بہت دشوار ہے میں نے تو کوئی ایسا شخص بھی نہیں دیکھا جو ان کے قول کی طرح اقوال ہی کہتا ہو اس کے بعد انہوں نے حضرت حسنؒ کی توصیف کرتے ہوئے بیان کیا ''وہ جب آتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی دوست کو دفن کر کے آرہے ہیں، اور جب بیٹھتے تھے تو اس قدر اداس ہوتے تھے کہ گویا وہ ایک قیدی ہیں جس کے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے اور جب ان کے سامنے دوزخ کا ذکر کیا جاتا تو ان پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی تھی کہ گویا دوزخ ان کے سوا کسی اور کے لئے پیدا ہی نہیں کی گئی۔'' (۱)

وفات:

۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی وفات سے چند روز قبل ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ ایک پرندہ نے مسجد کی ایک کنکری اٹھالی اس نے حضرت ابن سیرینؒ سے تعبیر پوچھی تو انہوں نے کہا ''اگر تمہارا یہ خواب سچ ہے تو حسن بصریؒ کا انتقال ہو جائے گا۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس خواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد حسن بصریؒ وفات پا گئے۔ جنازہ اٹھا تو اس میں اس کثرت سے لوگ شریک تھے کہ جامع بصرہ میں عصر کی نماز کے لئے ایک متنفس بھی نہیں تھا۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں: ''آغاز اسلام سے اب تک کی تاریخ بصرہ میں سب سے پہلا اتفاق تھا۔ (۲)

---

(۱) شذرات الذہب ج ا ص ۱۳۸۔ (۲) ایضاً۔

محمد بن سیرین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام، ابوبکر کنیت، والد کا نام سیرین تھا جو جرجرایا (عراق) کے باشندے تھے۔اور عین التمر میں ٹھٹھیرے کا کام کرتے تھے، اسی عین التمر کے معرکہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور کسی کو تقسیم کردیئے گئے۔ بعد میں وہ انس بن مالکؓ کی غلامی میں آگئے تھے جنہوں نے بیس ہزار درہم پر مکاتبت کرکے انہیں آزاد کردیا۔ (۱)

ابن سیرین کی والدہ صفیہ حضرت ابوبکرؓ کی باندی تھیں، لیکن وہ اس شان کی تھیں کہ جب ان کے نکاح کا وقت آیا تو تین ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے ان کی مشاطگی کا کام انجام دیا اور اٹھارہ بدری صحابہؓ کرام جن میں ابی بن کعبؓ بھی تھے نکاح کی تقریب میں شامل ہوئے، آراستگی کے بعد امہات المومنین نے حضرت صفیہؓ کے لئے دعا مانگی ادھر مردانہ مجلس میں حضرت اُبیؓ دُعاء مانگتے جاتے اور دوسرے صحابہ آمین کہتے جاتے تھے۔ (۲)

ولادت.

سیرین کثیر الاولاد تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ صرف امہات الاولاد کے بطن سے ان کے تیس لڑکے تھے لیکن محمدؒ حضرت صفیہ کے بطن سے تھے۔ ۳۳ھ میں جبکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے میں دوسال باقی تھے آپ پیدا ہوئے۔ (۳)

علم وفضل:

محمد بن سیرینؒ فارس میں مدت تک حضرت انس بن مالکؓ کے ساتھ کاتب کی حیثیت سے رہے تھے اوراس تقریب سے ان کو حضرت انسؓ سے علمی استفادہ کا بہت کافی موقع ملا تھا۔ان کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ، ابن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ ایسے جلیل القدر صحابہ کے فیضِ صحبت سے مشرف ہوئے تھے۔ان بزرگوں کی توجہ اور خود ابن سیرینؒ کے ذاتی شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم کے پیکر ہوگئے۔حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔

---

(۱) ابن خلکان ج۱ص۴۵۳۔ (۲) شذرات الذہب ج۱ص۱۳۸۔ (۳) ابن خلکان ج۱ص۴۵۳۔

"وكان فقيها اماما عزيز العلم ثقة ثبتا علامة فی التعبير راسا فی الورع."[1]

"ابن سیرین فقیہ، امام، وافر العلم، معتمد، ثابت فی الحدیث، تعبیر میں علامہ، زہد وتقویٰ کے امام تھے۔"

علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں: "ابن سیرین ثقہ، مامون بلند مرتبہ، عالی شان فقیہ اور امام کثیر العلم اور متقی تھے۔"[2]

تفسیر:

وہ تمام اسلامی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے چنانچہ وہ تفسیر کے بھی امام تھے علامہ نووی انہیں "الامام فی التفسیر والحدیث والفقة وتعبیر الرؤیا والمقدم فی الزھد والورع" لکھتے ہیں۔[3]

حدیث:

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے ابن سیرین حضرت انسؓ بن مالک کے خاص تربیت یافتہ اور حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عمر وابن عباسؓ کے فیض صحبت پائے ہوئے تھے۔ اور ان بزرگوں کے علاوہ انہوں نے دوسرے اجلۂ صحابہ سے حدیث کی روایت کی ہے جن میں سے بعض کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔ زید بن ثابت، حذیفہ بن یمان، حسن بن علی، رافع بن خدیج، سلیمان بن عامر، سمرۃ بن جندب، ابوالدرداء، معاویہ، ابوسعید خدری، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ صحابہ کے علاوہ جن غیر صحابہؓ علماء حدیث سے انہوں نے روایت کی ہے ان میں مشہور یہ ہیں: عکرمہ، شریح، عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ، قیس بن عباد، مسلم بن یسار رحمہم اللہ وغیرہ[4] ان اکابرِ اُمت کے فیض نے ابن سیرین کو علم حدیث کا امام بنا دیا تھا۔

ثقاہت:

ثقاہت میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ ہشام بن حسان نے محمد بن سیرینؒ سے ایک روایت نقل کی تو کہا "مجھ سے یہ روایت اس شخص نے بیان کی ہے جو ان تمام انسانوں میں سب

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۷۳۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ص ۱۴۰۔

(۳) تہذیب الاسماء ج اص ۸۲۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۵، ۲۱۶۔

سے زیادہ سچا ہے، جن کو میں نے پایا ہے۔'' ابن مدینیؒ کہتے تھے ''حضرت ابو ہریرہؓ کے اصل شاگرد چھ ہیں۔ ابن المسیب، ابوسلمہ، الاعرج، ابو صالح، ابن سیرین، طاؤس، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور یحییٰ بن معینؒ انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عون کا مقولہ ہے ''میں نے دنیا میں ان تین جیسے آدمی نہیں دیکھے عراق میں محمد بن سیرین، حجاز میں قاسم بن محمد، شام میں رجاء بن حیوۃ۔ اور ان تینوں میں محمد بن سیرین جیسا کوئی نہیں تھا۔ (۱) امام شعبیؒ تلامذہ کو ہدایت کرتے تھے کہ ابن سیرین کے خوانِ علم سے فائدہ اٹھائیں۔ (۲) علی بن مدینیؒ، عمرو بن علیؒ وغیرہما کہتے تھے اصح الاسانید ''محمد بن سیرین عن عبیدۃ عن علیؓ'' ہے۔ (۳)

احتیاط:

اس وسعت علم اور ثقاہت کے باوجود روایت کرنے میں نہایت احتیاط کرتے تھے یہاں تک کہ وہ روایت کے صرف معانی نقل کر دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بالالفاظ روایت کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ابن عون کہتے ہیں **کان ابن سیرین یحدث بالحدیث علی حروفه**' (۴) اس احتیاط کی وجہ سے معمولی مرتبہ کے لوگوں سے علم اور حدیث کا اخذ کرنا نامناسب سمجھتے تھے، چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے ''علم دین ہے۔ اس کو حاصل کرنے سے قبل اس شخص کو خوب اچھی طرح پرکھ لو جس سے اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو۔'' (۵)

فقہ:

فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ علامہ ابن سعدؒ، حافظ ذہبیؒ۔ امام نوویؒ، حافظ ابن حجر انہیں فقیہ تسلیم کرتے ہیں۔ مورق العجلی کہتے ہیں ''میں نے ابن سیرین سے زیادہ کوئی پاکباز فقیہ نہیں دیکھا۔ (۶) ابن حبان انہیں فقیہ فاضل بتاتے ہیں۔ (۷) علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں ''**و کان محمد احد الفقهاء من اهل بصرة والمذکورین بالورع فی وقته**.'' (۸)

لیکن احتیاط کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جن امور میں ذرا سا شبہ بھی ہوتا تھا اس کے متعلق فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ (۹) کوئی شخص ان سے فقہ کا مسئلہ پوچھتا تو ان کا رنگ یکایک متغیر ہو جا[تا] اور حالت دگرگوں ہو جاتی تھی۔ (۱۰)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۵۔۲۱۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴۔ (۴) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۳۔
(۵) ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۱۴۱۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳۔ (۷) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۶۔
(۸) تاریخ خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۱۔ (۹) ایضاً ج ۵ ص ۳۳۶۔ (۱۰) ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۱۴۲۔

قضا میں مہارت:

فقہی کمال کی وجہ سے ان کو قضا میں بڑی مہارت تھی۔عثمان البیتی کا قول ہے ''اس نواح میں محمد بن سیرین سے بڑا کوئی ماہر قضا نہیں ہے''[۱] لیکن اس کے باوجود عہدۂ قضا سے گھبراتے تھے۔ایک مرتبہ ان کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو شام بھاگ گئے اور وہاں سے مدینہ پہنچ گئے۔[۲]

زہد وورع:

ان علمی کمالات کے ساتھ ان میں زہد وورع بھی حد سے زیادہ تھا۔ابن سیرین کسب معاش کے لئے تجارت کرتے تھے۔لیکن انہیں اس میں کچھ شک ہوگیا تو اسے بھی چھوڑ دیا۔اتقاء کا یہ عالم تھا کہ وہ خود فرماتے ہیں ''خواب میں اور بیداری میں ام عبداللہ یعنی اپنی بیوی کے سوا کسی عورت کے پاس نہیں آیا'' پھر فرماتے ہیں ''خواب میں اگر کوئی اجنبی عورت دیکھتا ہوں تو فوراً خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عورت میرے لئے حلال نہیں ہے اس خیال کے آتے ہی میں فوراً اپنی نگاہ پھیر لیتا ہوں۔''[۳]

مالی نقصان:

غایت احتیاط کے باعث انہیں بعض اوقات شدید مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے تھے لیکن وہ اس کی پروانہیں کرتے تھے۔ایک مرتبہ (غالباً تجارت کے سلسلہ میں) انہوں نے زیتون کے تیل کی ایک مشک چالیس ہزار درہم میں خریدی اس میں اتفاق سے ایک مرا ہوا چوہا نکل آیا۔حضرت ابن سیرینؒ نے اس خیال سے کہ ممکن ہے چوہا کولہو میں پڑا ہوا ہو پوری مشک پھینکوادی۔لیکن چونکہ اسے خرید چکے تھے اس لئے تیل والے نے قیمت کا مطالبہ کیا یہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں قید کر دیا گیا۔[۴]

خیانت سے احتراز:

جیل کا انچارج ان کا ارادتمند تھا،اس نے کہا ''میں رات کے وقت جیل خانہ آپ کے لئے کھول دیا کروں گا،آپ اس وقت اپنے بال بچوں کے پاس چلے جایا کیجئے لیکن آپ نے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ میں تمہاری خیانت فرض منصبی میں اعانت نہیں کروں گا۔''[۵]

---

(۱) تہذیب الاسماء ج اص ۸۴۔ (۲) شذرات الذہب ج اص ۱۳۹۔

(۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۶۔ (۴) تہذیب الاسماء ج اص ۸۴۔ (۵) ایضاً۔

خوفِ خدا:

اس زہد واتقاء کا سبب یہ تھا کہ ان میں خوف خدا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ہشام بن حسان کہتے ہیں ''ہم ایک مرتبہ ابن سیرینؒ کی معیت میں ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں ہم نے ان کو دیکھا کہ دن کو ہنستے اور رات کو روتے تھے۔'' ابن عونؒ کہتے ہیں ''ابن سیرینؒ امت کے متعلق تو بہت پُر امید لیکن خود اپنی ذات کی نسبت بہت شدید اور سخت تھے۔''(۱)

ابوقلابہ کہتے ہیں ''محمد بن سیرین کی طرح کون نیزہ کی دھار پر سوار ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔'' ان کے سامنے موت کا ذکر ہوتا تھا تو اس سے بھی آخرت کے ڈر سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ گویا ان کے ایک ایک عضو پر موت طاری ہوگئی ہے۔''(۲)

شانِ بزرگی:

مجموعی طور پر وہ خصائل حمیدہ کے ایسے جامع تھے کہ ان کو کسی پہلو سے دیکھا جائے ان کی خوبیاں آشکارا ہو جاتی تھیں۔ ابوقلابہ کہتے ہیں:

> "اصرفوه حيث شئتم فلتجدنه اشدكم ورعا و املككم لنفسه." (۳)
>
> ''تم ان کو جس طرح چاہو آزما کر دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ وہ تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار اور تم میں سب سے زیادہ ضابط نفس ہوں گے۔''

خلفاء کا اعزاز:

حضرت محمد بن سیرینؒ کی جلالتِ شان کی وجہ سے اعیان وامراء ان کے پاس ہدایا بھیجتے تھے۔ لیکن ان کے استغناء کا یہ عالم تھا کہ قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے بزرگ شمائل خلیفہ نے ان کے اور حضرت حسن بصری کے پاس کچھ ہدایا روانہ کئے تو حسن بصریؒ نے انہیں قبول کر لیا۔ لیکن محمد بن سیرینؒ نے انہیں واپس کر دیا۔ (۴)

---

(۱) دیکھو تہذیب الاسماء اور تاریخ بغدادی۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۷۳۔

(۳) تہذیب الاسماء ج ا ص ۸۴۔ (۴) ابن سعد ج ۷ ق ا ص ۱۴۷۔

شانِ بزرگی:

حدیث میں اہل اللہ کی علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ انہیں دیکھتے ہی خدا یاد آجائے حضرت محمد بن سیرینؒ کا حال یہی تھا۔ ابوعوانہؒ کہتے ہیں ''میں نے ابن سیرینؒ کو دیکھا ہے کہ بازار سے جب گزرتے تھے تو لوگ ان کے صلاح وتقویٰ کی وجہ سے اللہ کا ذکر کرنے لگتے، اور اس کے نام کی تسبیح وتہلیل پڑھنے لگتے تھے''(۱) ابن عمادؒ الحنبلی لکھتے ہیں ''ابن سیرینؒ کسی مکان میں تشریف لے جاتے تو وہاں کا کوئی شخص ایسا نہ ہوتا تھا جو ان کو دیکھ کر اللہ کا ذکر شروع نہ کردیتا ہو۔ (۲) ابن قتیبہ کہتے ہیں ''ابن سیرینؒ علم اور عبادت میں مرتبۂ کمال رکھتے تھے۔(۳)

تعبیر خواب:

ابن سیرینؒ بہترین معبر خواب کی حیثیت سے عوام وخواص میں زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کے متعلق بعض دلچسپ حکایتیں بھی مشہور ہیں۔ ان کی وفات سے چند روز قبل ایک شخص آیا اور کہنے لگا ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک نامعروف فربہ پرندہ اترا اور ایک درخت پر بیٹھ کر پھول چننے لگا پھر اڑ گیا'' ابن سیرینؒ کے چہرہ کا رنگ یہ سنتے ہی متغیر ہوگیا اور فرمایا ''یہ علماء کی موت ہے اس فن میں کمال کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھا اور ان سے درخواست کی کہ مجھ کو خواب کی تعبیر سکھا دیجئے، انہوں نے فرمایا ''اپنا منہ کھولو'' میں نے تعمیلِ ارشاد میں منہ کھولا تو آپ نے اس میں اپنا لعاب ڈال دیا، اس واقعہ کے بعد سے میں خواب کی تعبیریں بیان کرنے لگا۔''(۴)

شادی:

آپ نے ایک عربی خاتون سے شادی کی تھی جس سے آپ کے اولاد کثیر ہوئی لیکن عبداللہ بن محمدؒ کے سوا سب کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا۔(۵)

وفات:

حضرت حسن بصریؒ کی وفات کے سوا تین ماہ بعد شوال ۱۱۰ھ میں ستر برس پاکر انتقال کیا۔(۶)

---

(۱) خطیب بغدادی ج۵ ص۳۳۷۔ (۲) شذرات الذہب ج۱ ص۱۳۹۔ (۳) ایضاً۔

(۴) شذرات الذہب ج۱ ص۱۳۹۔ (۵) شذرات الذہب ج۱ ص۱۳۸۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۴۷۔

ابو العالیۃ الریاحی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

رفیع نام، ابوالعالیہ کنیت تھی بنو الریاح کی ایک عورت کے غلام تھے جس نے ان کو بعد میں آزاد کر دیا تھا، اس کی نسبت سے ریاحی کہلاتے ہیں [۱] ان کے والد کا نام مہران تھا۔ بصرہ کے باشندہ تھے۔ [۲]

آزادی:

اپنی آزادی کی داستان وہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں ''مجھ کو ایک عورت نے خریدا اور جب اس نے آزاد کرنا چاہا تو اس کے چچازاد بھائیوں نے کہا کہ تم اس کو آزاد کر دوگی تو یہ کوفہ چلا جائے گا، اور ہم سے تعلق بالکل منقطع ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ عورت مجھ کو مسجد کے ایک حصہ میں لائی اور مجھے اس کی خدمت کے لئے آزاد کر دیا اور دعا مانگی کہ ''اے اللہ میں ابو العالیہ کو اس لئے آزاد کر رہی ہوں کہ قیامت کے دن میرا یہ کارِ ثواب میرے لئے ایک ذخیرہ آخرت بن جائے۔''

اسلام:

حضرت ابوالعالیہ مخضرمی تھے یعنی انہوں نے عہد جاہلیت بھی پایا تھا اور عہد اسلام بھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سال بعد مشرف باسلام ہوئے اس لئے صحابی نہ ہو سکے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے قرآن مجید پڑھا، اور اس شوق ورغبت سے کہ ایک رات میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کو آزادی نہیں ملی تھی۔ دن بھر اپنے آقا کا کام کرتے، اور رات کو قرآن مجید کی اول سے آخر تک تلاوت کرتے تھے۔ یہ محنت شاقہ برداشت نہ ہو سکی تو دو راتوں میں ایک قرآن کے ختم کرنے کا اہتمام کیا۔ لیکن یہ بھی برداشت نہ ہو سکا تو تین راتوں میں ایک قرآن مجید ختم کرنے لگے۔ جب یہ بھی ناقابل تحمل ثابت ہوا تو انہوں نے بعض صحابۂ کرام سے شکایت کی انہوں نے بتایا کہ جمعہ جمعہ یا ہفتہ میں کوئی اور دن، بہر حال سات دن

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۷ ق اص ۸۱۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱۔

میں ایک قرآن مجید ختم کر لینا چاہئے۔ چنانچہ ابوالعالیہ کہتے ہیں ''اس مشورہ سے ہم کو عشاء کی نماز کے بعد سونے کا موقع مل جاتا تھا اور ایک ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرنا گراں نہیں گزرتا تھا۔ (۱)

تحصیلِ علم:

حضرت ابوالعالیہ ؒ کو تحصیلِ علم کا اتنا شوق تھا کہ غلامی کی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے قرآن مجید پڑھا اور اس کے ساتھ عربی کتابت بھی سیکھی۔ پھر حدیث کا شوق پیدا ہوا تو بصرہ کے علماء سے سماع حدیث کرتے رہے اس سے تشنگی فروز ہوئی تو انہوں نے مدینہ طیبہ کا ارادہ کیا تا کہ یہاں صحابہ کرام سے بلاواسطہ استفادہ کرسکیں۔ (۲)

فضل وکمال:

ان کی اس کوشش اور طلبِ صادق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عہد کے نامور علماء تفسیر و حدیث وفقہ میں شمار ہونے لگے۔ علامہ ابن سعد ؒ لکھتے ہیں۔ ''کان ثقةً کثیر الحدیث'' (۳) یحییٰ بن معینؒ، ابوزرعہؒ، ابو حاتمؒ اور دوسرے ائمہ کرام بھی انہیں ''ثقہ'' مانتے ہیں (۴) ابوالقاسم الطبری کہتے ہیں '' وہ ثقہ ہیں اور ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے۔ (۵)

تفسیر:

قرآن مجید کے ساتھ ان کو خاص شغف تھا اور اس میں انہوں نے خاص بصیرت پیدا کی تھی، یہاں تک کہ ابوبکر بن ابی داؤد فرمایا کرتے تھے کہ ''صحابہ کے بعد ابوالعالیہ سے بڑھ کر کوئی عالم بالقرآن نہیں۔ سعید بن المسیب ؒ بھی ان کے بعد ہیں۔ (۶)

قرأت:

تفسیر کے ساتھ قرأت کے فن سے بھی واقف تھے اور اس کی تعلیم انہوں نے باقاعدہ حضرت ابی بن کعبؓ سے حاصل کی تھی حافظ ذہبیؒ اور ابن عمادؒ حنبلی دونوں انہیں ''المقری'' لکھتے ہیں۔ (۷)

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ا ص ۸۱۔ (۲) ایضاً ص ۸۲۔ (۳) ابن سعد ج ۷ ق ا ص ۸۵۔

(۴) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱۔ (۵) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱۔

(۶) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۵۸۔ (۷) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۵۸، شذرات الذہب ج ا ص ۱۰۲۔

حدیث:

تفسیر وقرأت کے ساتھ انہیں حدیث میں بھی کمال حاصل تھا۔ پہلے گزر چکا ہے اسی شوق میں یہ بصرہ سے سفر کر کے مدینہ طیبہ آئے تھے، یہاں اجلۂ صحابہ موجود تھے ان سے انہوں نے حدیث کا سماع کیا۔ ان میں سے بعض نام یہ ہیں حضرت عمر بن الخطابؓ، ابن مسعودؓ، علیؓ اور حضرت عائشہؓ، ابی بن کعبؓ، ابو ایوبؓ، ابو موسیٰؓ ابن عباسؓ، ابو برزہؓ، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت ابو العالیہ سے روایات نقل کی ہیں۔ (۱) ان کے اس فضل وکمال کی وجہ سے حضرت ابن عباسؓ جو خود بہت بڑے مفسر ومحدث اور فقیہ وامام تھے حضرت ابو العالیہؒ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ حضرت ابن عباسؓ بصرہ کے گورنر تھے، ابو العالیہؒ آپ کے پاس آئے تو آپ نے اپنا ہاتھ حضرت ابو العالیہؒ کے ہاتھ میں دے کر انہیں تخت ہی پر اپنے پاس بٹھالیا۔ بنو تمیم کا ایک شخص بولا ''یہ تو غلام ہیں'' آپؓ نے فرمایا ''علم اسی طرح شرفا میں شرف بڑھاتا ہے اور غلاموں کو تخت پر بٹھاتا ہے۔''(۲)

فتنہ سے احتراز:

ان علمی کمالات کے علاوہ ان میں عملی واخلاقی کمالات بھی کچھ کم نہ تھے طبیعت نہایت سلیم پائی تھی۔ فتنہ وفساد سے طبعاً اجتناب کرتے تھے۔ اپنا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ''جس وقت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہو رہی تھی میں اس زمانہ میں جوان تھا لڑنا مرنا مجھ کو عمدہ عمدہ کھانوں سے بھی زیادہ مرغوب تھا۔ چنانچہ میں نے بھی جنگ میں جانے کا ارادہ کیا، اور اس کے لئے خوب تیاریاں کیں میدانِ کارزار میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دونوں صفیں آراستہ ہیں اور اس قدر بڑی ہیں کہ ان کے کنارے نظر ہی نہیں آتے ان میں سے ایک فریق نعرہ تکبیر بلند کرتا تھا، تو فریق ثانی بھی اللہ اکبر پکارتا تھا۔ اب میں نے دل میں سوچا کہ میں ان میں سے کس فریق کو کافر قرار دوں اور کس کو مومن سمجھتا رہوں پھر میں نے خیال کیا کہ مجھ کو یہاں جنگ میں آنے پر کس نے مجبور کیا ہے؟ جواب ملا کسی نے بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے میں میدانِ جنگ سے واپس چلا آیا۔ (۳)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱۔ (۲) ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۸۲۔ (۳) ایضاً۔

بے تکلفی:

دوستوں کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے رہتے تھے۔ شعیب بن الحجابؒ بیان کرتے ہیں ''ابو العالیہؒ ہمارے گھر آتے تھے، اور فرماتے ''تمہارے گھر میں جو کچھ کھانا تیار ہو ہمیں لا کر کھلا دو، بازار سے ہرگز کوئی چیز مت خریدنا۔(۱)

بدگمانی سے اجتناب:

بدگمانی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ابو خلدہ کہتے ہیں ''ایک مرتبہ میں حضرت ابو العالیہؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کا ایک غلام ایک رومال لے کر آیا جس میں سر بمہر شکر کے ٹکڑے تھے۔ ابو العالیہ نے مہر توڑ کر دس دانے خود غلام کو دے دیئے، اور پھر فرمایا ''اگر یہ غلام خیانت کرتا بھی تو اس سے زیادہ کی خیانت نہ کرتا۔ یوں ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ نوکر یا غلام سے کوئی چیز منگائیں تو سر بمہر منگائیں، تا کہ بدگمانی کا موقع ہی نہ رہے۔'' (۲)

بے ریائی:

انہیں ایسے لباس یا ایسی وضع وقطع سے قلبی نفرت تھی جس سے ریاکاری کی بو آتی ہو۔ ایک دفعہ عبدالکریم ان کے پاس ادنیٰ کپڑے پہنے ہوئے آئے۔ حضرت ابو العالیہ نے انہیں دیکھ کر فرمایا ''یہ تمہارا لباس تو راہبوں کا سا لباس ہے۔ مسلمان جب ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے جاتے ہیں تو عمدہ کپڑے پہنتے ہیں۔''

لباس میں نفاست:

چنانچہ حضرت ابو العالیہؒ کا معمول ہی یہ تھا کہ گھر میں سادہ لباس رکھتے اور پاجامہ پہنتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا ''آپ گھر میں پاجامہ کیوں پہنتے ہیں؟ فرمایا ''اس سے ستر خوب ہوتا ہے اور گھر میں مردوں کو پاجامہ ہی پہننا چاہئے۔ لیکن جب وہ کہیں باہر جاتے تھے تو عمدہ سے عمدہ کپڑے جن میں قمیص، چادر اور ازار شامل ہوتے تھے زیب تن فرماتے تھے۔ لیکن ان تمام کپڑوں میں چادر کا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ''میں چادر زیادہ اچھی اوڑھتا ہوں جس کی قیمت بیس اور تیس درہم ہوتی ہے۔''

---

(۱) ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۸۳۔ (۲) ایضاً۔

اہل بیت سے محبت:

اہل بیت سے ان کو دلی محبت تھی۔ ان کا یہ معمول تھا کہ اپنے مال کی پوری زکوۃ مدینہ منورہ بھیج دیتے تھے تاکہ وہاں اہل بیت کو دے دی جائے اور وہ اپنی صوابدید سے جس مستحق کو جتنا دینا چاہیں دے سکیں۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے وصیت کی کہ ''میں جتنا سونا، چاندی یا مال بطور ترکہ چھوڑے جارہا ہوں اس کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ ایک حصہ فی سبیل اللہ خرچ کیا جائے ایک فقراء مسلمین کو دیا جائے اور ایک تہائی اہل بیت اطہار کی خدمت میں میری طرف سے بطورِ نذرانہ پیش کردیا جائے۔'' ساتھ ہی وصیت کی کہ ''میری بیوی کا حق بھی ادا کرنا''
۲

نکاح:

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص اپنی کسی باندی کو تعلیم وتربیت دے اور پھر اسے آزاد کرکے اس سے نکاح کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو دوہرا اجر دیتا ہے۔ حضرت ابوالعالیہؒ نے اسی پر عمل کرتے ہوئے اپنی ایک جاریہ کو آزاد کرکے اس سے نکاح کرلیا تھا۔ اور آپ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے، انتقال ہونے لگا تو ورثاء کو خاص طور پر وصیت کی کہ میری بیوی کا حق پورا پورا دے دیا جائے۔ عیدالفطر کے موقع پر اپنی طرف سے ایک قفیز اور اپنی بیوی کی طرف سے دو مکوک یعنی ایک سیر کے قریب صدقہ ادا کرتے تھے۔ (۱)

جمال:

ان معنوی کمالات کے ساتھ قدرت نے کمالِ صوری سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ اصمعیؒ کا بیان ہے کہ ابوالعالیہؒ اور مکحول ازدیؒ دونوں جمیل ہیں، اور حضرت ابوالعالیہؒ ظریف الطبع بھی بہت تھے۔ (۲)

وفات:

علامہ ابن سعدؒ نے تاریخ وفات ۹۰ھ بتائی ہے۔ لیکن حافظ ذہبی اور ابن عماد الحنبلی دونوں لکھتے ہیں کہ صحیح ۹۳ھ ہے۔ مرض کے دنوں میں نہایت نقیہ ہو گئے تھے۔ بچھونے سے اٹھ نہیں سکتے تھے وہیں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے اور سجدہ تکیہ پر کرتے تھے۔ (۳) خراسان کے کسی علاقہ میں انتقال ہوا۔

---

(۱) یہ سب واقعات ابن سعد ج ۷ ق ا تذکرہ ابوالعالیہ سے ماخوذ ہیں۔ (۲) شذرات الذہب ج ا ص ۱۰۲۔

(۳) ابن سعد ج ۷ ق ا ۸۷۔

عطاء بن یسار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ابو محمد کنیت، عطاء نام، والد کا نام یسار تھا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی غلامی کا شرف رکھتے تھے۔ مشہور فقیہ سلیمان بن یسارؒ اور عبدالملک کے بھائی تھے۔ (۱)

ولادت:

۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ (۲)

علم وفضل:

حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شرف صحبت اور اس تقریب سے دوسرے اکابر امت کی مجالست نے ان کو حدیث کا معتمد عالم بنا دیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "و کان ثقة کثیر الحدیث"۔ (۳) حافظ ذہبی انہیں **الامام الربانی** اور **الفقیه الواعظ** بتاتے ہیں۔ پھر تحریر کرتے ہیں "عطاء بڑے ثقہ اور علم کا ظرف تھے۔" (۴)

شیوخ:

انہوں نے صحابۂ کرام کی ایک جماعت کثیرہ سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ جن میں زیادہ مشہور نام یہ ہیں۔ حضرت ابوذرؓ ابوالدرداءؓ، عبادۃ بن الصامتؓ، زید بن ثابتؓ، معاویۃ بن الحکم السلمیؓ، ابو ایوبؓ ابوقتادہؓ، ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابورافعؓ، مولیٰ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، امام بخاریؒ اور ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا، ان بزرگوں سے فیض پانے کے علاوہ علم کی جستجو میں انہوں نے شام اور مصر کا بھی سفر کیا تھا۔ (۵) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ عطاء بن یسارؒ واعظ، عبادت گزار اور صاحب فضل وکمال تھے۔ (۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں: "ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔"

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۸۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۲۱۸۔ (۳) ابن سعد ج ۵ص ۱۲۹۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۸۴۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۲۱۸۔ (۶) ایضاً

تلامذہ:

ان سے جن بزرگوں نے سماع حدیث کا فیض پایا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ابو مسلمہ بن عبدالرحمٰن، محمد بن عمر بن عطاء، محمد بن عمرو بن حلحلہ، ہلال بن علی، زید بن سلم، شریک بن ابی نمر، محمد بن ابی حرملہ، عمرو بن دینار رحمہم اللہ تعالیٰ۔

فقہ:

حدیث کے بڑے عالم ہونے کے ساتھ وہ فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی نے انہیں ''الفقیہ'' لکھا ہے۔

قضاء:

ابن عماد الحنبلی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مدینہ میں ایک سال تک قضاء کی خدمت بھی انجام دیتے رہے تھے۔ابن قتیبہؒ بھی یہی لکھتے ہیں۔ [1]

خودداری:

حضرت عطاء بن یسارؒ اگر چہ غلام تھے لیکن حضرت میمونہؓ کی معیت ومصاحبت اور علم و فضل نے ان میں خودداری کا ایسا جوہر پیدا کر دیا تھا کہ ایک مرتبہ کسی عرب نے ان کی صاحبزادی سے نکاح کرنا چاہا تو آپ نے جواب میں کہا ''ہم تمہارے نسب میں اور تمہارے مرتبہ ومقام میں کوئی قدح پیدا نہیں کرتے لیکن شادی بیاہ کے معاملات ہم اپنے جیسے لوگوں میں ہی کرتے ہیں اور تم بھی شادی اپنے قبیلہ میں ہی کرتے ہو۔'' [2]

وفات:

واقدیؒ کی روایت تو یہ ہے کہ عطاء بن یسارؒ کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں ہوئی لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۹۴ھ میں اسکندریہ میں وفات پائی۔علامہ نوویؒ اس روایت کو [3] اصح اور علامہ ابن سعد اس کو ''اشبہ'' یعنی زیادہ قابل قبول فرماتے ہیں۔ [4]

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵۔ (۲) ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۹۔

(۳) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۳۵۔ (۴) ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۷۔

ابو بکر بن عیاش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام و نسب:

ان کے نام میں متعدد اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہیں کہ شعبہ نام تھا، ابو بکر کنیت واصل الاحدب الاسدی کے غلام تھے۔ کوفہ وطن تھا، ۰۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔

علم و فضل:

مشہور امام قرأت حضرت عاصمؒ سے تین مرتبہ قرآن مجید پڑھا تھا۔ علم حدیث میں ان کے مشہور اساتذہ یہ ہیں۔

ابو اسحاق السبیعی عبدالملک بن عمیر، صالح مولی عمرو بن حریث، اسماعیل اسدی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تلامذہ:

ان کے علم و ثقاہت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ، ابو داؤد الطیالسیؒ، ابو کریبؒ، ابن مبارکؒ، اور ابن نمیرؒ، ایسے ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔ ابن مبارکؒ کہتے تھے "میں نے کسی شخص کو حدیث کی طرف سبقت کرنے میں ابو بکر بن عیاشؒ سے زیادہ تیز نہیں پایا۔" امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ "ابن عیاش صاحبِ قرآن و خبر ہیں۔"

حدیث میں ان کا پایہ:

امام ابو داؤدؒ انہیں ثقہ کہتے ہیں لیکن امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "رُبَّمَا غَلَطَ" یعقوب بن شیبہؒ کہتے ہیں "ابو بکر اپنے صلاحِ کامل کی وجہ سے معروف مشہور ہیں" وہ صاحبِ فقہ تھے اور اخبار کا علم بھی رکھتے تھے لیکن ان کی حدیثوں میں اضطراب پایا جاتا ہے علامہ ذہبی انہیں "شیخ الاسلام" لکھتے ہیں۔

زہدوورع:

''علم کے ساتھ صاحبِ زہدوورع بھی تھے۔ یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ ابوبکر بڑے عالم وفاضل تھے، چالیس برس تک انہوں نے اپنا پہلوز مین سے نہیں لگایا۔''

مقولہ:

ان کے بعض مقولے بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے تھے۔ ابوہشام الرفاعی بیان کرتے ہیں، ایک مرتبہ ابوبکر بن عیاشؒ نے فرمایا:

''الخلق اربعۃٌ معذورٌ ومخبور ومجبور ومثبورٌ فالمعذور بھائم والمخبور بنو ادم والمجبور الملائکۃ والمثبور ابلیس.''

''خلق چار قسم کی ہے۔ معذور، آزمودہ، مجبور و بے بس اور ہلاکت زدہ۔ معذور بہائم ہیں، آزمودہ انسان، مجبور اور بے بس فرشتے اور ہلاکت زدہ شیاطین ہیں۔''

خشیت ربانی کا ان پر غلبہ رہتا تھا، ایک مرتبہ فرمایا: ''دنیا میں آنا تو سہل ہے لیکن یہاں سے منتقل ہو کر اللہ کی طرف جانا بہت سخت ہے۔''

وفات:

جمادی الاولی ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت بہن پاس بیٹھی تھیں یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ آپ نے فرمایا ''تم روتی کیوں ہو؟ اس گوشہ کو دیکھو یہاں میں نے اٹھارہ ہزار مرتبہ قرآن مجید ختم کیا ہے۔'' (۱)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۴۴۔ ۲۴۵۔

زید بن اسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ابواسامہ کنیت، زید نام۔ والد کا نام اسلم تھا، حضرت عمرؓ کے غلام تھے۔

علم وفضل:

زید کو اس محترم ومقدس ہستی کی غلامی کا شرف حاصل تھا جس کے فیضانِ صحبت نے بے مقدار ذروں کو چشمک زنِ آفتاب بنا دیا تھا۔ پھر زید تو غلامی کی وجہ سے ہر وقت ان کی صحبت و معیت سے شادکام ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت زیدؒ علم وعمل کا ایک پیکر لطیف بن گئے اور وہ مدینہ کے علماء اعلام وصلحاء کرام میں شمار ہونے لگے۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام المدنی الفقیه" لکھتے ہیں۔(۱) علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: "ومنا قبه کثیرة"(۲)

تفسیر:

ان کو حضرت ابن عمرؓ کے فیضانِ صحبت کے باعث تفسیر میں خاص ادراک تھا۔ یعقوب بن ابی شیبہؒ کا بیان ہے کہ "زید تفسیرِ قرآن کے عالم تھے۔"(۳) عبیداللہ کا ان کی نسبت ایک قول ہے کہ "زید قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے بکثرت کرتے ہیں اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اس قول کے مطابق زید تفسیر القرآن بالرائے کی وعید کے ماتحت داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عبیداللہ بن عمر اسی مقولہ میں یہ بھی فرماتے ہیں "لا اعلم به باسا" اور ممکن ہے کہ حضرت زیدؒ نے بعض آیات کی تفسیر ایسی روایات کی روشنی میں کی ہو جس سے حضرت عبیداللہ بن عمرؓ بے خبر ہوں اور اس بنا پر انہوں نے زید کی تفسیر کو تفسیر بالرائے کہہ دیا ہو۔(۴)

حدیث:

تفسیر کی طرح حدیث میں بھی ان کو یکساں کمال حاصل تھا۔ صحابہ میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ، ام المومنین عائشہ صدیقہ، جابر، ربیعۃ بن عباد، سلمہ ابن اکوع اور انس بن مالک (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے روایت کی ہے۔ تابعین میں ان کو متعدد اکابر سے سماع کا شرف حاصل تھا۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۰۰۔

(۳) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶۔

درسِ حدیث:

خاص مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے تھے۔ جس میں مدینہ طیبہ کے اکابر علماء وفقہاء شریک ہوتے تھے۔ ابو حازمؒ کا بیان ہے کہ حضرت زیدؒ کی مجلس میں چالیس بڑے بڑے فقہاء شرکت کرتے تھے۔ جن کی باہمی الفت وموانست کی ایک ادنیٰ دلیل یہ تھی کہ ایک کا مال دوسرے کی خدمت واعانت کے لئے ہمہ وقت موجود رہتا تھا اور ان میں سے دو شخص کبھی آپس میں بے فائدہ لڑتے جھگڑتے اور نزاع وپیکار کرتے نہیں دیکھے گئے۔ (۱)

حضرت زیدؒ کے حلقہ درس میں امام زین العابدین علی بن الحسینؒ بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک دن نافع بن جبیر بن مطعم نے ان سے کہا کہ آپ اپنے خاندانی حلقہ کو چھوڑ کر عمر بن الخطابؓ کے غلام کے حلقہ میں شریک ہوتے ہیں؟ فرمایا ''انسان اسی شخص کے پاس بیٹھتا ہے جس کی صحبت اس کے دین کے لئے نافع ہوتی ہے۔'' (۲)

تلامذہ:

جن لوگوں نے ان کے دامنِ علم سے خوشہ چینی کی ان کی فہرست بہت طویل ہے چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت زید کے تین صاحبزادے، اسامہ، عبداللہ اور عبدالرحمٰن، مالک بن عجلان، ابن جریج، سلیمان بن بلال، حفص بن میسرہ، داؤد ابن القیس الفراء، ایوب السختیانی، جریر بن حازم، عبیداللہ بن عمر، ابن اسحاق، محمد بن جعفر بن ابی کثیر، معمر، ہشام بن سعد، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری رحمہم اللہ اجمعین۔

جلالتِ شان:

زیدؒ اگرچہ غلام تھے لیکن ان کا علمی دبدبہ کسی سلطان سے کم نہ تھا وہ جب چاہتے خود حدیث بیان کرنے لگتے تھے، خاموش ہو جاتے تو اٹھ کر واپس تشریف لے جاتے کسی شخص کو ان سے سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ابن عجلانؒ کا بیان ہے ''مجھ پر کبھی کسی شخص کی ہیبت نے اتنا اثر نہیں کیا جتنا زید بن اسلمؒ کی ہیبت نے'' اور حقیقت بھی یہ ہے کہ زید نہایت نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ بے ڈھنگے سوالات سے ان کو طبعاً بڑی ناگواری ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ابن عجلانؒ نے ان سے کوئی بات پوچھی تو انہوں نے فرمایا ''جاؤ! پہلے یہ سیکھو کہ سوالات کس طرح کئے جاتے ہیں''

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۱۶۔

پھر میرے پاس آؤ ایک دفعہ حضرت زیدؒ نے کوئی حدیث بیان کی، اس پر ایک شخص بولا ''آپ نے یہ کس سے سنی ہے؟'' فرمایا ''اے بھتیجے ہم بے وقوفوں کی صحبت میں نہیں بیٹھتے تھے۔''(۱)

ہر دلعزیزی:

ان کا یہ رعب داب ان کی علمی جلالت وعظمت کی وجہ سے تھا۔ ورنہ ویسے وہ بہت ہر دلعزیز اور محبوبِ کل تھے۔ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میرے پدر بزرگوار کے چند ہم نشین تھے، ان میں سے کسی کے پاس میرے والد مجھ کو کبھی کسی کام سے بھیجتے تھے تو وہ فرطِ شفقت سے میرے سر کو چھوتے اور اسے بوسہ دیتے اور کہتے کہ بخدا تمہارے والد مجھ کو میرے بال بچوں اور گھر والوں سے زیادہ عزیز ومحبوب ہیں، اگر خدا مجھ کو ان میں اور زید بن اسلم میں اختیار دے تو میں یہ پسند کروں گا کہ میرے سب اہل وعیال مر جائیں اور میرے لئے صرف زید زندہ وسلامت رہیں۔(۲) ''ابوحازمؒ کہتے تھے ''مجھ کو خدا وہ دن نہ دکھائے جبکہ میں زید کے انتقال کی خبر سنوں۔ اب کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہا جو میرے دین اور نفس کے اعتبار سے مجھ کو ان سے زیادہ پسند ہو۔'' چنانچہ جب انہیں زید کے انتقال کی خبر پہنچی تو ان پر ایسی بے ہوشی طاری ہوگئی کہ وہ ان کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکے۔(۳)

فقہ: فقہ میں بھی ان کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، امام نووی سب ان کو فقیہ امام مانتے ہیں۔

زہد واتقاء:

علمی کمالات کے ساتھ ان کی کلاہِ افتخار میں اخلاقی وعملی کمالات کا طرۂ امتیاز بھی لگا ہوا تھا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں ''**وکان من العلماء الابراد**'' ابن عیینہ کا بیان ہے۔ ''**کان زید بن اسلم رجلاً صالحاً**''(۴) امام نووی بھی انہیں ''صالح تابعی'' لکھتے ہیں۔ حدیث میں نیک لوگوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ حضرت زیدؒ اس کے صحیح مصداق تھے۔ ابوحازم کہا کرتے تھے ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں زید کو دیکھتا ہوں تو ان کے دیدار سے ہی تیری عبادت کی قوت مجھ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ان کی ملاقات اور ان سے بات چیت کا تو کیا کچھ اثر نہ ہوگا۔''(۵)

وفات:

۱۳۶ھ میں وفات پائی۔(۶)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۵، ۳۹۶۔ (۲) ایضاً ص ۳۹۶۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۲۴۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۲۵۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔

یزید بن ابی حبیب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یزید نام، ابورجا کنیت، والد کی کنیت ابی حبیب اور نام سوید تھا۔ قریش کی ایک شاخ بنی عامر بن لوئی کے غلام تھے۔

پیدائش:

حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوئے، مصر میں نشوونما پائی۔ اسی وجہ سے ان کو مصری کہتے ہیں۔ (۱)

فضل وکمال:

فضل وکمال کے لحاظ سے ائمہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی انہیں ''الامام الکبیر'' اور ابن عماد الحنبلی ''شیخ مصر'' لکھتے ہیں۔ مصر میں انہی کی ذات سے علم کا چرچا ہوا۔ ابن یونسؒ کا بیان ہے کہ ''یزیدؒ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصر میں علم ظاہر کیا اور حلال وحرام کے مسائل کو پھیلایا۔ اس سے قبل لوگ صرف ترغیبات اور فتن کا ذکر کرتے تھے۔ (۲)

حدیث:

حضرت یزیدؒ مصر کے ممتاز امام حدیث تھے۔ حافظ ذہبی انہیں ''حجة حافظ للحدیث'' (۳) اور علامہ ابن سعد ''ثقة کثیر الحدیث'' لکھتے ہیں۔ (۴) ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ (۵)

شیوخ:

انہوں نے حدیث میں کثیر التعداد ائمہ حدیث سے استفادہ کیا تھا جن میں سے چند نام یہ ہیں۔ عبداللہ بن حارث، ابوالطفیل، اسلم بن یزید، ابی عمران، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، عطا بن ابی رباح، عراک بن مالک اور امام زہری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲۔ (۲) ایضاً ص ۱۲۱ و ۱۲۲۔ (۳) ایضاً ص ۱۲۲۔
(۴) ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۰۲۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۹۔

تلامذہ:

ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، ان میں چند یہ ہیں۔ سلیمان التیمی، محمد بن اسحاق، زید بن ابی انیسہ، عمرو بن الحارث عبدالحمید بن جعفر، ابن لہیعہ اور لیث بن سعد رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (۱)

فقہ:

حدیث کے ساتھ انہیں فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ حافظ ذہبیؒ انہیں ''المصری الفقیہ'' لکھتے ہیں (۲) مصر کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو تین مفتی مقرر کئے تھے حضرت یزید بن ابی حبیب بھی ان سے ایک تھے۔ (۳)

جلالتِ شان:

یہ علمی کمالات کا وقار بہت ملحوظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ریان بن عبدالعزیزؒ نے پیغام بھیجا کہ ''مجھ کو آپ سے چند مسائل دریافت کرنے ہیں۔ ازراہِ کرم کسی وقت تکلیف گوارا کر کے تشریف لائیے'' آپ نے جواباً کہلا بھیجا ''تم خود میرے پاس آؤ، کیونکہ تمہارا میرے پاس آنا تمہارے لئے زینت اور میرا تمہارے پاس جانا تمہارے لئے عیب ہے۔ (۴)

صاف گوئی:

امراء سے اس درجہ استغناء کے باعث انہیں بڑے سے بڑے جابر و ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کے اظہار میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا ایک دفعہ جبکہ آپ بیمار تھے مصر کا امیر حوثرہ بن سہیل آپ کی عیادت کے لئے آیا اور پوچھنے لگا ''اے ابورجاء، جس کپڑے پر مچھر کا خون لگ جائے اس کا کیا حکم ہے؟ اس کے ساتھ نماز ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟'' آپ نے اپنا چہرہ پھیر لیا اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا۔ پھر جب حوثرہ چلنے لگا اور حضرت یزیدؒ نے اسے دیکھا تو فرمایا ''تم روزانہ خلقِ خدا کا خون بہاتے ہو لیکن مجھ سے مسئلہ مچھروں کے خون کا دریافت کرتے ہو۔ (۵)''

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۸۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۱۔ (۳) ایضاً ص ۱۲۲۔ (۴) ایضاً۔

(۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲

علم وعقل:

ان کی یہ صاف گوئی کسی تند مزاجی پر مبنی نہیں تھی، ویسے وہ بہت بردبار اور خلیق وملنسار تھے۔ ابن یونس کا بیان ہے۔ ''وکان حلیما عاقلاً'' حضرت یزیدؒ خود فرماتے ہیں ''اگر میرا کوئی بھائی مجھ پر غضبناک ہوتا ہے تو میں اس کو دوبارہ غضبناک ہونے کا موقع نہیں دیتا بلکہ اس کے غصہ کا اصل سبب دریافت کرتا ہوں اور پھر جو بات اس کو بری لگتی ہے اسے چھوڑ دیتا ہوں۔''(۱)

علماء کا اعتراف:

ان کمالات کی وجہ سے علماءِ معاصرین ان کا بڑا احترام کرتے تھے لیث بن سعد انہیں ''سیدنا وعالمنا'' کہتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ لیث بن سعدؒ انہیں اور عبیداللہ بن جعفرؒ کو اپنے ملک کے دو جوہر بتاتے تھے۔ (۲) ابن وہبؒ کہتے ہیں ''اگر ان دونوں کو ایک ترازو میں رکھ دیا جائے تو دونوں برابر رہیں گے۔ کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوگی۔''(۳)

رجوع خلق:

پبلک میں ان کو عام ہر دلعزیزی اور عزت حاصل تھی۔ کسی خلیفہ کے ہاتھ پر جب تک یزید بن ابی حبیبؒ اور عبیداللہ بن جعفرؒ بیعت نہیں کر لیتے تھے کوئی اور شخص اقدام کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس عام شہرت و ہر دلعزیزی کے باعث ان کے پاس مسائل دریافت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آخر کار آپ نے تنگ آ کر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ (۴)

حلیہ:

رنگ آبنوس کی طرح سیاہ تھا۔ (۵)

وفات:

۱۲۸ھ میں وفات پائی۔ (۶)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۲۲۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۳۱۹۔ (۳) ایضاً۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۲۲۔ (۵) ایضاً۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۳۱۹ و تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۲۲۔

ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبداللہ نام والد کا نام ذکوان تھا۔کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی ،لیکن وہ ابوالزناد کے لقب سے اتنے مشہور ہوئے کہ لوگ ابوعبدالرحمٰن بھول گئے ۔مدینہ کے رہنے والے تھے۔عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی رملہ کے غلام تھےاس لئے قرشی کہلاتے تھے۔بعضوں کا خیال ہے کہ یہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے خاندان کے غلام تھے۔ (۱)

ولادت:

ان کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں۔لیکن حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوااوراس وقت ان کی عمر ۶۶ برس کی تھی۔ (۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۴ ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔تابعین کرام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

علم وفضل:

ابوالزنادؒ نے انس بن مالکؓ، ابوامامہ،عروۃ بن زبیر،قاسم بن محمد،ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، شعبی،علی بن الحسین اور سعید بن المسیب اور عبداللہ بن جعفرؓ سے سماع کیا تھا۔ان بزرگوں کے فیض صحبت اوران کے اپنے طبعی رجحان واستعداد نے انہیں علم وفضل کے آسمان کا کوکب تاباں بنادیا۔امام نووی لکھتے ہیں ''اورلوگوں نے متفقہ طور پر ابوالزناد کی کثرتِ علم،قوتِ حفظ،فضل،تنوع وتفنن فی العلوم،اوران کی ثقاہت وتوثیق اوران کے قابل حجت ہونے پر اتفاق کیا ہےاورسب نے مل کران کی بڑی ثنا کی ہے۔ (۳)

حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں: ''ابوالزناد حدیث میں امیرالمومنین ہیں'' (۴) امام بخاریؒ فرماتے ہیں ''بہترین سندیں دو ہیں ایک ''مالک عن نافع عن ابن عمرؓ '' اور دوسری ابوالزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃؓ'' علی بن المدینی کہتے ہیں ''کبارتابعین کے بعدابن شہاب، یحییٰ بن سعید، ابوالزناداور بکیر بن عبداللہ بن اشج سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغی ج ۲ص ۲۳۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ص ۲۰۴۔

(۳) تہذیب الاسماء ج ۲ص ۲۳۳۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۲۷۔

تلامذہ:

ان کا دامانِ فیض بھی بڑا وسیع تھا جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا بڑے پایہ کے علماء شمار کئے جاتے تھے، مثلاً ابن ابی ملیکہ، ہشام بن عروہ، ابواسحاق الشیبانی اور عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ۔

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال حاصل تھا یہاں تک کہ مدینہ کے اکابر فقہا میں شمار ہوتا تھا۔ حافظ ذہبی انہیں ''فقیہ المدینہ'' لکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ انہیں ربیعہ سے بڑا فقیہ بتاتے ہیں۔ (۱)

جامعیت:

ایک حدیث و فقہ ہی کیا، انہیں تقریباً تمام علوم متداولہ میں یکساں مہارت حاصل تھی مصعب الزبیری کہتے ہیں ''ابوالزناد اہل مدینہ کے فقیہ تھے اور کتابت وحساب کے بھی ماہر تھے۔'' ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مدینہ کے دفاتر سرکاری کی جانچ پڑتال انہیں کے سپرد تھی۔ (۲)

عبدربہ بن سعید کا بیان ہے ایک مرتبہ میں نے ابوالزناد کو دیکھا کہ ''مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کے ساتھ جیسا بادشاہوں کے جلو میں ہوتا ہے، تین سو طلباء کا جم غفیر تھا۔ اس مجمع میں کچھ لوگ فرائض، کچھ ریاضی اور حساب، چند ایک شعروشاعری، کچھ حدیث اور بعض کسی اور مسئلہ کی نسبت سوال کررہے تھے۔ اور وہ سب کو جواب دیتے جاتے تھے۔'' (۳)

علامہ ابن سعد فرماتے ہیں ''کان ابو الزناد ثقة كثير الحديث فصيحا بصيراً بالعربية عالماً عاقلاً'' ابن حبان کے نزدیک وہ ثقہ ہیں، فقیہ اور صاحب کتاب ہیں ابن عدی کہتے ہیں ''ان کی تمام حدیثیں درست اور صحیح ہیں''(۴) امام نسائی، عجلی، ساجی اور ابوجعفر الطبری سب نے ان کو ثقہ مانا ہے۔

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۷۔

(۳) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۴۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۵۔

ولایت:

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان کو اپنے عہد میں عراق کے خراج کا منصرم بھی بنایا تھا۔ ان کے ساتھ عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کام کرتے تھے۔ (۱)

وفات:

۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں جبکہ ایک مرتبہ یہ غسل کر رہے تھے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔

ربیعۃ الرائی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ربیعہ نام، ابو عثمان کنیت، رائی لقب، باپ کا نام فروخ اور ابو عبد الرحمٰن کنیت آل منکدر کے غلام تھے۔

پیدائش اور تعلیم:

ان کی پیدائش اور تعلیم کا عجیب واقعہ ہے، حضرت ربیعہؒ کے والد ابو عبد الرحمٰن فروخ کو بنوامیہ کے عہد میں خراسان کی ایک مہم پر جانا پڑا، اس وقت ربیعہ شکم مادر میں تھے۔ فروخ نے چلتے وقت اپنی بیوی کے پاس تیس ہزار دینار گھر کے اخراجات کے لئے چھوڑ دیے تھے۔ خراسان پہنچ کر کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ فروخ پورے ستائیس برس تک وطن (مدینہ) واپس نہ آسکے۔ ربیعہ کی والدہ نہایت روشن خیال اور عقلمند تھیں۔ ربیعہ سنِ شعور کو پہنچے تو انہوں نے ان کے لئے تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا اور اس سلسلہ میں جتنا روپیہ ان کے پاس تھا سب خرچ کر ڈالا ستائیس برس کے بعد جب فروخ مدینہ واپس آئے تو اس شان سے کہ گھوڑے پر سوار تھے اور ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔ مکان پر پہنچ کر نیزے کی نوک سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک سن کر ربیعہ دروازہ پر آئے۔ اس وقت باپ بیٹے آمنے سامنے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بالکل نا آشنا تھا۔ ربیعہ نے فروخ کو اجنبی سمجھ کر کہا ''اے دشمن خدا! تو میرے مکان پر حملہ کرتا ہے؟'' فروخ بولے ''نہیں!

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ص ۱۸۲۔

بلکہ اے دشمنِ خدا! تو میرے حرم میں گھسا ہوا ہے۔'' اسی میں بات بڑھ گئی، اور نوبت بانیجا رسید کہ دونوں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو گئے۔ اس شور وغل اور ہنگامہ کی آواز سے آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ شدہ شدہ خبر امام مالک بن انس کو بھی پہنچ گئی۔ ربیعہ اس وقت گو عمر کے لحاظ سے نوجوان تھے لیکن علم وفضل میں ان کا چرچا دور دور تک پھیل گیا تھا، اور امام مالک ایسے ائمۂ حدیث ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ امام مالک اور ان کے ساتھ بعض دوسرے مشائخ وقت اس لئے یہاں آئے تھے کہ اپنے استاذ حضرت ربیعہ کی امداد کریں۔ امام مالک جس وقت یہاں پہنچے تو ربیعہ اس وقت فروخ سے کہہ رہے تھے ''خدا کی قسم! میں تم کو بادشاہ کے پاس لے جائے بغیر نہیں مانوں گا'' اس پر فروخ کہتے تھے ''اور میں تم کو کس طرح بادشاہ کے سامنے پیش کرنے سے باز رہ سکتا ہوں۔ جبکہ تم یہاں میری بیوی کے پاس ہو۔'' لوگ درمیاں میں بیچ بچاؤ کرا رہے تھے۔ لیکن شور وشغب برابر بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے امام عالی مقام حضرت مالک بن انس کو آتے ہوئے دیکھا تو سب چپ ہو گئے۔ امام نے آتے ہی فروخ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''بڑے میاں! آپ کسی دوسرے گھر میں قیام کر لیجئے۔'' فروخ بولے ''وہ تو میرا ہی گھر ہے، میرا نام فروخ ہے اور میں بنو فلاں کا غلام ہوں'' حضرت ربیعہ کی ماں نے اندر سے جو یہ سنا تو باہر نکل آئیں اور انہوں نے کہا ''ہاں یہ فروخ میرے شوہر ہیں اور یہ ربیعہ میرے لڑکے ہیں۔ فروخ جب خراسان کی مہم پر جا رہے تھے، ربیعہ میرے شکم میں تھے۔ اس حقیقت کے کھل جانے پر باپ بیٹے دونوں نے معانقہ کیا اور خوب مل کر رو دئے۔ اب فروخ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی سے ربیعہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ''یہ میرا بیٹا ہے؟'' بولیں ''ہاں'' تھوڑی دیر کے بعد فروخ نے بیوی سے اس روپیہ کے متعلق دریافت کیا جو وہ خراسان جاتے ہوئے ان کو دے گئے تھے اور کہا کہ لو میرے ساتھ یہ چار ہزار دینار اور ہیں۔ یہاں یہ سب روپیہ حضرت ربیعہ کی تعلیم پر خرچ ہو چکا تھا۔ بیوی بولیں ''میں نے وہ مال دفن کر دیا ہے۔ چند روز کے بعد نکال دوں گی، ابھی ایسی جلدی کیا ہے'' معمول کے مطابق حضرت ربیعہ وقت پر مسجد میں تشریف لے گئے اور درس دینا شروع کر دیا جس میں امام مالک حسن بن زید ابن ابی علی، اور دوسرے اعیان مدینہ شریک تھے۔ والدۂ ربیعہ نے درس کا وقت پہچان کر فروخ سے کہا کہ جاؤ نماز مسجد نبوی میں پڑھنا، اب فروخ یہاں آئے، نماز پڑھی، پھر انہوں نے دیکھا کہ درس حدیث کا ایک زبردست حلقہ قائم ہے۔ ان کو سننے کا شوق ہوا، حلقہ کے قریب چلے آئے۔ لوگوں نے ان کو دیکھ کر راستہ دینا شروع

کردیا۔ حضرت ربیعہ نے درس میں خلل پڑنے کے خیال سے سر جھکا لیا، اور ایسے ہوگئے کہ گویا انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ فروخ اس حالت میں انہیں شناخت نہ کرسکے۔ لوگوں سے پوچھا ''یہ کون ہیں؟'' جواب ملا ''ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن'' ابوعبدالرحمٰن فروخ فرطِ مسرت سے بے تاب ہوگئے اور کہنے لگے ''اللہ نے میرے بیٹے کا مرتبہ بلند کیا ہے'' گھر واپس آئے تو بیوی سے بولے ''میں نے آج تمہارے بیٹے کو ایسی شان میں دیکھا ہے کہ کسی صاحبِ علم وفقہ کو نہیں دیکھا'' اب حضرت ربیعہ کی والدہ نے کہا ''آپ کو کیا چیز زیادہ پسند ہے وہ تیس (۳۰) ہزار دینار یا یہ جاہ و منزلتِ علمی؟'' فروخ بولے ''نہیں خدا کی قسم یہ وجاہت زیادہ محبوب ہے'' کہنے لگیں ''میں نے وہ سب روپیہ اسی پر صرف کردیا ہے فروخ نے کہا ''تم نے وہ روپیہ صحیح مصرف میں خرچ کیا ہے۔''(۱)

علم وفضل:

حضرت ربیعہ کی عاقلہ وفرزانہ والدۂ ماجدہ نے جس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کی تعلیم پر روپیہ خرچ کیا تھا، اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ ان کا فرزندِ ارجمند ایک غلام زادہ ہونے کے باوجود علم وفضل کے آسمان پر مہر جہانتاب بن کر چمکا اور دنیا کو اپنی فیض بار شعاعوں سے فائدہ پہنچایا۔ حضرت ربیعہ کی جلالتِ شان علم تمام علماء ومحدثین میں مسلم ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں ''تمام علماء محدثین ان کی توثیق، جلالت اور علم وفہم میں ان کی بلندی مرتبت پر متفق ہیں۔''(۲) ابن الماجشون کہتے ہیں ''میں نے ربیعہ سے بڑھ کر کوئی حافظ سنت نہیں دیکھا۔''(۳)

سوار بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے ربیعۃ الرائی سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ اس پر کسی نے ان سے پوچھا ''حسنؒ اور ابن سیرینؒ بھی نہیں؟'' بولے ''ہاں حسنؒ اور ابن سیرینؒ بھی نہیں۔''(۴) حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں کہ ''وکان اماماً حافظًا فقیھاً مجتھدًا بصیراً بالرای'' (۵)

حدیث:

حضرت ربیعہ نے متعدد صحابۂ کرام اور کئی ایک تابعین عظام سے فیض صحبت اٹھایا تھا جس کی وجہ سے وہ حدیث کے ممتاز حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ خطیب بغدادی اور حافظ ذہبی ان کو ''حافظ للحدیث'' لکھتے ہیں۔ انہوں نے جن ائمۂ حدیث سے روایت کی ہے ان

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۱، ۴۲۲۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۹۰۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۹۔
(۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۳۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸۔

میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ حضرت انس، سائب بن یزید، محمد بن یحییٰ بن المسیب، قاسم بن محمد، ابن ابی لیلیٰ، اعرج، مکحول، حنظلہ بن قیس الزرقی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت ربیعہ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ قیاس اور رائے سے زیادہ کام لیتے ہیں اسی بنا پر ان کو رائی کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ حافظ سنت تھے اور ان کی جو رائے ہوتی تھی سنت کی روشنی میں ہوتی تھی، چنانچہ عبدالعزیز بن ابی سلمہؒ نے ایک مرتبہ اہل عراق کو خطاب کر کے کہا ''اے عراق والو تم ربیعہ کو رائی کہتے ہو، حالانکہ میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ سنت نہیں دیکھا۔''(۱) حافظ ابن حجر ان کو ''ثقہ کثیر الحدیث بتاتے ہیں۔''

فقہ:

فقہ حضرت ربیعہ کی کلاہ افتخار کا طرۂ امتیاز ہے، اور ان کی شہرت اسی میں زیادہ ہے اور اس میں امامت واجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔'' حافظ ذہبی انہیں امام فقیہہ ومجتہد لکھتے ہیں۔ خطیب بغدادی بھی انہیں حافظ للفقہ والحدیث کا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔''(۲) امام مالک جو خود بہت بڑے فقیہ اور امام تھے، حضرت ربیعہ کی وفات ہوئی تو انہوں نے فرمایا ''ذهبت حلاوة الفقه'' فقہ کا مزہ ہی جاتا رہا۔''(۳)

امام ابوحنیفہ بھی حضرت ربیعہ کے تلمیذ تھے۔ ابن زید کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ کو حضرت ربیعہ کی خدمت میں دیکھا ہے، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ربیعہ جو کچھ فرمائیں اسے کما حقہ سمجھ لیں۔(۴)

ذہانت وفطانت:

ان کے فقہی کمال کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فطرتاً نہایت ذہین وفطین واقع ہوئے تھے۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں ''میں نے ربیعہ سے زیادہ کوئی صاحب فطانت وذہانت نہیں دیکھا۔'' ایک دوسری روایت میں ان کے الفاظ ہیں: '' ما رأيت احداً اَسَدَّ عقلا من ربيعة بن ابى عبدالرحمٰن.'' (۵)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۰۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۹۵۔
(۴) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۲۔ (۵) ایضاً ص ۴۲۳۔

فتویٰ:

اس فقہی کمال کی وجہ سے ان کو مدینہ طیبہ میں افتاء کا شرف حاصل تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "وكان صاحب الفتوىٰ بالمدينة". (۱)

احتیاط:

لیکن فتویٰ دینے میں وہ بڑے محتاط تھے۔ جب تک کسی چیز سے متعلق ان کو ذاتی طور پر تسلی وتشفی نہیں ہوتی تھی وہ اس پر کوئی حکم نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے مرض الموت میں عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے ان سے کہا "ہم کو آپ اب تک تعلیم دیتے رہے ہیں لیکن ہمارے پاس بعض اوقات لوگ ایسی چیزوں کی نسبت سوال کرتے ہیں جن کے بارہ میں ہم نے آپ سے کچھ نہیں سنا تو کیا ایسے مواقع پر آپ ہم کو اجازت دیتے ہیں کہ اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دے دیں، کیونکہ ہماری رائے ان کی رائے سے بہر حال بہتر ہوگی۔" حضرت ربیعہؒ یہ سن کر بولے "مجھ کو ذرا بٹھا دو" اس کے بعد فرمایا "عبدالعزیز تم پر افسوس ہے، تم جاہل ہو کر مرو! یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم کسی چیز کے متعلق بغیر علم کے کوئی حکم بیان کرو۔ پھر نہیں، نہیں، تین مرتبہ فرمایا (۲) یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں۔ حضرت ربیعہؒ بڑے بڑے مشکل مسائل کو حل کرتے تھے اور اہل مدینہ کے رئیس الفتویٰ تھے۔ (۳)

اہل عراق نے ان پر قیاس آرائی اور رائے زنی کی جو تہمت لگائی تھی حضرت ربیعہؒ اس سے بہت ناراض تھے۔ چنانچہ جب وہ عراق جانے لگے تو انہوں نے امام مالکؒ سے فرمایا "اگر تم یہ سنو کہ میں نے اہل عراق کے سامنے کوئی حدیث بیان کی ہے یا کسی مسئلہ میں ان کو فتویٰ دیا ہے تو تم مجھ کو نا قابل اعتبار چیز سمجھنا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ عراق میں پہنچ کر بالکل خانہ نشین رہے۔ وہاں نہ کسی سے کوئی حدیث بیان کی اور نہ کسی مسئلہ میں کوئی فتویٰ دیا۔ (۴)

قضاء:

کمال تفقہ کے باعث ابو عباس السفاح نے حضرت ربیعہؒ کو عہدۂ قضا پیش کرنا چاہا تھا اور اس مقصد کے لئے کسی بہانہ سے اس نے ان کو انبار بلوا بھی لیا تھا۔ (۵) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۹۵۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۸۹۔

(۴) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۵۔ (۵) ایضاً ص ۴۲۱۔

انہوں نے سفاح کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ حضرت ربیعہؒ طبیعت کے نہایت خوددار اور آزادی پسند تھے اور وہ سفاح سے کشیدہ خاطر بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ سفاح نے ان کی خدمت میں ایک تحفہ بھیجا تو انہوں نے اس کو رد کردیا۔ اس کے بعد اس نے پچاس ہزار درہم بھیجے تاکہ حضرت ربیعہؒ ان سے اپنی خدمت کے لئے کوئی لونڈی خرید سکیں۔ آپ نے یہ رقم بھی قبول نہیں کی۔ (۱) اس کے علاوہ آپ کے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ اس عہدہ کو ایک دنیادارانہ مشغلہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن یحییٰ بن سعیدؒ سے انہوں نے باتوں باتوں میں قضا کی نسبت ارشاد فرمایا کہ ''یہ تمہارے لئے ان چیزوں میں بہتر ہے جو تم دنیوی مال و متاع سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔'' (۲)

درس:

جیسا کہ شروع میں گزر چکا ہے، حضرت ربیعہؒ مسجد نبوی میں حدیث کا اور فقہ کے مسائل کا درس دیتے تھے۔ جس میں بڑے بڑے اعیان علماء شرکت کرتے تھے ایک مرتبہ شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے حلقہ میں چالیس چوٹی کے علماء شامل تھے جن کے سروں پر عمامے بندھے ہوئے تھے۔ ان کی تقریر عقل و حکمت کے مضامین سے پُر ہوتی تھی۔ ابن زید کا بیان ہے کہ ''حضرت ربیعہؒ ایک زمانہ تک خانہ نشین رہے۔ جس میں ان کا مشغلہ بجز شب و روز نماز پڑھنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر انہوں نے لوگوں میں نشست و برخاست شروع کردی۔ اور وہ جب کبھی بولتے تھے عقل و حکمت کی باتیں کرتے تھے۔'' (۳)

تلامذہ:

ان کے فیضان درس نے ایک کثیر جماعت کو علم و عمل کا پیکر بنادیا۔ جن میں امام مالک بن انسؒ، یحییٰ بن سعید الانصاری۔ اور سلیمان التیمی، شعبہ، سفیان بن عیینہ، سفیان الثوری، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد اور ابوضمرہ بھی شامل ہیں (۴)۔ یحییٰ بن سعیدؒ عمر میں حضرت ربیعہ سے بڑے تھے لیکن بقول متنبی۔

وشیخ فی الشباب ولیس شیخًا
یسمّٰی کل من بلغ المشیبا

---

(۱) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۵۔ (۲) ایضاً ص ۴۲۳۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸۔

حضرت ربیعہؒ پھر بھی یحییٰؒ کے شیخ تھے۔ اور وہ اگرچہ خود بھی اس پایہ کے عالم اور بزرگ تھے کہ حضرت ربیعہؒ کی غیر موجودگی میں بہترین حدیثیں لوگوں کو سناتے اور ان کا درس دیتے تھے۔ لیکن شیخ کی عظمت وجلالتِ شان کا یہ عالم تھا کہ اثناء درس میں آجاتے تو یحییٰ رک جاتے تھے۔ (۱)

یحییٰ بن سعید تو پھر بھی تلمیذ تھے۔ حضرت ربیعہؒ کی امامت و وسعت نظر کا اعتراف خود ان کے اساتذہ کو بھی تھا۔ چنانچہ قاسم بن محمد جوان کے شیخ ہیں، ان کے پاس اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں فتویٰ لینے آتا اور انہیں اس کا جواب قرآن مجید یا سنت نبوی میں معلوم ہوتا تھا تو وہ اسے فتویٰ دے دیتے تھے۔ ورنہ فرماتے کہ تم ربیعہؒ یا سالمؒ کے پاس جاؤ۔ (۲)

سیر چشمی:

ان علمی کمالات کے ساتھ وہ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ سلاطین و امراء کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خرچ کرنے میں بڑے فیاض تھے۔ اپنے ضرورتمند احباب، احباب کی اولاد اور شاگردوں کی ضرورتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ابن وہبؒ کا بیان ہے کہ ربیعہؒ بڑے سخی تھے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں پر چالیس (۴۰) ہزار دینار خرچ کئے (۳)۔ ابنِ زید کہتے ہیں ''میں نے مدینہ میں ربیعہ سے بڑا کوئی سخی نہیں دیکھا۔ ان کا مال جو کچھ ان کے پاس تھا، ان کے دوستوں، دوستوں کے بچوں یا سائلین کے لئے وقف رہتا تھا (۴)۔ وہ جس طرح اپنا مال دوستوں کے لئے وقف رکھتے تھے اسی طرح ضرورت کے وقت ان کو دوستوں سے روپیہ طلب کرنے میں بھی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کے متعلقین نے کہا ''آپ نے اپنا سب مال تو خرچ کر دیا۔ اب دوستوں سے طلب کرتے پھرتے ہیں آپ کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس سے آپ کی شان میں بٹہ لگتا ہے'' آپ نے فرمایا ''میرا اور میرے دوستوں کا معاملہ ایک ہے، میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی مجھ کو میری علمی وجاہت کی وجہ سے دیتا ہے۔'' (۵)

---

(۱) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۳۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۹۔

(۴) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴۔ (۳) خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۳۔

قوت گویائی:

حضرت ربیعہؒ کلام بہت کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ''خاموش آدمی خوابیدہ اور گونگے کے درمیان ہوتا ہے''[1] اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ایک دن حضرت ربیعہؒ اپنی مجلس میں تقریر کر رہے تھے کہ اتفاق سے ادھر ایک اعرابی آنکلا اور وہاں کھڑا ہو کر دیر تک آپ کی تقریر خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ حضرت ربیعہؒ نے خیال کیا کہ اعرابی ان کی طاقتِ لسانی اور فصاحتِ بیانی سے متاثر ہوگیا ہے۔ آپ نے ''اس سے دریافت کیا'' اے اعرابی! تم لوگوں کے نزدیک بلاغت کی کیا تعریف ہے؟'' اعرابی بولا ''مختصر لفظوں کے ساتھ معنی صحیح صحیح ادا کرنا'' پھر پوچھا ''اور عجز عن الکلام کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا ''وہ جس میں تم مبتلا ہو'' حضرت ربیعہؒ کو یہ سن کر بڑی ندامت ہوئی۔[2]

وفات:

حضرت ربیعہؒ کی وفات میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۳۰ھ بتاتا ہے۔ اور کوئی ۱۳۶ھ لیکن موخر الذکر روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ علامہ خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں ''وقول من قال سنة ست و ثلاثين ومائة اصح'' علامہ ابن خلکان بھی اسی کو صحیح اور مورخین کا متفق علیہ بتاتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ربیعہؒ ہاشمیہ میں دفن کئے گئے تھے جس کو انبار میں سب سے پہلے خلیفۂ عباسی سفاح نے آباد کیا تھا۔ اور سفاح بروز جمعہ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲ھ تخت نشین ہوا ہے اس بنا پر اگر ربیعہ کی وفات ۱۳۰ھ میں تسلیم کی جائے تو پھر ہاشمیہ میں ان کا دفن ہونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۹۴۔ (۲) ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۳۔

محمد بن عجلان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام، ابو عبداللہ کنیت، مدینہ کے رہنے والے۔ اور فاطمہ بنت الولید بن عتبہ بن ربیعہ کے غلام تھے۔ انہوں نے کم سنی میں بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ اس لئے ان کا شمار صغارِ تابعین میں ہے۔ ان کے والد کا نام عجلان تھا جس کی نسبت خود محمد بن عجلان کا ایک عجیب بیان یہ ہے کہ ''وہ شکمِ مادر میں تین سال رہے تھے۔''(۱)

علم وفضل:

علم وفضل اور زہد واتقاء کے لحاظ سے تابعین میں ان کو مرتبہ بلند حاصل تھا۔ حافظ ذہبی انہیں ''الامام القدوۃ'' اور پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں ''وہ مفتی، فقیہ، عالم، عامل ربانی، بلند مرتبت بزرگ تھے۔''(۲)

امام نووی لکھتے ہیں ''ابن عجلان امام، فقیہ اور عابد تھے''(۳) ابن عماد الحنبلی کہتے ہیں ''وہ عابد، پابند شریعت اور صداقت شعار تھے''(۴)۔ ابن عجلان سراپا پیکر علم وفضل تھے عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ ''کوئی شخص ابن عجلان سے بڑھ کر علماء سے مشابہ نہیں تھا۔ میں ان کو تمام اربابِ علم میں یاقوت سے تشبیہ دیتا تھا۔''(۵)

حدیث:

حدیث میں ان کو مرتبہ کمال حاصل تھا۔ حافظ ابن حجرؒ واقدی کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں: ''ابن عجلان ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔'' ابوزرعہ، ابوحاتم، امام نسائی، عجلی، یحییٰ بن معین، اور ابنِ حبان سب ان کو ثقہ تسلیم کرتے ہیں۔ ابن عیینہ سے کسی نے ان کی نسبت دریافت کیا تو کہا "کان ثقة عالما"(۶)

انہوں نے صحابہ کرام میں انس بن مالکؓ اور ابوالطفیلؓ سے اور تابعین میں اپنے والد ماجد، عکرمہ، نافع، سعید المقبری، اور رجاء بن حیوۃ، اعرج، اور ابوالزناد، زید بن اسلم وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے سماعِ حدیث کیا تھا۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۵۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۵۶۔ (۳) تہذیب الاسماء ج اص ۸۷۔

(۴) شذرات الذہب ج اص ۲۲۲۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۵۶۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۹ص ۳۴۲۔

درس:

خاص مسجد نبوی میں درس دیتے تھے جس میں کثرت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی کا بیان ہے "له حلقة كبيرة في مسجد النبي صلى الله عليه وسلم." (۱)

ان کے خوشہ چینوں میں امت کے ائمۂ کبار شامل ہیں۔ مثلاً عبید اللہ بن عمر، منصور بن المعتمر، مالک بن انس، لیث بن سعد، ثوری، ابن عیینہ، حیوۃ بن شریح، شعبہ، قطان، عبداللہ بن ادریس اور ولید بن مسلم رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (۲)

فقہ:

فقہ میں بھی ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ ابن سعد، حافظ ذہبی، اور امام نووی ان کو فقیہ لکھتے ہیں۔ فتویٰ بھی دیتے تھے۔ "وكان يفتي۔" (۳)

عبادت اور زہد:

ان علمی کمالات کے ساتھ زہد وورع بھی ان کی قباء کمال کا تکمۂ زریں تھا حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "وكان احد العلماء العاملين" حافظ ذہبی انہیں "عامل ربانی، لکھتے ہیں۔" ابن سعد انہیں "عابدا ناسكا" کہتے ہیں۔

جلالتِ شان

علمی وعملی کمالات کے باعث لوگ ان کو "مدینہ منورہ کا حسن بصری" سمجھتے تھے ایک دفعہ کسی بات پر ناراض ہوکر گورنر مدینہ جعفر بن سلیمان نے ان کو کوڑوں کی سزا دینے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اس سے کہا "خدا تمہاری اصلاح کرے۔ اگر حسن بصریؒ ایسا کرتے تو تم ان کو بھی کوڑے لگواتے اس نے کہا نہیں" لوگوں نے کہا "تو پس ابن عجلان بھی مدینہ کے حسنؒ ہیں" یہ سن کر جعفر اپنے ارادہ سے باز آ گیا اور انہیں معاف کردیا۔

وفات:

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسکندریہ پہنچ کر کسی عورت سے نکاح کرلیا تھا لیکن وہاں موافقت نہ ہوسکی، آپ پھر مدینہ واپس آ گئے جہاں ۱۴۸ھ میں وفات پائی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۷۔
(۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۴۲۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۷۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام ابو عبداللہ کنیت ، والد کا نام اسحاق تھا۔ ان کے دادا یسار عین التمر کے اسیرانِ جنگ میں سے تھے۔ اسی بنا پر ابن اسحاق بھی قیس بن مخرمہ بن مطلب کے غلام لکھے جاتے ہیں۔

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار ممتاز تابعین میں ہے، بالخصوص فنِ مغازی اور سیرت میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں'' وہ علم کے سمندر تھے، نہات ذکی، قوی الحافظہ، علم کے پُرشوق طالب، عالمِ اخبار (روایات) ماہرِ انساب، اور علامۂ روزگار۔''(۱)

حدیث:

حدیث میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ شعبہ ان کو''امیر المومنین فی الحدیث'' اور''امیر المحدثین'' کہتے ہیں۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں''اگر میرے بس میں ہوتا تو میں محمد بن اسحاقؒ کو محدثین کا امیر بنا دیتا''(۲) علی بن المدینی کا بیان ہے کہ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا دارومدار چھ اشخاص پر رہ گیا ہے۔ آپؒ نے ان سب کے نام لئے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ''ان چھ شخصوں کا علم بارہ علماء کی طرف منتقل ہوگیا۔ انہی میں سے ایک محمد بن اسحاق ہیں۔''(۳) ابراہیم الحربی سے کسی نے پوچھا''محمد بن اسحاق کے بارہ میں کسی نے کلام کیا ہے؟'' بولے ان کی نسبت سفیان بن عیینہؒ تو یہ کہتے تھے کہ جب تک یہ لڑکا (محمد بن اسحاق) زندہ رہے گا مدینہ میں علم باقی رہے گا'' علی بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت سفیان کی زبانی سنا ہے، فرماتے تھے ''میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو محمد بن اسحاق کو متہم کرتا ہو۔''

شعبہ ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں''اگر حدیث میں کسی کو سردار بنایا جائے تو محمد ابن اسحاق اس کے مستحق ہیں۔''(۴)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ص ۲۳۰۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۶۴۔ (۳) خطیب بغدادی ج ۱ص ۲۱۹۔
(۴) دیکھو ان مقولوں کے لئے بغدادی ج ۱ص ۲۲۷۔

امام زہریؒ کا اعتماد:

امام زہریؒ ان کے استاد تھے لیکن وہ خود محمد بن اسحاق کی وسعتِ علم کی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہری کسی سفر میں جانے لگے۔ طلبائے حدیث نے ان کی دور تک مشایعت کی تو آپ نے فرمایا "تم میرے ساتھ کیوں جارہے ہو۔ میں نے تم میں ایک غلام احول (محمد بن اسحاق) کو اپنا قائم مقام بنا کر چھوڑ دیا ہے۔" ساجی کا بیان ہے کہ "امام زہری کے اس ارشاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے طلباء کو امام زہری کی کسی روایت میں کوئی شک ہوتا تھا تو وہ محمد بن اسحاق سے ہی ان کے حافظہ پر اعتماد کی وجہ سے رفع شک کرتے تھے۔ (۱)" سفیان بن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام زہری کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں محمد بن اسحاق آ گئے۔ امام زہری نے ان سے فرمایا "دیر کہاں کر دی؟" محمد بن اسحاق بولے "کیا آپ کے ہاں دربان کے ہوتے ہوئے کوئی آسانی سے آ بھی سکتا ہے؟ امام زہری نے یہ سن کر فوراً دربان کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ "محمد بن اسحاق جس وقت بھی آئیں ان کو اندر آنے سے نہ روکا جائے۔" امام زہری کو محمد بن اسحاق پر جو اعتماد تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ فرماتے تھے "جب تک محمد بن اسحاق مدینہ کے لوگوں میں رہیں گے مدینہ میں علم بہت وافر رہے گا۔" (۲)

شیوخ:

انہوں نے حدیث میں قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، ابان بن عثمان، محمد بن علی بن الحسین، امام زہری، نافع مولی عبداللہ بن عمر، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، ابن المنکدر، مکحول، ابراہیم بن عقبہ، حمید الطویل، سالم ابوالنصر، ابوالزناد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، یزید بن ابی حبیب، یزید بن رومان وغیرہم رحمہم اللہ سے سماعت کی تھی۔ حضرت انس بن مالکؓ اور سعید بن المسیبؒ کو بچپن میں دیکھا تھا۔ لیکن سماعت نہیں کر سکے۔ امام زہری سے خصوصیت تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔ (۳)

تلامذہ:

جن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ان کی حدیثیں قبول کیں ان میں چند اکابر علم و دین کے اسماء گرامی یہ ہیں حضرت سفیان، شعبہ ابن عیینہ، حماد بن یزید، حماد بن سلمہ، ابن المبارک، ابراہیم بن سعد رحمہم اللہ تعالی۔

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۲۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۸۔

علم سیر ومغازی:

ان کا خاص فن سیر ومغازی تھا جس میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں ''وہ علم کے ظرف تھے، مغازی اور سیَر کے علم میں بڑے ماہر (حبر) تھے۔'' پھر ان کے متعلق چند اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ''جس چیز پر عمل مقرر ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ ابن اسحاق مغازی اور ایام نبویہ کے بیان میں مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر چہ وہ بعض اوقات ایسی نرالی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں جن میں وہ منفرد ہوتے ہیں۔ (۱)'' امام زہری سے کسی نے پوچھا ''آپ محمد بن اسحاقؒ کے مغازی کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟'' بولے ''وہ تو ان روایات کے سب سے بڑے عالم ہیں (۲)'' امام شافعی فرماتے تھے ''جو شخص مغازی میں مہارت پیدا کرنا چاہتا ہے اس کو بجز اس کے چارہ نہیں کہ محمد بن اسحاق پر اعتماد کرے۔'' (۳)

ان کی روایاتِ مغازی نے اس قدر شہرت پائی تھی کہ بادشاہوں کی محفلوں تک میں انہی کا ذکر ہوتا تھا۔ چنانچہ ابن عدی کا بیان ہے کہ ''اگر محمد بن اسحاق کے لئے کوئی اور فضل نہ ہوتا اور صرف یہی ایک بات ہوتی کہ انہوں نے بادشاہوں کو بے معنی کتابوں کے مطالعہ سے منحرف کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مغازی اور آپ کی بعثت اور ابتداء آفرینش کے ذکر واذکار کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ تو یہ بھی ایسی فضیلت ہے جس کی جانب انہوں نے سبقت کی ہے۔ اس میں شک نہیں اس کے بعد بھی ان کے طرز پر بعض لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن وہ ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے۔ ان کی حدیثیں بہت مشہور ہوئیں۔ مگر میں نے ان میں کوئی ایسی حدیث نہیں پائی جس کی وجہ سے ان پر ضعف کا قطعی حکم لگا دیا جائے، ہاں وہ بسا اوقات خطا بھی کر جاتے ہیں، یا کہیں کہیں انہیں کسی چیز میں شک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کی خطائیں تو دوسرے بھی کرتے ہیں اس سے ان کی شان میں کوئی خاص نقص لازم نہیں آتا۔'' (۴)

جامعیت:

وہ صرف علمِ حدیث ومغازی کے ہی بلند مرتبت عالم نہیں تھے بلکہ ہر قسم کے علم وفن سے دلچسپی رکھتے اور اس میں گفتگو کرتے تھے۔ عبداللہ بن قائد بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن اسحاق کے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۶۳، ۱۶۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۔

(۳) تاریخ بغدادی ج اص ۲۱۹۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴، ۴۵۔

پاس بیٹھتے تھے وہ جب کسی فن میں کلام شروع کرتے تو اسی مجلس میں ختم کر کے اٹھتے تھے"(۱)۔

علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وہ سیر و مغازی کے عالم تاریخ عالم سے باخبر، آغاز آفرینش کی تاریخ سے واقف۔ اور انبیاء کرام کے قصوں سے آگاہ تھے۔ اور ان سے ائمۂ علماء نے روایت کی ہے۔" (۲)

ثقاہت:

وسعت علم اور ثقاہت خصوصاً نقاد حدیث کی نگاہ میں دو مختلف چیزیں ہیں جہاں تک وسعتِ علم کا تعلق ہے قریب قریب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد بن اسحاق علم کے ناپیدا کنار سمندر تھے اور خصوصاً ان کو سیر و مغازی کے علم میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ حدیث کی کثرت روایات کا یہ عالم تھا کہ ابراہیم بن سعد کے پاس جو صرف احکام سے متعلق ابن اسحاق کی روایت کی ہوئی حدیثیں موجود تھیں ان کی تعداد سترہ ہزار تھی۔ (۳)۔ لیکن چند وجوہ سے انکی ثقاہت میں بڑا اختلاف ہے، ایک طرف سفیان بن عیینہ کا بیان یہ ہے کہ "میں کچھ اوپر ستر سال تک محمد بن اسحاق کا ہم نشین رہا، اس مدت میں اہل مدینہ میں میں نے کوئی ایسا شخص نہیں پایا جو ان کو متہم کرتا ہو، یا ان کی شان میں کوئی ایسی ویسی بات کہتا ہو۔" (۴)

مفضل الغلابی نے یحیٰی بن معین سے ان کی نسبت دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "کان ثقة وکان حسن الحدیث" (۵) اسی طرح اور بھی بعض بڑے بڑے ائمۂ حدیث کے اقوال ہیں جن سے ان کی ثقاہت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ان کے برعکس دوسری جانب امام مالکؒ اور ہشام بن عروہؒ نے ان پر سخت جرح کی ہے۔ اور ان کو بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔

امام مالکؒ اور ہشام بن عروہؒ کی شدید جرح کی وجہ:

اس قدر سخت جرح کی وجہ کیا ہے؟ کیا وہ حقیقتاً ناقابل اعتبار تھے یا اس جرح کی وجہ کچھ خارجی اسباب ہیں؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ محمد بن اسحاق امام مالک کی روایات پر زیادہ اعتنا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی نے ان کے سامنے امام مالکؒ کی چند روایتیں نقل کیں تو محمد بن اسحاق انہیں سن کر ہنس پڑے اور پھر چپ ہو کر رہ گئے۔ ایک مرتبہ لوگوں سے کہا تم مجھ کو مالک

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۱۵۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۱۔
(۴) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۹۔

کی حدیثیں سنایا کروں میں ان کے مرض کا طبیب ہوں۔'' امام مالک نے یہ سنا تو فرمایا ''اچھا! ابن اسحاق یہ کہتا ہے کہ مالک کی حدیثوں کا طبیب (بیطار) ہوں! ہم نے تو اس کو مدینہ سے جلاوطن کردیا ہے''[1]۔ اسی طرح ہشام بن عروہ کی جرح کا سبب بھی بعض لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ محمد بن اسحاق ہشام کی بیوی فاطمہ بنت المنذر رسے احادیث کی روایت کرتے تھے۔ ہشام نے یہ سنا تو سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے ''ابن اسحٰق بالکل جھوٹ کہتا ہے میری بیوی کو تو اس کی نو برس کی عمر سے جب سے میں نے اس سے شادی کی ہے آج تک کسی مخلوق نے دیکھا ہی نہیں''[2]۔ لیکن ادنیٰ تامل سے ان دونوں توجیہات کی رکاکت ظاہر ہو جاتی ہے پہلی توجیہ کے غلط ہونے کی دلیل تو یہ ہے کہ اگر بالفرض محمد بن اسحاق کی نسبت یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو امام مالک کی احادیث کا ڈاکٹر کہتے تھے تب بھی امام مالک ایسے بلند مرتبہ اور مسلم الثبوت امام عالی مقام سے یہ امر بہت مستبعد ہے کہ وہ محض اپنے ذاتی انتقام کی وجہ سے ایک ثقہ کو کذاب اور دجال کہہ بیٹھیں۔ اب رہی ہشام کی جرح کی وجہ، تو اس کی لغویت اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس عہد میں مستورات سے احادیث کی روایت کرنے کا عام دستور تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ جو حجلۂ ''وقرن فی بیوتکن'' کی پردہ نشین خواتین میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہیں، خود ان سے کثرت سے روایتیں مروی ہیں۔ اس بناء پر ہشام کا محض یہ سن کر کہ محمد بن اسحاق ان کی بیوی سے روایت کرتے ہیں۔ ناراض ہو کر ان کو کذاب کہنا قطعاً غیر معقول بات ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ہشام نے ابن اسحاق پر جو اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے میری بیوی کو دیکھا کس طرح؟ اس کو تو نو برس کی عمر سے اب تک کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی عورت سے کوئی روایت نقل کرنا اس کے دیکھنے کو مستلزم نہیں ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہشام جیسا شخص اتنی ذرا سی بات کو نہ سمجھ سکے۔ اور وہ محض اپنی بیوی سے روایت کا ذکر سنتے ہی لعن طعن شروع کردے اور تہمت طرازی کرنے لگے۔ اور وہ بھی کسی معمولی آدمی پر نہیں بلکہ محمد بن اسحاق ایسے سن رسیدہ صاحب علم وفضل پر۔

ان دلائل کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ دونوں توجیہیں بالکل غلط ہیں کہ ان سے محمد بن اسحاق کی ثقاہت ہی نہیں بلکہ خود امام مالک اور ہشام بن عروہ کی ثقاہت پر بھی حرف آتا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ خود محمد بن اسحاق میں جلالتِ علم کے باوصف بعض ایسی کوتاہیاں تھیں جن کے باعث

---

(۱) تاریخ بغداد ج اص ۲۲۳۔ (۲) تاریخ بغداد ج اص ۲۲۲۔

امام مالکؒ نے جو علامہ خطیب بغدادی کے قول کے مطابق تنقید و تعدیل میں اتنے سخت تھے کہ ارباب صلاح و دیانت اور اصحابِ ثقاہت و امانت کی شان میں بھی بعض مرتبہ نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ (۱)

ان پر شدید جرح کر دی اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے خواہ محمد بن اسحاق کو کیسا ہی قوی الحافظ مانا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود انہیں اپنی قوت حفظ پر پورا اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ ان کا معمول تھا کہ کسی شخص کے پاس پانچ یا اس سے زیادہ حدیثیں ہوتی تھیں تو وہ اسے اپنی حدیث سنا کر فرماتے تھے۔ ''تم اس کو میری خاطر اپنے پاس ودیعت رکھ لو، ممکن ہے میں بھول جاؤں، تو تم مجھ کو یاد دلا سکو گے'' (۲)۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مغازی کی روایات قبول کرنے میں نہایت نرم واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان یہودیوں کی روایتوں کو بھی قبول کر لیا جو بعد میں اگرچہ مسلمان ہو گئے تھے، لیکن یہودیت کے زمانہ میں انہوں نے غزوۂ خیبر وغیرہ کے جو واقعات جس طرح سنے تھے اسی طرح ان کو بے تکلف نقل کرتے تھے (۳)۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ سہل انگاری صرف مغازی کے معاملہ میں ہی نہیں تھی بلکہ احادیث میں بھی وہ بعض اوقات اسی طرح کا تساہل کر جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے کسی نے ان کا ذکر کیا تو فرمایا ''محمد بن اسحاق ایک شخص تھے جو احادیث کے بڑے شوقین تھے، انہیں لوگوں کی کتابیں ملتی تھیں تو اپنی کتاب میں درج کر لیتے تھے۔'' امام احمد سے ایک موقع پر کسی شخص نے پوچھا ''اگر ابن اسحاق کسی روایت میں منفرد ہوں تو آپ اسے قبول کر لیں گے؟'' فرمایا نہیں! خدا کی قسم میں نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو ایک جماعت سے نقل کرتے تھے اور پھر اس کے اور اُس کے کلام میں کوئی فصل نہیں کرتے تھے۔'' (۴)

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان پر قدری ہونے کا شبہ تھا۔ اور بعض لوگوں کے اقوال سے اس شبہ کی تقویت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ دحیم سے کسی شخص نے امام مالک کا قول ان کی نسبت نقل کیا تو انہوں نے کہا ''یہ حدیث کی نسبت نہیں ہے۔ اور وہ مغازی کے بارہ میں ہے بھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک وہ قدریہ عقائد سے متہم تھے (۵)۔ دحیم نے تو صرف اتہام کا ہی ذکر کیا ہے۔ ہارون بن معروف صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ وہ قدری تھے'' (۶)۔

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۳۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۰۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۵۔

(۴) ایضاً ص ۴۳۔ (۵) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۴۔ (۶) ایضاً ص ۲۲۵۔

مکی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ محمد بن اسحاق نے صفات باری سے متعلق ایسی احادیث بیان کیں کہ مجھ کو ان سے نفرت ہوگئی اور میں پھر ان کے پاس کبھی نہیں گیا۔ ابن غسان کہتے ہیں ''میں ۱۹۳ھ میں مدینہ طیبہ میں تھا، وہاں یزید بن ہارون حدیث کا درس دیتے تھے۔ میں بھی اس میں شریک ہوتا تھا۔ اور اس حلقہ میں خاص اہل مدینہ کی بھی ایک جماعت ہوتی تھی۔ ایک دن انہوں نے درس دیتے دیتے محمد بن اسحاق کی چند روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں۔ اہل مدینہ یہ سنتے ہی کہنے لگے ''بس حضرت! ان کی حدیثیں رہنے دیجئے، انہیں تو ہم خوب پہچانتے ہیں'' یزید بن ہارون نے ہر چند ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ایک نہ مانے اور بالآخر انہیں درس ختم کرنا پڑا''(۱) پھر اس کے علاوہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کبھی کبھی ایسے افعال بھی سرزد ہو جاتے تھے جن کی وجہ سے محدثین اور خصوصاً نقادِ حدیث کی نظر میں ان کو پایۂ ثقاہت و حجیت حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً ابن ابی عدی کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق مرغوں سے کھیلتے تھے (۲)۔ ظاہر ہے یہ باتیں ثقاہت کے سخت منافی ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر تنہا امام مالکؒ اور ہشام بن عروہؒ ہی نہیں بلکہ اور بھی متعدد ائمۂ حدیث نے ان کو حجت ماننے سے انکار کیا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں ''وہ قوی نہیں ہیں'' دارقطنی کا قول ہے ''ان سے احتجاج نہیں ہو سکتا''(۳)۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں ''محمد ابن اسحاق کی مصیبت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات مجہول لوگوں کی روایت سے باطل حدیثیں نقل کر دیتے ہیں''(۴)۔ ابو عبداللہ کا بیان ہے ''محمد بن اسحاق بغداد آئے تو وہ ہر کس و ناکس سے روایت کر دیتے تھے، اور ثقہ غیر ثقہ میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔''

میں نے اپنے استاذ حضرتنا العلام مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ سے صحیح بخاری کے درس میں یہ بھی سنا ہے کہ دراصل اخیر عمر میں تقاضائے پیری سے محمد بن اسحاق کا حافظہ بہت کمزور ہو گیا تھا، اور اس پر طرفہ یہ ہوا کہ ان کا مجموعۂ احادیث جس سے وہ روایتیں پھر بھی بیان کرتے اور ان میں زیادہ احتیاط نہیں برتتے تھے۔ اس بناء پر صحیح روایتیں غیر صحیح روایتوں سے اس طرح خلط ملط ہو گئیں کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

اس تقریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق کی جلالتِ شان اور وسعتِ علم مسلّم، لیکن محدثین کے خاص معیار کے مطابق ان کی منفرد روایتوں کو لائقِ احتجاج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳۔

(۳) ایضاً ص ۱۶۴۔ (۴) خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۷۔

چنانچہ حافظ ذہبی کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں محمد بن اسحاق علم کے ظرف تھے، مغازی اور سیرۃ کا علم بہت وسیع رکھتے تھے۔ لیکن وہ ان چیزوں میں یقینی طور پر حجت نہیں۔ ان کی حدیث پایہ صحت سے فروتر ہے۔ اگرچہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے سچے اور پسندیدہ ہیں''(۱)۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں'' وہ حلال و حرام میں حجت نہیں، مگر ہاں ایسے کچھ زیادہ کمزور بھی نہیں ہیں۔ ان سے فی الجملہ سند لی جاسکتی ہے۔''(۲)

تصانیف:

انہوں نے سیرت اور تاریخ پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ فہرست ابن ندیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مشہور تصنیف کتاب المغازی کے علاوہ ایک کتاب کتاب الخلفاء، اور ایک کتاب السیرۃ والمبتداء کے نام سے بھی تھی۔(۳)

ان کی مشہور کتاب سیرت ابن اسحاق ہے۔ ابن ہشام میں کثرت سے اسی کتاب سے روایتیں اخذ کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ ایک مرتبہ محمد بن اسحاق خلیفہ عباسی مہدی کے پاس گئے تو اس وقت اس کے پاس اس کا بیٹا موجود تھا۔ مہدی نے کہا'' اے ابن اسحاق! آپ اسے پہچانتے ہیں؟'' بولے'' کیوں نہیں؟'' مہدی نے کہا'' تو اچھا! آپ اس لڑکے کے لئے ایسی کتاب لکھئے جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام حالات وواقعات مذکور ہوں'' آپ نے اس فرمائش کی تکمیل میں یہ کتاب لکھ کر پیش کی تو مہدی نے کہا'' یہ تو بہت طویل ہوگئی ہے۔ اسے مختصر کردیجئے'' چنانچہ انہوں نے اس کو مختصر کردیا۔ اور جو مفصل کتاب تھی وہ خزانہ شاہی میں محفوظ کردی گئی۔ علامہ بغدادی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ '' راوی نے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ ابن اسحاق بجائے مہدی کے منصور کے پاس گئے ہوں گے، اور اس وقت اس کے پاس مہدی موجود ہوگا۔ پھر منصور کی فرمائش پر انہوں نے یہ کتاب مہدی کے لئے لکھی ہوگی۔''(۴)

وفات:

پہلے وہ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے پھر کوفہ، جزیرہ اور رے وغیرہ مختلف مقامات میں پھرتے رہے، آخر میں بغداد میں مقیم ہوگئے اور یہیں ۱۵۱ھ یا ۱۵۲ھ میں وفات پائی، اور مقبرۂ خیزران میں دفن ہوئے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳۔ (۲) ایضاً ص ۱۶۲۔

(۳) فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶۔ (۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۱۔

اتباعِ تابعینؒ وغیرہم

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ابوعبدالرحمن کنیت عبداللہ نام والد کا نام مبارک تھا جو بنوحنظلہ کے ایک شخص کے غلام تھے مبارک اپنے آقا کے نہایت مطیع وفرمانبردار غلام اور پرہیزگار ومتقی تھے۔ یہ باغ میں کام کرتے تھے ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان سے ایک ترش انار طلب کیا تو انہوں نے شیریں انار لے جاکر پیش کردیا آقا کو بڑا غصہ آیا اور کہا ''تم شیریں اور ترش میں بھی امتیاز نہیں کرتے'' بولے ''ہاں'' اس نے وجہ پوچھی تو کہا ''آپ نے مجھ کو ترش انار کھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔'' آقا نے اس بات کی تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا درست تھا۔ اس شخص کو مبارک کی اس درجہ دیانتداری پر سخت حیرت ہوئی اور اسی دن سے اس کو ان کے ساتھ...... گرویدگی پیدا ہوگئی [1] اس کے ساتھ ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ مبارک کے آقا نے اپنی لڑکی کی شادی کرنی چاہی تو ان سے دریافت کیا، ''مبارک! میں اپنی اس بیٹی کی شادی کس سے کروں؟'' انہوں نے کہا ''عہد جاہلیت میں لوگ حسب کی تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کو داماد بنانے کے لئے مالدار کی جستجو ہوتی تھی، اور عیسائی جمال کو اہمیت دیتے تھے۔ لیکن امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک دیندار ہونا شرطِ شادی سمجھا جاتا ہے'' مبارک کے آقا کو ان کا یہ جواب بہت پسند آیا اور اس نے اپنی بیوی سے جاکر کہا ''میری بیٹی کا شوہر بننے کے لئے مبارک سے زیادہ مناسب کوئی اور شخص نہیں ہے۔''

آخرکار میاں بیوی دونوں راضی ہوگئے اور اس لڑکی کی شادی مبارک سے کردی گئی۔ [2]

ولادت:

حضرت عبداللہ اسی بیوی کے بطن سے مرو میں ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور اس مرو کی نسبت سے ہی مروزی کہلائے۔

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۸۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۶۔

تعلیم وتربیت:

ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہونے کے باعث حضرت عبداللہ سے آثارِ کمال وترقی بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ انہیں طلب علم کا اتنا شوق تھا کہ کم عمری میں بھی اس مقصد کے لئے سفر کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔[1] امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے ''ابن مبارکؒ کے زمانہ میں ان سے زیادہ طلب علم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔'' ابو اسامہ شہادت دیتے ہیں ''میں نے دنیا میں عبداللہ بن مبارکؒ سے زیادہ طلب علم کا جذبہ رکھنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔[2] انہیں طلب علم کے شوق میں اپنی حیثیت کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی ہر چھوٹے اور بڑے سے علم حاصل کرتے تھے۔''[3]

علم وفضل:

اس شوق وذوق اور محنت وجستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ہر علم وفن میں کمال حاصل ہو گیا۔ بڑے بڑے ائمہ عصر ان کی جامعیت علوم وفنون اور مہارت کا اعتراف کرتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں ''ابن مبارک امام، حافظ، علامہ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین، قدوۃ الزاہدین تھے۔''[4] عجلی انہیں ''جامع للعلم'' بتاتے ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں:

> ''کان فیه خصالٌ لم تجتمع فی احد من اهل العلم فی زمانه فی الارض کلها.''[5]
>
> ''ابن مبارک میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہیں ہوئے تھے۔''

امام نوویؒ فرماتے ہیں ''عبداللہ بن مبارک کی امامت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی تھی اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی تھی۔''[6] علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں 'ابن مبارکؒ نے علم طلب کیا، روایات کثیرہ بیان کیں، علم کے مختلف ابواب وانواع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ زہد میں اور ترغیب جہاد میں اشعار کہے۔ علم کثیر کی سماعت کی۔ وہ معتبر تھے، مقتدا، حجت اور کثیر الحدیث تھے۔''[7]

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۵۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ص ۳۸۴۔ (۳) تہذیب الاسماء ج اص ۲۸۶۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۵۳۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۵ص ۳۸۶۔

(۶) تہذیب الاسماء ج اص ۲۸۵۔ (۷) ایضاً ص ۲۸۶۔

حدیث:

حدیث ان کا خاص فن تھا اس کے لئے انہوں نے شام، مصر، یمن، حجاز اور عراق کے طویل و دشوار سفر کئے، اور اس زمانہ کے جلیل القدر ائمہ حدیث سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ان کے شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے۔ جس میں سے چند نام یہ ہیں:

شیوخ:

سلیمان التیمی، سلیمان الاعمش، حمید الطّویل، عبداللہ بن عون، یحیٰی بن سعید الانصاری، موسیٰ بن عقبہ، ابن جریج، مالک بن انس، سفیان الثوری، شعبہ، اوزاعی، ابوعوانہ، زہیر ابن معاویہ (۱)

مہارتِ فن:

ان اکابر امت کے فیضِ التفات اور خود اپنے ذاتی ذوق وشوق کے باعث عبداللہ بن مبارکؒ حدیث کے دریائے بیکراں بن گئے۔ ان کی مہارت و امامت کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی اور بعض وہ امام جن سے سماع حدیث کا اشتیاق ابن مبارکؒ رکھتے تھے خود وہ ان کی حدیثیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ احمد بن سنانؒ کا بیان ہے ''عبداللہ بن مبارکؒ پہلی مرتبہ حماد بن زیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا آپ کہاں سے آرہے ہیں؟'' بولے ''خراسان سے'' پوچھا ''خراسان کے کس شہر سے؟'' جواب دیا ''مرو سے'' پھر دریافت کیا ''وہاں ایک شخص ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارکؒ ہے آپ انہیں بھی جانتے ہیں؟'' کہا ''ہاں جانتا ہوں'' پوچھا ''وہ کس طرح ہیں؟'' بولے ''ابن مبارک ہی تو اس وقت آپ سے خطاب کر رہا ہے۔'' حماد بن زیدؒ یہ سن کر بے تاب ہو گئے۔ ان کو سلام کیا اور مرحبا کہا۔ (۲)

ابن مہدیؒ کہتے تھے ''ائمہ چار ہی ہیں امام مالک، ثوری، حماد بن زید، اور ابن مبارکؒ'' ''شعیب بن حربؒ کا بیان ہے ''ابن مبارکؒ جیسا کوئی شخص نہیں تھا شعبہ کا بیان ہے ''ہمارے پاس ابن مبارک جیسا بزرگ کوئی نہیں آیا۔'' ابواسامہ انہیں ''امیر المومنین فی الحدیث'' بتاتے ہیں۔ شعیب بن حرب نے ایک مرتبہ کہا ''میں نے ہر چند یہ چاہا کہ سال میں تین دن کے لئے ابن مبارکؒ جیسا بن جاؤں لیکن نہ بن سکا۔'' (۳)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۲۔ (۲) ایضاً ص ۱۵۴۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۴۔

ایک مرتبہ یحییٰ بن معین کے سامنے کسی نے ابن مبارکؒ کا ذکر کیا تو فرمایا "سید من سادات المسلمین"۔ فضیلؒ کہتے ہیں "رب کعبہ کی قسم میری آنکھوں نے ابن مبارک جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔" (۱)

اصحابِ حدیث میں اگر کبھی اختلاف ہوتا تو ابن مبارکؒ کی طرف رجوع کرتے تھے، فضالۃ النِّسوی کہتے ہیں "میں کوفہ کے علماءِ حدیث کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ان حضرات میں اگر کسی حدیث سے متعلق نزاع ہوتا تھا تو یہ کہتے تھے "چلو حدیث کے اس طبیب کے پاس چلیں اور اس سے حدیث کے بارہ میں پوچھیں۔" "یہ طبیب عبداللہ بن مبارک تھے۔" (۲)

قوت حافظہ:

حدیث کے لئے قوت حافظہ شرط اولین ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ کو قدرت نے اس نعمت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ صحر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے ایک دوست تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ "بچپن میں ایک مرتبہ میں اور ابن مبارکؒ دونوں ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص خطبہ دے رہا ہے۔ خطبہ طویل تھا، ہم دونوں سنتے رہے۔ خطبہ کے ختم پر ابن مبارکؒ بولے "مجھ کو یہ تمام خطبہ یاد ہوگیا جماعت میں سے کسی شخص نے یہ فقرہ سن لیا۔ بولا "اچھا سناؤ" ابن مبارکؒ نے فوراً وہ خطبہ از اوّل تا آخر سنا دیا۔" (۳)

احتیاط:

اس علم و فضل اور قوت حافظہ کے باوجود محتاط اس قدر تھے کہ محض حافظہ سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر روایت کرتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا "ابو عبدالرحمٰن! آپ احادیث یاد کرتے ہیں؟" یہ سنتے ہی رنگ بدل گیا۔ اور فرمایا میں نے کبھی کوئی حدیث یاد نہیں کی ہے۔ میں کتاب اٹھاتا ہوں اور اس میں غور و خوض کرتا ہوں، پھر جو روایت مجھ کو پسند ہوتی ہے وہ خود بخود دل میں بیٹھ جاتی ہے۔" (۴) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ابن مبارکؒ صاحب حدیث اور حافظِ حدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے۔" (۵) ابن معین کا بیان ہے کہ "وہ ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے" ان کی کتاب میں جو احادیث درج تھیں ان کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴۔ (۲) ایضاً ص ۲۵۵۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۶۔
(۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۵۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵۔

ابن مبارکؒ نے اپنی کتاب میں منتخب احادیث کا ایسا وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا جو روایت اس میں نہیں ملتی تھی لوگ اس سے مایوس ہو جاتے تھے۔ (۱)

حدیث سے شغف:

حدیث سے شغف کا یہ عالم تھا کہ علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے "ایک مرتبہ سردی کی رات میں ابن مبارکؒ (غالباً عشاء کی نماز پڑھ کر) مسجد سے نکل رہے تھے کہ دروازہ پر مجھ سے ملاقات ہوئی اور ایک حدیث پر گفتگو ہونے لگی، اس گفتگو کو اتنی طوالت ہوئی کہ فجر کی نماز کا وقت آ گیا اور مؤذن نے اذان دینی شروع کر دی۔" (۲)

اسی شغف بالحدیث کی وجہ سے وہ باہر کم نکلتے تھے۔ زیادہ تر گھر میں ہی بیٹھے ہوئے احادیث و آثار کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا "آپ کو مکان میں تنہا بیٹھے رہنے سے وحشت نہیں ہوتی؟" فرمایا "بھلا وحشت مجھ کو کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام کے ساتھ ہوتا ہوں۔" (۳)

نا اہلوں سے اجتناب:

نا اہل لوگوں کے سامنے حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ہاشمی شخص حضرت ابن مبارکؒ کے پاس آیا اور روایتِ حدیث کی درخواست کی آپ نے انکار کر دیا ہاشمی نے اپنے ملازم سے کہا "چلو" اور سواری پر بیٹھ کر جانے لگا ابن مبارکؒ نے فوراً اٹھ کر رکاب تھام لی۔ ہاشمی بولا "ابن مبارک! آپ حدیث تو سناتے نہیں اور یوں میری رکاب تھام رہے ہیں" فرمایا "میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے اپنے بدن کو ذلیل کر دوں لیکن حدیث تمہاری خاطر ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔" (۴)

اسناد کا اہتمام:

روایت کے معاملہ میں اسناد کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ مسیب بن واضح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے ابن مبارکؒ سے دریافت کیا کہ ہم کس سے علم حاصل کریں فرمایا ان لوگوں سے جنہوں نے علم محض اللہ کے لئے طلب کیا ہو اور اسناد کے معاملہ میں سخت ہوں۔ کیونکہ کبھی ایسا

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۵۴۔ (۲) ایضاً ج اص ۲۵۵۔

(۳) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۴۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۵۵۔

ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ملاقات کسی ثقہ شخص سے ہوتی ہے لیکن اس کی ملاقات غیر ثقہ سے ہوتی ہے اور وہ اس سے روایت کر بیٹھتا ہے کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔'' روایت کو چاہئے کہ ثقہ عن ثقۃ مروی ہو۔''(۱)

فقہ:

فقہ میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر، علامہ ذہبی، امام نووی، ابن عماد حنبلی سب ان کو فقیہ لکھتے ہیں۔ امام مالک فرماتے تھے'' یہ ابن مبارک خراسان کے فقیہ تھے۔''(۲)

ابن شماس کہتے تھے'' میں نے سب سے بڑے فقیہ کو دیکھا ہے اور سب سے بڑے متقی کو بھی، اور سب سے زیادہ قوی حافظہ رکھنے والے کو بھی۔ سب سے بڑے فقیہ ابن مبارک ہیں'' حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی موجودگی میں بڑے بڑے معتمد علماء فقہاء مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت سفیان ثوریؒ سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے دریافت کیا'' تم کہاں سے آئے ہو؟'' بولا میں اہل مشرق میں سے ہوں'' آپ نے فرمایا'' کیا تمہارے پاس مشرق کا سب سے بڑا عالم نہیں اس شخص نے کہا'' وہ کون ہیں؟'' بولے عبداللہ بن مبارکؒ'' یہ سن کر سائل نے تعجب سے کہا'' تو کیا ابن مبارکؒ مشرق کے سب سے بڑے عالم ہیں۔''(۳)

جامعیت:

ابن مبارک علمی و عملی کمالات کے ایک ایسے گلدستۂ سدا بہار تھے کہ ان کی جس کسی خصلت کو دیکھا جاتا نگاہِ تجسس محو حیرت ہو کر رہ جاتی تھی اور بے ساختہ زبان سے یہ شعر نکل جاتا تھا۔

زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اربابِ درس و تدریس اور اصحابِ علم و فضل ہوتے ہیں'' بادہ مرد افگن جنگ'' کے حریف بننے کی تاب ان میں کم ہوتی ہے۔ اور جو لوگ کتاب بینی میں زیادہ وقت گزارتے ہیں ان کے گھوڑے میدان غزا میں سرپٹ نہیں دوڑتے لیکن ابن مبارکؒ کی

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۷۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۳۔

ذات بیک وقت تمام علمی و عملی کمالات کی جامع تھی۔ عباس بن مصعب کہتے ہیں ''ابن مبارکؒ حدیث، فقہ، ایام رجال، بہادری، سخاوت، تجارت، ہر دلعزیزی ان تمام کے جامع تھے''(۱)۔ حسن بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن مبارک کے اصحاب جمع ہوئے اور انہوں نے کہا کہ آؤ ابن مبارکؒ کے خصائل وشمائل کو شمار کریں۔'' چنانچہ انہوں نے بالاتفاق کہا ''ابن مبارک کی ذات ستودہ صفات میں علم، فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، خموشی، قیامِ لیل، عبادت، حج، غزوہ، شہسواری، شجاعت، تندرستی و تومندی، فضول اور لغو باتوں سے اجتناب، اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرنا، یہ تمام صفات جمع تھیں''(۲)۔ حافظ ذہبی بڑے پُر اشتیاق انداز میں لکھتے ہیں ''خدا کی قسم! میں عبداللہ بن مبارکؒ سے محبت فی اللہ کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو بھلائیاں عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ نے ان کو پرہیز گاری، عبادت، اخلاص، جہاد، وسعت علم، پختہ یقینی، ہمدردی، غمگساری، مروّت اور دوسری صفاتِ حمیدہ سے متصف کیا ہے۔''(۳)

''ان کی اس شانِ جامعیت کے باعث ابواسحاق انقراری انہیں امام المسلمین کہتے تھے۔''(۴)

مرجع خلائق:

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے فضل و کمال کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی لوگ ان کی زیارت و ملاقات کے لئے بے چینی کے ساتھ کسی مناسب موقع کے منتظر رہتے تھے عبدالرحمن بن یزید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام اوزاعیؒ نے ان سے پوچھا ''تم نے کبھی عبداللہ بن مبارکؒ کو بھی دیکھا ہے؟'' انہوں نے کہا ''نہیں'' فرمایا:

''لو رأیته لقرت عینک.''(۵)

''اگر تم انہیں دیکھ لیتے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔''

وہ جدھر جاتے تھے ارادتمندوں اور عقیدت گساروں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید رقہ میں فروکش تھا کہ اسی اثناء میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے یہاں تشریف لانے کی خبر پہنچی۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بے تحاشا دوڑ پڑے اور اس قدر

---

(۱) تہذیب الاسماء ج اص ۲۸۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۵۴۔

(۴) خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۳۔ (۵) ایضاً ص ۱۵۷۔

کشمکش ہوئی کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں ہزاروں آدمی استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل پڑے تھے۔فضا پر غبار چھا گیا تھا۔ہارون الرشید کی ایک حرم (ام ولد) نے محل کے برج پر سے جو یہ تماشا دیکھا تو پوچھا ''یہ کیا معاملہ ہے؟'' حاضرین نے کہا ''خراسان کے ایک عالم جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے رقہ آرہے ہیں۔'' بولی ''بخدا! بادشاہ تو یہ ہیں، بھلا ہارون کیا بادشاہ ہے جو پولیس اور سپاہیوں کے بغیر لوگوں کو جمع کر ہی نہیں سکتا۔'' (۱)

جب حضرت عبداللہ بن مبارک مرو سے روانہ ہوئے تو اہلِ مرو کو آپ کی جدائی کا سخت رنج وقلق ہوا۔ایک شاعر نے ان لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

''اذا سارعبد الله من مرو ليلة
فقد سارمنها نورها وجمالها
اذا ذكر الاحبار فى كل بلدة
فهم انجمٌ فيها وانت هلالها''

''ترجمہ: عبداللہ رات کے وقت مرو سے روانہ ہوئے تو گویا مرو کا تمام نور اور جمال وہاں سے چلا گیا۔ہر شہر کے بڑے بڑے علماء کا اگر ذکر کیا جائے تو وہ سب ستارے ہوں گے اور اے ابن مبارکؒ آپ ان میں ہلال کی طرح چمکتے ہوں گے۔'' (۲)

علماء میں وقعت:

عامۃ الناس کا کیا ذکر؟ بڑے بڑے ائمہ اور اساتذہ حدیث وفقہ ان کا غایت درجہ احترام کرتے تھے اور ان کے استقبال و مشایعت کو اپنا فریضۂ عقیدتمندی سمجھتے تھے۔عبداللہ بن سنان کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ مکہ سے روانہ ہوئے تو سفیان بن عیینہ اور فضیل بن عیاض ان کی مشایعت کے لئے دور تک ساتھ گئے۔ان میں سے ایک نے ابن مبارکؒ کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ فقیہ اہل مشرق ہیں'' دوسرے نے کہا ''اور فقیہ اہل مغرب بھی'' (۳)

یحییٰ بن یحییٰ الاندلسی کہتے ہیں ''ایک مرتبہ ہم امام مالکؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابن مبارکؒ آ گئے۔انہوں نے شرکتِ مجلس کی اجازت چاہی، امام مالکؒ نے اجازت دے دی۔

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۸۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۲۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۶۔

وہ تشریف لائے تو امام مالکؒ نے اپنی نشست کو بدل دیا اور حضرت ابن مبارکؒ کو اپنے پاس بٹھایا۔ "یحییٰ کا بیان ہے کہ "امام مالکؒ کسی شخص کے لئے بھی اپنی مجلس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے تھے۔" (۱)

حسنِ ادب:

ابن مبارکؒ حسنِ ادب کے جوہر سے بھی حصہ وافر رکھتے تھے۔ ان کے سامنے اگر کوئی قرأت حدیث کرتا تھا تو وہ اس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھواتے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے۔ ابن مہدی کا بیان ہے۔ "ابن مبارک ادب عندنا من الثوری." (۲)

ایک دفعہ امام مالکؒ حدیث کا درس دے رہے تھے جس میں ابن مبارکؒ بھی اتفاقاً شریک ہو گئے تھے۔ ایک تلمیذ قرأت کر رہا تھا، اس درس میں متعدد مواقع پر امام مالکؒ نے حضرت ابن مبارکؒ سے بعض حدیثوں اور مسائل کی نسبت دریافت کیا کہ ان کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں وہ ازراہ حسن ادب چپکے چپکے جوابات دیتے رہے امام مالکؒ کو حضرت ابن مبارکؒ کے اس ادب پر بڑا تعجب ہوا اور جب وہ چلے گئے تو فرمایا "یہ ابن مبارک فقیہ خراسان تھے۔" (۳)

عبادت:

ان علمی و اخلاقی کمالات کے ساتھ عبادت گزار بھی بہت تھے۔ نعیم بن حماد کہتے ہیں "میں نے ابن مبارک سے زیادہ نہ تو کوئی عقلمند دیکھا ہے۔ اور نہ ان سے زیادہ کوئی عبادت گزار دیکھا۔" (۴)

خوفِ خدا:

ان پر خوفِ خدا کا غلبہ اس درجہ تھا کہ زہد سے متعلق احادیث یا آیات پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وہ ذبح کئے ہوئے بیل ہیں، گھگی بندھ جاتی تھی اور وہ بولنے پر بالکل قادر نہیں ہوتے تھے۔" (۵)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵۔
(۴) ایضاً۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶۔

فصاحت:

فصاحت کا کمال بھی ان میں اس قدر تھا کہ تمام علماءِ عصر اس کا اعتراف کرتے تھے ابن جریج تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "میں نے ابن مبارک سے بڑا کوئی عراقی فصیح نہیں دیکھا۔" (۱)

شاعری:

اپنے علمی و مذہبی مشاغل کے ساتھ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن ان میں عام شاعری سے الگ حکمت و نصیحت کی باتیں بیان کرتے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

"قد یفتح المرء حانوتا لمتجره
وقد فتحت لک الحانوت بالدین
بین الاساطین حانوت بلاخلق
تبتاع بالدین اموال المساکین
صیرت دینک شاهینا تصید
ولیس یفلح اصحاب الشواهین"

ترجمہ:

۱۔ لوگ تجارت کے لئے دکانیں کھولتے ہیں۔ لیکن تو نے دین کی دکان کھول رکھی ہے۔

۲۔ بڑے بڑے ستونوں کے درمیان تری دکان ہے جو بند ہی نہیں ہوتی اور جس کے ذریعہ دین کے بدلہ میں مسکینوں کے اموال خریدے جاتے ہیں۔

۳۔ تو نے (اے دین فروش) اپنے دین کو شاہین بنا رکھا ہے جس سے تو شکار کرتا پھرتا ہے اور ہاں شاہیں باز لوگوں کو فلاح نہیں ہوتی۔

---

(۱) ابن خلکان ج ا ص ۲۴۸۔

تجارت:

غایت خودداری کی وجہ سے وہ علم و زہد کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا نہایت معیوب خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور اس میں ان کو جو نفع ہوتا تھا اس کا اندزہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فضیل بن عیاضؒ کی روایت کے مطابق وہ ایک لاکھ درہم سالانہ فقراء پر تقسیم کرتے تھے۔[1]

تجارت کا مقصد:

لیکن ان کی تجارت کا مقصد سرمایہ دار بن کر اپنے لئے بیش از بیش سامان آسائش فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ علم کی حقیقی وقعت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ صاحبِ علم کو اپنی کسی معاشی ضرورت میں ابنائے روزگار میں سے کسی کی طرف احتیاج نہ ہو جیسا کہ کسی فارسی شاعر نے کہا ہے:

مرا تجربہ معلوم گشت آخر حال
کہ قدر مرد بعلم ست وقدر علم بمال

اور ایک عربی شاعر کہتا ہے:

ویزری بعقل المرء قلة ماله
وان کان اسریٰ من رجال واحولا [2]

چنانچہ ایک دفعہ فضیل نے ان سے دریافت کیا کہ ”آپ ہم کو تو زہد اور قوت لایموت پر قانع رہنے کا حکم کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود خراسان سے قیمتی قیمتی سامان تجارت لاتے ہیں اور اسے بلدۂ حرام میں فروخت کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟“ فرمایا ”اے ابوعلی یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ مال کے ذریعہ اپنی آبرو محفوظ رکھوں اور اس کی مدد سے خدا کی اطاعت زیادہ سے زیادہ کروں اور تاکہ میں خدا کا جو حق اپنے ذمہ واجب دیکھوں اس کی طرف سبقت کر کے اسے ادا کر سکوں۔“ فضیل نے کہا ”ابن مبارک! سبحان اللہ اس مقصد نیک کا کیا کہنا۔ اگر یہ پورا ہو سکے۔“[3] غالباً اسی عام مسلمانوں کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی وجہ سے ابن مہدی کہا کرتے تھے ”میں نے اس امت کا خیر خواہ ابن مبارکؒ سے زیادہ کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔“[4]

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶۔ (۲) ترجمہ: کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا سردار اور تدبیر کرنے والا ہو۔ لیکن اگر وہ قلیل المال ہے تو لوگ بات بات پر اس کی عقل کو بٹہ لگاتے ہیں۔ (۳) خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۰۔ (۴) ایضاً ص ۱۶۰۔

علماء وطلباء کی خدمت:

حضرت ابن مبارک یوں تو اپنا تمام مال کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے لیکن علماء و طلباء دین کی مالی خدمت کا خصوصیت سے بڑا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن الحسنؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارکؒ نے فضیل بن عبداللہؒ سے جوان کے تلمیذ تھے فرمایا "اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا"[1]۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ ابن مبارکؒ خاص اپنے اہل وطن پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا کہ وہ دوسرے شہروں میں تقسیم کرآتے ہیں۔ ابن مبارکؒ کو اس اعتراض کی خبر ہوئی تو انہوں نے فرمایا "میں جن علماء اور طلباء پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے اربابِ فضل وصدق ہیں۔ ان لوگوں نے علمِ حدیث حاصل کیا، اور اس میں پوری محنت وسعی سے کام لیا، لیکن ان کی ضرورتیں بھی وہی ہیں جو عام لوگوں کی ہوتی ہیں اس لئے اگر ہم ان کو چھوڑ دیں تو یہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جائیں گے اور علم ضائع ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے ان کو غنی کر دیا تو یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں علم کی اشاعت کریں گے اور نبوت کے بعد میرے نزدیک اشاعت سے افضل کوئی چیز نہیں ہے۔"[2]

ارباب حوائج کی امداد:

علماء وطلباء کے علاوہ عام حاجتمند لوگوں کی امداد بھی بڑی فراخ دلی سے کرتے تھے۔ سلمہ بن سلیمان کا بیان ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مبارک کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں مقروض ہوں۔ آپ میری طرف سے قرض ادا کر دیجئے۔ آپ نے فوراً اپنے وکیل کو لکھ دیا کہ اس شخص کا قرض ادا کر دیا جائے۔ یہ شخص خط لے کر وکیل کے پاس آیا تو اس نے پوچھا "تم نے عبداللہ بن مبارکؒ سے کتنی رقم طلب کی تھی؟ بولا "سات سو درہم" اب اس وکیل نے حضرت ابن مبارکؒ کو لکھا کہ "یہ شخص تو سات سو درہم کا مقروض ہے اور اسی کا آپ سے اس نے مطالبہ کیا تھا لیکن آپ لکھتے ہیں کہ اس کو سات ہزار درہم دے دیئے جائیں، اور اب تو غلات بھی ختم ہو گئے ہیں" ابن مبارکؒ نے جواب میں لکھا "اگر غلات ختم ہو گئے ہیں تو کیا مضائقہ ہے، عمر بھی ایک دن یونہی ختم ہو جائے گی، اب تو جو کچھ میرے قلم سے نکل گیا ہے تم اس پر عمل کرو۔"[3]

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۰۔
(۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۹۔

ایک اور واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ محمد بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ طرطوس آتے جاتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا وہاں ایک سرائے میں قیام کرتے تھے۔ یہاں ایک نوجوان تھا جو سرائے میں قیام کی مدت میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی خدمت کرتا، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا، اور ان سے حدیث کا سماع کرتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ ابن مبارکؒ رقہ کی سرائے میں حسبِ معمول قیام پذیر ہوئے تو آپ کو وہ نوجوان نہیں ملا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ قرض کی وجہ سے گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا ''وہ کتنی رقم کا مقروض ہے؟'' لوگوں نے بتایا دس ہزار درہم کا۔ آپ نے تلاش کے بعد صاحبِ قرض کو رات کو بلایا اور کہا کہ تم اپنے دس ہزار درہم مجھ سے لے لو اور اس نوجوان کو رہا کر دو۔ یہ خطیر رقم ادا کرنے کے بعد حضرت ابن مبارکؒ شب میں ہی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ نوجوان رہا ہوا لوگوں نے اسے بتایا کہ حضرت ابن مبارکؒ اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، اور اب تک وہ غالباً دو تین منزل پہنچے ہوں گے۔ یہ سن کر نوجوان بھاگا اور آخر کار دو تین منزل کی مسافت پر انہیں پالیا۔ حضرت ابن مبارکؒ نے اس نوجوان سے اس کا احوال دریافت کیا تو اس نے کہا۔ میں قید میں تھا کہ ایک شخص سرائے میں مقیم ہوا اس نے میری طرف سے قرض ادا کر دیا اور میں رہا ہو گیا، اور لطف یہ ہے کہ میں اس شخص کو جانتا بھی نہیں ہوں کہ کون ہے، اور کہاں سے آیا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی وفات تک کسی پر اس کا راز کا افشا نہیں ہوا۔''(۱)

تواضع اور مدارات:

ارباب حوائج کے ماسوا وہ اپنے مہمانوں، دوستوں اور رشتہ داروں کی خاطر مدارات پر بھی بہت خرچ کرتے تھے۔ اسماعیل بن عیاش اپنے بعض دوستوں سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ مصر سے مکہ تک حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے رفیقِ سفر ہو گئے تو کل مدت سفر میں حضرت ابن مبارکؒ کا معمول یہ تھا کہ خود روزہ رکھتے تھے لیکن اپنے تمام ساتھیوں کو حلوہ بنا بنا کر کھلاتے تھے۔

ایک دفعہ غالباً کسی غزوہ کے لئے حضرت ابن مبارکؒ بغداد سے مصیصہ کے لئے روانہ ہوئے صوفیا کی ایک جماعت بھی رفیق سفر تھی۔ آپ نے اپنے ملازم کو بلا کر حکم دیا کہ ایک طشت لاؤ۔ طشت آ گیا تو آپ نے اس کو ایک رومال سے ڈھکوا دیا اور اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۹۔

خطاب کر کے فرمایا ”تم میں سے ہر شخص اپنا ہاتھ رومال کے نیچے لے جائے اور اسے جو ملے لے لے“ ایسا کرنے سے کسی کو دس درہم ملے کسی کو بیس، اور کسی کو اس سے کم یا زیادہ۔ مصیصہ پہنچ کر آپ نے فرمایا ”یہ پردیس ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے تقسیم کر دیا جائے۔“ اس وقت آپ کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ جنہیں بیس بیس دینار ملے تھے از راہ مذاق کہتے تھے ”ابو عبدالرحمن! یہ تو بیس درہم ہیں“ آپ جواب میں فرماتے ”پروا نہ کرو، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ غازی کے نفقہ میں برکت عطا فرمادے۔“

حسن بن شفیق اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مبارک جب بھی حج کے لئے روانہ ہونے لگتے تھے تو ان کے پاس مروی احباب واصحاب جمع ہوتے ان کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کرتے، آپ ان سے فرماتے ”تم لوگ اپنے اپنے نفقات میرے پاس جمع کر دو چنانچہ آپ ان سے روپیہ پیسہ لے کر اس کو ایک صندوق میں بند کر کے اس کو مقفل کر کے رکھ دیتے اس کے بعد آپ ان اصحاب کو لے کر مرو سے بغداد آتے، اور راستہ میں ان پر خوب خرچ کرتے، بہترین کھانے کھلاتے اور راحت و آسائش کا عمدہ سے عمدہ سامان فراہم کرتے۔ بغداد سے مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہوتے تو ان لوگوں کے واسطے اچھے اچھے کپڑے بھی سلواتے غرض یہ ہے کہ مرو کی واپسی تک حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ان لوگوں پر بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنا روپیہ خرچ کرتے، یہاں آ کر اپنے تمام حاجی دوستوں کے مکانات پر اس زمانہ کے حجاج کے قاعدہ کے مطابق سفیدی اور دوسرے آرائش و زیبائش کے لوازم کراتے۔ تین دن کے بعد ان سب کی طرف سے ان کے احباب واعزاء کی نہایت مکلف دعوت کرتے۔ اور جب ان سب کاموں سے فارغ ہو جاتے تو صندوق کھول کر ہر ایک کی تھیلی جس پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا، اس شخص کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے تمام رفقاء کے جملہ مصارفِ حج کا خود تکفل کرتے تھے یہاں تک کہ وطن کی واپسی کے وقت ان لوگوں کو اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کے لئے مکہ کے جو تحائف خریدنے ہوتے تھے ان کی قیمت بھی خود ہی ادا کرتے تھے۔ (۱)

ان واقعات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کس قدر سیرِ چشم، فیاض، بامروت اور سخی تھے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے کس درجہ جاں نثار دوست تھے۔ چنانچہ وہ بسا اوقات یہ شعر پڑھتے تھے:

---

(۱) یہ واقعات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۸ سے ماخوذ ہیں۔

"واذا صاحبت فاصحب صاحبا
ذاحیاء وعفاف وکرم
قائلاً للشئ لا ان قلت لا
واذا قلت نعم قال نعم"

''ترجمہ: اگر تم کسی کو دوست بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ جو باحیا ہو اور صاحبِ عفت وکرم بھی ہو اور جس کا حال یہ ہو کہ تم کسی چیز ''پر نہیں'' کہہ دو تو وہ بھی نہیں کہہ دے۔ اور اگر تم ''ہاں کردو، تو وہ بھی ''ہاں'' کہہ اٹھے۔''

سلاطین کے سامنے اظہارِ حق:

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ان بزرگوں میں سے تھے جن کی نظریں جاہ و جلال خداوندی کے تصور سے ہر وقت روشن رہتی ہیں اور اس بنا پر وہ دنیا کے قاہر و جابر بادشاہوں کی دولت وشوکت سے ذرا مرعوب نہیں ہوتے۔ ابراہیم بن نوح موصلی کا بیان ہے کہ ہارون رشیدؒ عین ذربہ آیا تو اس نے حضرت ابن مبارکؒ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا: ''امیر المومنین! ابن مبارک خراسانی شخص ہیں، مجھ کو ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ آپ سے ایسی باتیں نہ کریں جو آپ کو ناگوار گزریں اور جن سے متاثر ہو کر آپ انہیں قتل کرادیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو بھی ہلاک کردوں گا، اور عبداللہ بن مبارکؒ اور امیر المؤمنین کی ہلاکت کا بھی سبب بنوں گا۔ ہارون یہ سن کر اس وقت تو خاموش ہوگیا۔ چند روز کے بعد اس نے پھر ابن مبارکؒ کو یاد کیا تو میں نے عرض کیا ''امیر المومنین! ابن مبارک سخت مزاج اور بے پروا آدمی ہیں۔'' ہارون پھر خاموش ہوگیا۔ لیکن اتفاقاً اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت ابن مبارکؒ خود ہی تشریف لے آئے ان سے کسی نے پوچھا ''آپ پہلے تو ہارون کی ملاقات سے اجتناب کرتے تھے۔ اب آپ کیسے چلے آئے؟'' فرمایا ''میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا، مگر وہ نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ وہ موت پر رضامند ہوگیا تو میں ہارون کے پاس چلا آیا۔'' (۱)

طب:

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے کمالات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس سے طب کا فن تک خارج نہ تھا۔ وہ اس میں بھی ارباب فن کا سا کمال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت سفیان ثوریؒ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۶

کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ شدتِ کرب سے کراہ رہے ہیں۔ پوچھا کیا حال ہے؟'' انہوں نے اپنا مرض بیان کیا۔ حضرت ابن مبارکؒ نے لوگوں سے اسی وقت پیاز کی ایک گنٹھی منگوائی۔ وہ آ گئی تو آپ نے اس کو تراش کر حضرت ثوریؒ سے کہا کہ اس کو سونگھیے انہوں نے تھوڑی دیر اس کو سونگھا تھا کہ ایک چھینک آئی اور اس سے تمام کرب و اضطراب ختم ہو گیا حضرت ثوریؒ بولے ''سبحان اللہ! آپ فقیہ بھی ہیں اور طبیب بھی۔'' (۱)

تواضع اور انکسار:

ان خوبیوں کے باوصف تواضع اور فروتنی اس قدر تھی کہ کبھی اپنی تعریف سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ابو الوہب المروزی کہتے ہیں ''میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا کہ تکبر کی تعریف کیا ہے؟'' فرمایا '' وہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو حقیر سمجھو اور ان سے اس کی توقع کرو کہ وہ تمہیں پسند کریں'' اس کے بعد فرمایا ''تکبر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اپنی کسی چیز کی نسبت یہ خیال کرو کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔'' (۲)

شجاعت اور مہارتِ جنگ:

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ صرف صاحبِ علم وفضل ہی نہیں تھے بلکہ انہیں فنِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔ عبدہ بن سلیمان المروزی کا بیان ہے ''ہم ایک مرتبہ روم کی ایک مہم پر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے ساتھ گئے وہاں دیکھا کہ فریقین کی صف آرائی کے بعد دشمن کی صف سے ایک بہادر نکلا اور اس نے للکار کر دعوتِ جنگ دی۔ اس کے جواب میں ہماری طرف سے بھی ایک بہادر بڑھا جس نے اپنے حریف کو قتل کر دیا، اس کے بعد دشمن کی صف سے ایک اور جنگجو سپاہی نکلا اور ہماری فوج کے بہادر نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ اب ہمارے بہادر نے گرج کر کہا '' کیا کوئی اور ہے جو مقابلہ کے لئے آئے کچھ تامل کے بعد دشمن کی صف سے تیسرا جنگ آزما بڑھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار ہماری فوج کے اس بہادر نے اس کو بھی اس زور سے نیزہ مارا کہ اس کا لاشہ زمین پر خاک وخون میں تڑپ رہا تھا۔ راوی کہتا ہے اب ہم سب دوڑ پڑے اور اس شخص کا احاطہ کر لیا۔ اس نے آستین سے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۵۶۔ (۲) ایضاً۔

اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ میں نے زور سے جھٹکا دے کر آستین منہ پر سے ہٹائی ۔ دیکھا کہ ہمارا یہ بہادر عبداللہ بن مبارکؒ تھا۔ مجھ کو دیکھ کر فرمانے لگے ''کیوں ابوعمرو! تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو مجھ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔'' (۱)

غایت کمال و بزرگی:

تمام علمی و عملی کمالات کی جامعیت نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی شخصیت کو اس قدر محبوب و ہردلعزیز بنا دیا تھا کہ لوگ ان سے بے ساختہ محبت کرتے تھے۔ اور ان کی شان میں کوئی کلمۂ استخفاف سن نہیں سکتے تھے۔ اسود بن سالم کہتے ہیں ''ابن مبارکؒ امام مقتدیٰ تھے اور سنت میں سب سے زیادہ تثبت رکھتے تھے۔ میں اگر کسی شخص کو ان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے اسلام میں شک ہونے لگتا ہے۔'' (۲)

ابن عیینہ فرماتے ہیں ''میں نے صحابۂ کرام کے حالات میں غور کیا ہے اور ادھر عبداللہ بن مبارکؒ کے حالات بھی دیکھے ہیں دونوں کے مقابلہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ صحابہ کو حضرت ابن مبارکؒ پر محض اس وجہ سے فضیلت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے رہے ہیں۔'' (۳)

امام نسائیؒ کا بیان ہے کہ ''میں ابن مبارکؒ کے عہد میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مرتبہ کے اعتبار سے ان سے زیادہ بڑا اور بلند ہو۔ اور جس میں تمام خصائل محمودہ اس جامعیت کے ساتھ پائی جاتی ہوں۔'' خلیلی کہتے ہیں ''ابن مبارک متفق علیہ امام ہیں، ان کی کرامات ناقابلِ شمار ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ ابدال میں سے ہیں۔'' (۴)

تلامذہ:

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ایسی جامع شخصیت سے کون کسبِ فیض کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ آپ سے استفادہ کی غرض سے مختلف ولایتوں کے بے شمار لوگ دور دراز سے آتے اور اپنی تشنگی علم بجھاتے تھے۔ (۵) ان میں سے بعض بڑے بڑے ائمۂ علم و ہدیٰ بھی تھے۔ مثلاً عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن معین، ابوبکر بن شیبہ، احمد بن حنبل المروزی، حبان بن موسیٰ۔ (۶)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ص ۱۶۷۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۱۰ص ۱۶۸۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۵ص ۳۸۵۔
(۴) تہذیب التہذیب ج ۵ص ۳۸۷۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۲۵۳۔ (۶) ایضاً۔

وفات:

وفات بھی اس قدر اچھی ہوئی کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ کسی غزوہ میں گئے تھے کہ وہاں سے واپسی پر راستہ میں ہی بیمار ہوگئے، عمر وہی پائی جو سید ولد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، یعنی ۶۳ برس کی۔ آخر کار اسی مرض میں ۱۳ رمضان ۱۸۱ھ کو علی الصباح ہیت [1] میں انتقال فرمایا۔ مشہور عباسی خلیفہ ہارون کو اطلاع ہوئی تو اس نے کہا ''افسوس! علماء کے سردار کا انتقال ہوگیا۔'' [2] حضرت سفیان بن عیینہؒ بولے ''وہ بڑے فقیہ، عالم، عابد، زاہد، شیخ، بہادر اور شاعر تھے۔'' فضیل بن عیاضؒ نے کہا ''ابن مبارک چل بسے، لیکن انہوں نے اپنا مثل کوئی نہیں چھوڑا۔ [3] رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔''

محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام ابوعبداللہ کنیت، والد کا نام حسن تھا، قبیلۂ بنوشیبان کے غلام تھے اس لئے شیبانی کہلاتے تھے۔ دمشق کے اطراف میں ایک گاؤں ہے جسکا نام ''حرستا'' تھا۔ امام محمد کے والد یہیں کے رہنے والے تھے، یہ شامی لشکر میں ملازم تھے اسی سلسلہ میں کچھ مدت تک ''واسط'' میں قیام کرنا پڑا یہیں امام محمد ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ [4]

تعلیم وتربیت:

کوفہ میں تعلیم وتربیت پائی، اس زمانہ میں کوفہ نحو وادب، تفسیر وحدیث اور فقہ کا گہوارہ تھا۔ امام محمدؒ میں شوق وذوق اور تحصیل علوم کی استعداد فطری تھی۔ پھر ان کے والد نے انتقال کے وقت تیس ہزار درہم چھوڑے تھے۔ امام محمدؒ نے یہ سب روپیہ اپنی تعلیم پر خرچ کر دیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ''میں نے پندرہ ہزار درہم نحو اور شعروادب کی تعلیم پر خرچ کئے اور پندرہ ہزار درہم حدیث اور فقہ کی تعلیم پر۔'' [5]

---

(۱) یہ شہر دریائے فرات کے ساحل پر واقع ہے۔ (۲) خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۸۔ (۳) ایضاً ص ۱۶۳۔
(۴) کتاب الانساب للسمعانی ص ۳۴۲۔ (۵) تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۳۔

علم وفضل:

امام محمدؒ نے باپ کا چھوڑا ہوا تمام اثاثہ اپنی تعلیم پر خرچ کر دیا، لیکن اس کے بدلہ میں ان کو اقلیم علم وفضل کی وہ کشور کشائی ملی جو دنیا کے کم سعادت مند لوگوں کے حصہ میں آتی ہے ان کی علمی فضیات کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں نہ کھلتیں جتنی کہ اب کھلی ہیں۔"(۱) تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، شعر، بلاغت اور نحو ان تمام علوم میں ان کو یکساں کمال حاصل تھا۔ اور ان پر مصرع پورے طور پر صادق آتا ہے:

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

تفسیر:

قرآن مجید کے حقائق ومعانی کے ادراک وفہم میں ان کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا۔"(۲) اسی طرح کا ایک مقولہ ابوعبید سے منقول ہے۔(۳)

حدیث:

حدیث میں انہوں نے حضرت مسعر بن کدام، سفیان ثوری، عمرو بن ذر، مالک بن مغول، امام مالک بن انس، ابوعمرو الاوزاعی، زمعہ بن صالح، اور بکیر بن عامر وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ سے استفادہ کیا تھا۔ لیکن امام مالک سے ان کو بڑی خصوصیت تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ میں تین سال سے کچھ اوپر تک امام مالک کی صحبت میں رہا ہوں اور میں نے ان سے سات سو سے زیادہ حدیثیں سنی ہیں۔ امام مالکؒ کے ساتھ اس خصوصیت کے رکھنے کے باعث امام محمدؒ، امام مالکؒ کی روایتوں کے بہترین حافظ اور امانتدار سمجھے جاتے تھے چنانچہ وہ جب کبھی اپنی مجلس میں امام مالک کی روایتیں بیان کرنے کا اہتمام کرتے تھے لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ جگہ ناکافی ثابت ہوتی تھی۔ امام محمدؒ طبعاً اس چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ان لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا "تم لوگ اپنے اصحاب کے حق میں کتنے برے ہو۔ میں جب امام مالکؒ کی روایتیں بیان کرتا ہوں

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔ (۳) خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۵۔

تو تمہارا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ جگہ تنگ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب میں خود تمہارے اصحاب کی روایات بیان کرتا ہوں تو تم بادل نا خواستہ ہی اس درس میں شریک ہوتے ہو۔"(۱) بغداد کے قیام میں مستقلاً درس حدیث دیتے تھے۔

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کی تعداد بہت وسیع ہے اور ان میں وقت کے بڑے بڑے امام شامل ہیں جن میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

امام شافعی، ابو سلیمان الجوز جانی، ہشام بن عبید اللہ الرازی، ابو عبید القاسم ابن سلام، اسمٰعیل بن توبہ، علی بن مسلم الطوسی، ابو حفص کبیر، محمد بن سماعۃ، عیسیٰ بن ابان محمد بن مقاتل، موسیٰ بن نصیر رحمہم اللہ تعالیٰ۔

فقہ:

اگر چہ وہ مذہب اور لغت کے تمام علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے لیکن ان کی زیادہ تر شہرت فقیہ کی حیثیت سے ہے۔ فقہ میں وہ امام ابوحنیفہ اور قاضی ابو یوسف رحمہما اللہ کے شاگرد تھے مہارتِ فن اور وسعتِ نظر کی وجہ سے ان سے خواہ کتنا ہی مشکل کوئی مسئلہ پوچھا جاتا وہ بڑی خندہ پیشانی اور کشادگی قلب کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ امام شافعی کا بیان ہے "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اس کے تیوروں پر بل نہ پڑے، البتہ ہاں امام محمد اس سے مستثنیٰ ہیں"(۲) ایک دوسرے مقولے میں فرماتے ہیں "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو حلال اور حرام اور علل اور ناسخ و منسوخ کے علم میں محمد بن الحسن سے بڑھ کر ہو، اگر لوگ انصاف کی نظر سے دیکھیں تو ان کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے محمد بن الحسن جیسا کوئی نہیں دیکھا۔" "میں نے کبھی کوئی فقیہ ایسا نہیں دیکھا جو فقہ میں امام محمدؒ سے زیادہ مہارت و بصیرت رکھتا ہو۔ اور اس کی زبان فقہ کے مسائل پر گفتگو کے وقت تیزی سے چلتی ہو۔ امام محمدؒ کو فقہ اور اس کے اسباب پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے مشکل مسائل کے حل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی جن سے اکابر تک عاجز رہتے تھے۔"

---

(۱) خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۳۔ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ا ص ۴۵۴۔

فقہ کی پرکھ میں امام شافعیؒ سے زیادہ اور کس کا قول درخور تسلیم و پذیرائی ہوسکتا ہے ایک موقع پر کسی نے ان سے دریافت کیا ”آپ نے امام مالک کو دیکھا ہے اور ان سے سماعت بھی کی ہے۔ اور دوسری جانب آپ نے امام محمد بن الحسنؒ کے ساتھ بہت دنوں تک رفاقت کی ہے۔ آپ کے نزدیک ان دونوں میں کون بڑا فقیہ ہے؟“ ارشاد ہوا ”**محمد بن الحسن افقه نفسا منه**“ محمد بن الحسن باعتبار نفس کے ان سے بڑے فقیہ ہیں۔[1]

ابوعبید کہتے ہیں ”میں ایک دفعہ امام محمد بن الحسن کے پاس آیا تو دیکھا کہ امام شافعی ان کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور کوئی مسئلہ دریافت کرر ہے ہیں۔ امام محمدؒ نے اس سوال کا جواب دیا تو امام شافعیؒ نے اس کو بہت پسند کیا اور فوراً لکھ لیا۔“[2]

نکتہ شناسی:

امام محمدؒ اگرچہ فربہ اندام تھے لیکن نہایت ذکی تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ”میں نے امام محمدؒ کے علاوہ کوئی فربہ اندام شخص اس غضب کا ذکی نہیں دیکھا۔ ان کے کمالِ تفقہ میں اس ذکاوت کا بڑا دخل تھا جس کی وجہ سے وہ مشکل سے مشکل مسئلہ میں عجیب وغریب نکات پیدا کردیتے تھے۔ مجاشع بن یوسف کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ مدینہ میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس زمانہ میں فتویٰ دیتے تھے۔ اتنے میں امام محمد بن الحسنؒ جو اس وقت نوجوان تھے آئے اور پوچھنے لگے کہ آپ اس ناپاک (جنبی) آدمی کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس کو پانی سوائے مسجد کے اور کہیں نہ ملے، اور پھر پانی بھی مسجد کے اندرونی حصہ میں ہو۔“ امام مالکؒ بولے ”جنبی مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔“ امام محمدؒ نے فرمایا ”نماز کا وقت آ گیا ہے اور پانی سامنے ہی موجود ہے، ایسی حالت میں اس کو کیا کرنا چاہئے؟“ امام مالکؒ نے پھر وہی جواب دیا، اور اس پر امام محمدؒ نے وہی فرمایا جو پہلے فرما چکے تھے۔ آخر کار امام مالکؒ نے کہا کہ ”اچھا تو آپ بتایئے، آپ اس اشکال کا حل کس طرح کریں گے؟“ امام محمدؒ بولے اس جنبی کو تیمم کر کے مسجد میں داخل ہونا چاہئے اور پھر وہاں سے پانی لے کر غسل کرنا چاہئے“ یہ سن کر امام مالکؒ نے پوچھا ”آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“ ارشاد ہوا ”من اہل ہذہ“ یہاں کے لوگوں میں سے ہوں“ امام مالکؒ نے فرمایا ”اہل مدینہ میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جس کو میں نہ جانتا ہوں۔“ امام محمدؒ بولے ”کتنے ہی لوگ

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۲ و ۳۲۳۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔

ایسے ہیں جن کو آپ نہیں جانتے'' اس گفتگو کے بعد امام محمدؒ اٹھ کر مجلس سے چلے آئے تو امام مالکؒ سے لوگوں نے بیان کیا کہ یہ صاحب محمد بن الحسن صاحب ابی حنیفہؒ تھے۔ امام مالکؒ نے فرمایا ''بھلا امام محمدؒ کس طرح جھوٹ بول سکتے ہیں ابھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ میں مدینہ کے لوگوں میں سے ہوں۔ لوگوں نے عرض کی۔ ''نہیں حضرت! انہوں نے ہٰذہ کہہ کر زمین کی طرف اشارہ کیا تھا اور مراد یہ تھی میں اس زمین کے لوگوں میں سے ہوں۔'' امام مالکؒ کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا اور انہوں نے فرمایا ''**هذا اشد على من ذاك**'' (۱)

امام محمد کے کمالِ تفقہ کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ امام شافعی ایسا مسلمہ روزگار امام فقہ صاف لفظوں میں اعتراف کرتا تھا کہ ''**امن الناس على فى الفقة محمد بن الحسن**'' ایک مرتبہ ایک شخص امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوا اور کوئی مسئلہ دریافت کیا امام عالی مقام نے اس کا جواب دے دیا تو وہ شخص بولا ''اس مسئلہ میں فقہاء تو آپ کے خلاف ہیں۔'' آپ نے فرمایا ''تم نے کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ البتہ وہاں اگر تم نے محمد بن الحسنؒ کو دیکھا ہے تو ان کی بات اور ہے۔ وہ آنکھوں اور دلوں میں سما جاتے تھے۔'' (۲)

قضاء:

اس کمال تفقہ کے باعث ہی ہارون رشید نے ان کو رقہ کا قاضی بنا دیا تھا ایک مدت تک وہ اس فرض منصبی کو انجام دیتے رہے، لیکن معلوم نہیں کیا سبب ہوا کہ بعد میں معزول کر دیئے گئے۔ (۳)

فصاحت:

تمام علمی اور دماغی کمالات کی کنجی حسنِ بیان وتقریر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بڑے بڑے اربابِ کمال گمنامی کے گوشہ میں پڑے رہتے ہیں اور ان کو ابھرنے اور نمایاں ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ امام محمدؒ کی ذاتِ ستودہ صفات اس کمال سے بھی حصہ وافر رکھتی تھی۔ ان کو عربیت کے تمام علوم پر ایسا ہی عبور تھا، جیسا تفسیر، حدیث اور فقہ پر ان کی تقریر فصاحت و بلاغت کے تازہ وشگفتہ پھولوں کا سدابہار گلدستہ ہوتی تھی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ''میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی فصیح نہیں دیکھا۔'' وہ جب کلام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔'' (۴)

---

(۱) یعنی یہ تو میرے لئے اور بھی زیادہ پشیمانی کی بات ہے (تاریخ بغدادی ج ۲ ص ۱۷۵)۔

(۲) ایضاً ص ۱۷۶۔ (۳) ایضاً ص ۱۷۵۔ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵۴۔

جوش تقریر:

جب کسی اہم موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو نہایت جوش وخروش اور پوری قوت کے ساتھ کرتے تھے۔ایک مرتبہ کسی مسئلہ پر امام شافعیؒ سے مذاکرہ کر رہے تھے کہ تقریر کرتے کرتے جوش وخروش سے بھر پور ہوگئے۔ یہاں تک کہ ان کی رگیں پھول گئیں۔آواز بلند ہوگئی۔ باریک کپڑے زیب تن تھے۔ان کا کوئی بٹن ایسا نہ تھا جو ٹوٹ نہ گیا ہو۔'' (۱)

درس:

امام محمدؒ نے نوعمری میں ہی وہ کمال پیدا کرلیا تھا کہ خلائق کا مرجع بن گئے تھے۔ابھی بیس سال کے ہی تھے کہ کوفہ کی مسجد میں درس دیتے تھے۔ (۲)

حسن وجمال:

معنوی حسن کے ساتھ قدرت نے ان کو ظاہری اور صوری حسن و جمال سے بھی بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔علامہ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں ''**وکان من اجمل الناس واحسنهم**'' ان کے حسن و جمال کا ایک عجیب واقعہ ہے۔امام محمدؒ کے والد ان کو تعلیم کی غرض سے لے کر امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو امام صاحب نے امام محمد کا غیر معمولی حسن و جمال دیکھ کر فرمایا۔''تم اپنے لڑکے (محمد) کا سر مونڈ وا دو اور بوسیدہ کپڑے پہناؤ تا کہ ان کو دیکھنے والے فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔'' امام محمدؒ کے والد نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔لیکن لعل ہوتا ہے تو گدڑی میں بھی چمکتا ہے۔اس ہیئت ولباس نے امام محمدؒ کے حسن کو اور چمکا دیا۔

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

خود امام ہمام کے الفاظ یہ ہیں ''فزدت عند الخلق جمالاً۔ (۳)

علمی انہماک:

کوئی علمی کام اطمینان کے ساتھ اس وقت تک انجام پذیر نہیں ہوسکتا جب تک خانگی معاملات سے یکسو ہو کر ہمہ تن اس میں انہماک نہ ہو۔مشہور مقولہ ہے ''**العلم لایعطیک بعضه حتی لاتعطیه کلک**'' اس بنا پر امام محمدؒ نے اپنے گھر کا تمام انتظام ایک منیجر کے سپرد کر رکھا تھا

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۲ ص ۱۷۷۔ (۲) ایضاً ص ۱۷۴۔ (۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔

اور اہل خانہ کو ہدایت کردی تھی کہ تم کو جس کسی چیز کی ضرورت ہو میرے وکیل سے لے لینا، پھر آپ نے فرمایا "**فانه اقل لهمي و افرغ لقلبي**". [۱]

تصنیفات:

ان کی یکسوئی اور خانگی امور سے اس فارغ البالی کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے درس و تدریس اور افتاء وقضا کی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔ جو آج تک اسلامی فقہ کی بنیاد کا کام دے رہی ہیں۔ امام عالی مقام کی مشہور تصنیفات یہ ہیں:

المبسوط، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الکبیر، السیر الصغیر، الزیادات جو عموماً ظاہر الروایۃ والاصول کے نام سے معروف ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ فقہ میں الرقیات الہارونیات، الکیسانیات، الجرجانیات، اور حدیث میں کتاب الاثار، اور مؤطا امام محمد بھی آپ کی تصنیف ہیں۔ [۲] مولانا عبدالحیؒ لکھنوی مرحومؒ نے موطا امام محمد کے مقدمہ میں ان تصنیفات پر بڑی تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے اور التقدمۃ شرح المقدمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کی تصنیفات کی تعداد نو سو ننانوے ہے اور یہ سب کتابیں وہ ہیں جو علوم دینیہ میں لکھی گئیں۔ ابوعلی الحسن بن داؤدؒ کہتے ہیں کہ اہل بصرہ کو چار کتابوں پر فخر و ناز ہے۔ کتاب البیان والتبیین للجاحظ، کتاب الحیوان، کتاب سیبویہ اور کتاب الخلیل فی العین لیکن ہم اہل کوفہ کو ان ستائیس ہزار حلال وحرام کے مسائل پر ناز ہے جو ایک کوفہ کے ہی جلیل القدر عالم یعنی امام محمد بن الحسنؒ نے بیان کئے ہیں۔ یہ سب مسائل قیاسی اور عقلی ہیں اور اس قدر ضروری ہیں کہ لوگوں کو ان سے بے خبر نہ رہنا چاہئے۔ امام محمد کی تصنیفات کی عظمت ووقعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ کسی شخص نے امام احمد بن حنبلؒ سے دریافت کیا "آپ کو ایسے ایسے دقیق مسئلے کہاں سے معلوم ہوئے؟" فرمایا "محمد بن الحسنؒ کی کتابوں سے۔" [۳]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "امام محمد بن الحسنؒ میرے نزدیک ہمیشہ عظیم المرتبت رہے۔ میں نے ان کی کتابوں پر ساٹھ دینار خرچ کئے ہیں۔" [۴]

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۷۔ (۲) الفوائد البہیہ ص ۱۶۳۔

(۳) بغدادی ج ۲ ص ۱۷۷۔ (۴) ایضاً ص ۱۷۸۔

علمی وقار و خود داری:

امام محمدؒ اگرچہ خلیفہ ہارون رشیدؒ کی مجلس میں آمد و رفت رکھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے علمی وقار اور خود داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ابو عبیدؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم سب امام محمدؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ہارون رشیدؒ آ گئے ہم سب ان کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو گئے۔ لیکن امام جس طرح بیٹھے تھے اسی انداز سے بیٹھے رہے۔ خلیفہ سے ملاقات کرنے کے لئے باری باری سے لوگ آتے جاتے رہے، یہاں تک کہ امام کی باری آئی تو آپ سے خلیفہ نے دریافت کیا کہ ''میری تعظیم کے لئے سب لوگ کھڑے ہوئے۔ لیکن آپ کیوں کھڑے نہیں ہوئے؟'' آپ نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ کو جس طبقہ میں شریک کر دیا ہے میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ میں پھر اس طبقہ سے باہر آؤں۔ آپ مجھ کو اربابِ علم میں شمار کرتے ہیں، اب میں اسے پسند نہیں کرتا کہ میں اس زمرہ سے نکل کر نوکروں اور خدمت گزاروں کے طبقہ میں شامل ہوں اور آپ کے ابن عم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''جو شخص یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں تو اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔ ان لوگوں سے آپ کی مراد علماء ہیں۔ جو لوگ حق خدمت ادا کرنے اور بادشاہ کے اعزاز کو بڑھانے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ دشمن کے لئے باعث ہیبت و رعب ہیں اور جو شخص بیٹھا رہا اس نے سنت کا اتباع کیا جو تم سے چھین لی گئی ہے۔ تو ایسا شخص تو تمہارے لئے باعث زینت ہے۔'' ہارون رشید نے یہ سن کر کہا کہ آپ نے اے محمد! بالکل درست فرمایا'' اس گفتگو کے بعد ہارون نے کہا ''حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنو تغلب سے اس شرط پر مصالحت کی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائیں گے، لیکن وہ اس شرط پر عامل نہ رہ سکے اور انہوں نے اپنی اولاد کو عیسائی بنا لیا، تو کیا اب اس نقض عہد کی وجہ سے ان کا خون مباح ہے؟'' آپ نے فرمایا ''ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کے بعد اپنی اولاد کو عیسائی بنا کر شرط صلح کی خلاف ورزی کی، لیکن حضرت عثمانؓ نے جو آپ کے ابن عم تھے اس کو انگیز کر لیا، حالانکہ ظاہر ہے کہ جو علم ان کے پاس تھا وہ آپ کے پاس نہیں ہے اور پھر اس کے بعد بھی اس پر عملدرآمد ہوتا رہا، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عمرؓ کے بعد بھی خلفاء نے اس صلح کو باقی رکھا۔ اب اگر آپ ان لوگوں کو قتل نہ کریں تو آپ سے اس کی نسبت کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی۔ آخر میں فرمایا ''جو میرے نزدیک حق تھا وہ میں نے عرض کر دیا۔ اب جو

کچھ آپ کی رائے ہو وہی اعلیٰ ہے۔'' ہارون نے یہ تقریر دلپذیر سن کر کہا ''نہیں! ہم وہی کریں گے جو مجھ سے پیشرو خلفاء نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ وہ مشورہ کرتے تھے پھر جو رائے زیادہ صائب ہوتی تھی حضرت جبرئیل اس کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے تھے۔ اب آپ کو لازم ہے کہ اس شخص کے (یعنی میرے) لئے دعا کریں جس کے ضعیف کاندھوں پر خدا نے حکومت کی ذمہ داری کا بوجھ رکھ دیا ہے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کا حکم کیجئے'' پھر کہا کہ میں نے آپ کے لئے کچھ عطیہ کا حکم کر دیا ہے، آپ اس کو اپنے ساتھیوں پر تقسیم کر دیجئے۔ چنانچہ آپ کو مال کثیر دیا گیا جو آپ نے اسی وقت تقسیم کر دیا۔ (۱)

فیاضی:

امام محمد زندگی نہایت شان و شوکت کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بڑے فیاض اور کشادہ دست بھی تھے اور خصوصاً علماء اور طلباء پر کافی خرچ کرتے تھے ابن العماد الحنبلیؒ لکھتے ہیں:

''وكان كثير البر بامام الشافعيؒ فى قضاء ديونه والانفاق عليه من ماله واعارة الكتب حتى يقال انه دفع له حمل بعير كتبا.'' (۲)

''وہ امام شافعی کے ساتھ بڑا سلوک کرتے تھے ان کا قرضہ اتارتے تھے ان پر اپنا مال خرچ کرتے تھے کتابیں عاریت پر دیتے تھے یہاں تک کہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک اونٹ لدی ہوئی کتابیں ان کو دیں۔''

امام شافعی سے تعلق و محبت:

جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ امام محمدؒ کو امام شافعیؒ سے گہرا تعلق خاطر اور رابطۂ محبت تھا۔ ایک معاملہ میں بعض شوافع نے امام محمدؒ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے امام شافعیؒ کی چغلی ہارون رشید سے کی تھی۔ لیکن علامہ ابن العماد الحنبلی اس کی پُرزور تردید کرتے ہیں۔، اور فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ نے تو اس واقعہ میں امام شافعیؒ کی جان بچائی ہے پھر بھلا وہ چغلی کس طرح کر سکتے تھے۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۳ و ۱۷۴۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ علوی خاندان کے دس شخصوں کی نسبت ہارون کو یہ رپورٹ پہنچی کہ وہ خلافت کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں، اور ہارون کو خلیفۂ جائز تسلیم نہیں کرتے۔ ہارون نے ان لوگوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا، چنانچہ یہ سب جن میں امام شافعی بھی شامل تھے گرفتار کر کے رقہ [1] سے بغداد بھیج دیئے گئے۔ لیکن اتفاق سے ہارون خود رقہ میں فروکش تھا، اس لئے انہیں پھر بغداد سے رقہ لایا گیا۔ ان کی جب خلیفہ کے سامنے پیشی ہوئی تو اس وقت امام محمد بن الحسنؒ جواب تک عہدۂ قضا پر مامور تھے، خلیفہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، امام کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان ملزمین میں امام شافعیؒ بھی ہیں تو انہیں ذاتی طور پر اس کا بڑا صدمہ ہوا لیکن فوری طور پر اس وقت کچھ کر نہ سکتے تھے اس لئے خاموش اور موقع کے منتظر رہے۔ ایک ایک ملزم باری باری سے خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا تھا اور سزائے قتل پا کر ہلاک ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ امام شافعیؒ کی باری آئی تو ہارون نے حسب معمول ان سے بھی یہی سوال کیا کہ آپ نے خلافت کے برخلاف علم بغاوت بلند کیا ہے؟ امام نے جواب دیا "حاشا و کلا! ہرگز نہیں۔ میں نہ طالبی ہوں اور نہ علوی، مجھ کو تو خواہ مخواہ ان لوگوں کے ساتھ مجرم قرار دے دیا گیا ہے اور ان میں شامل کر لیا گیا ہوں، میں بنی عبدالمطلب بن عبد مناف میں سے ہوں اور میرا کام علم اور فقہ میں منہمک رہنا ہے اور یہ جو قاضی (امام محمدؒ) آپ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہارون رشید نے کہا "اچھا تو آپ ہی محمد بن ادریس الشافعی ہیں؟" بولے "ہاں! اے امیر المومنین" پھر ہارون امام محمدؒ کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ کیا یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صحیح ہے؟ امام محمدؒ نے جواب دیا "جی ہاں! یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بالکل صحیح ہے بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ ہیں "**وله محل من العلم كبير**" خلیفہ نے یہ سن کر کہا "اچھا تو اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔ امام شافعی کا بیان ہے کہ امام محمد نے مجھ کو لے لیا اور وہی میری رہائی کا سبب بنے۔" [2]

ابن العماد الحنبلی نے یہ پورا واقعہ علامہ ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں "قیامت کے دن تک ہر شافعی کا فرض ہے کہ وہ برملا امام محمد بن الحسن کے اس احسان کا شکر گزار رہے اور ان کے لئے دعاء مغفرت کرے۔"

---

(۱) بغداد سے ۳۵۰ میل شمال مغرب میں دریائے فرات کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ رقہ کا طول البلد شرقی ۳۹ درجہ ۱۲ دقیقہ اور عرض البلد شمالی ۳۵ درجہ ۵۹ دقیقہ ہے (مؤلف)۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۴۔

وفات:

۱۸۹ھ میں بمقام رے انتقال کیا، اتفاق سے اسی دن مشہور امام نحو کسائی کی بھی وفات ہوئی تھی۔ ہارون رشید کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا ''آج نحو اور فقہ دونوں دفن ہو گئے۔''(۱)
یزیدی نے مرثیہ لکھا تو اس میں دونوں کی وفات پر ایک ساتھ ہی اظہار رنج و غم کرتا ہے۔

''اَسِیتُ علی قاضی القضاة محمد
فاذریت دمعی والعیون هجود
وقلت اذا ما الخطب اشكل من لنا
بایضاحه یوما وانت فقید
واقلقنی موت الكسائی بعده
وكادت بی الارض الفضاء تمید
هما عالمانا اودیا وَتخرِّما
فمالهما فی العالمین ندید.''(۲)

''ترجمہ: میں نے چیف جسٹس امام محمدؒ کی وفات کے غم میں اس وقت زاروقطار آنسو بہائے جبکہ تمام دنیا سو رہی تھی۔ مصیبت جب زیادہ ہولناک ہوگئی تو میں نے عالم تصور میں ان سے کہا کہ اب آپ کے بعد ہماری مشکلوں کو کون حل کرے گا۔ امام محمدؒ کی وفات کے بعد کسائی کی موت نے مجھے بے چین کر دیا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وسیع زمین مجھ پر لرزہ براندام ہو جاتی، یہ دونوں ہمارے عالم تھے جو وفات پا گئے اور ہم سے چھین لئے گئے۔ اب دنیا میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔''

(۱) خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۸۱۔ (۲) ایضاً ص ۱۸۲۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

سفیان نام ابو محمد کنیت والد کا نام عیینہ تھا، اصل وطن کوفہ تھا، پھر مکہ میں رہنے لگے تھے۔ ان کے دادا ابو میمون عمارۃ ضحاک کے بھائی محمد بن مزاحم کے غلام تھے سفیان کا خاندان ہمہ خانہ آفتاب تھا، یہ سب نو بھائی تھے جن میں سے حضرت سفیانؒ سمیت پانچ محدث ہوئے۔ سفیانؒ ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت:

اپنی تعلیم کے بارے میں حضرت سفیان خود بیان کرتے ہیں کہ ''میں نے چار برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کرلیا تھا، ساتویں برس میں حدیثیں لکھنی شروع کردی تھیں۔ پھر جب میں پندرہ سال کا ہوا تو میرے والد نے مجھ سے کہا'' بیٹے، اب تم سے بچوں کے احکام منقطع ہوگئے ہیں تمہیں علم حدیث کی تکمیل کے لئے علماءِ حدیث کی خدمت میں رہنا چاہئے اور اسے خوب یاد رکھو کہ علماء سے وہی شخص استفادہ کرسکتا ہے جو ان کی اطاعت کرے۔ پس تم ان کی اطاعت کرو تو سعادت اندوز ہوگے اور ان کی خدمت کروگے تو ان کے علم سے استفادہ کرسکوگے'' سفیان کہتے ہیں ''میں اپنے والد کی نصیحت پر ہمیشہ کاربند رہا اور کبھی اس سے عدول نہیں کیا۔''(۱)

علم وفضل:

حضرت سفیانؒ کے ذوق وشوق اور سعادتمندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم تفسیر وحدیث کے بڑے امام ہوگئے یہاں تک کہ بڑے بڑے ائمہ نے ان کی جلالتِ شان کو تسلیم کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے ''اگر امام مالک اور سفیان نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہوجاتا۔''(۲)

امام نوویؒ لکھتے ہیں: ''ان کی امامت، جلالت شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے۔'' امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ''میں نے ابن عیینہ سے بڑا کوئی عالم سنن نہیں دیکھا۔'' ابن عماد الحنبلی انہیں ''شیخ الحجاز واحد الاعلام'' لکھتے ہیں۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں ''سفیان امام عالی مقام اور حرم محترم کے محدث تھے۔''(۳)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱۹۔ (۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۴۔

تفسیر:

آپ تفسیر قرآن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی سے کسی نے پوچھا ''سفیان ثوری اور ابن عیینہ میں کیا فرق ہے؟'' بولے ''ان دونوں میں بھلا کیا موازنہ ہوسکتا ہے، ابن عیینہ کو معرفت قرآن، تفسیر، حدیث اور متفرق، حروف کی تحقیق میں وہ مقام حاصل ہے جو ثوری کو میسر نہیں ہے۔'' ابن وہب کہتے تھے ''میں نے سفیان بن عیینہ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا عالم نہیں دیکھا۔''(۱)

حدیث:

حدیث ان کا خاص فن تھا، اس کی تحصیل انہوں نے امام ابن شہاب زہری اور عمرو بن دینار سے خاص طور سے کی تھی ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت سفیان نے جن محدثین سے روایت کی ہے ان میں چند نام یہ ہیں۔

ابواسحٰق السبیعی، زیاد بن علاقہ، ابراہیم، موسیٰ اور محمد بن عقبہ، اسمٰعیل بن امیہ، ایوب بن ابی تمیمۃ السختیانی، یزید بن ابی بردہ، حمید الطّویل، ابوحازم بن دینار، سلیمان التیمی، سلیمان الاحول، صالح بن کیسان، صالح بن صالح بن حی، صفوان بن سلیم ان کے علاوہ بیشمار محدثین ہیں جن سے حضرت سفیان نے روایت کی ہے۔(۲)

ابن عیینہؒ نے حدیث کی تحصیل اتنی کم عمری میں شروع کردی تھی کہ امام زہریؒ فرماتے تھے ''میں نے حدیث کا طالب سفیان سے کم عمر نہیں دیکھا۔''(۳)

سولہ برس کی عمر سے انہوں نے امام زہری کی ملازمت شروع کردی تھی پھر اپنی محنت، ذاتی شوق اور ذہانت وقوت حافظہ کی وجہ سے تلامذۂ زہری میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا کہ سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ قابل اعتماد ہوگئے۔ ابن مدینی کا بیان ہے کہ زہری کے اصحاب میں ابن عیینہؒ سے بڑھ کر کوئی اور معتمد اور ثقہ نہیں ہے۔''(۴)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج۹ ص ۱۵۲، ۱۵۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج۴ ص ۱۱۸۔

(۳) تاریخ خطیب بغدادی ج۹ ص ۱۷۶۔ (۴) تاریخ خطیب بغدادی ج۹ ص ۱۷۶۔

اجلۂ علماء کا اعتراف:

حضرت سفیانؒ کو حدیث میں جو مرتبۂ عظیم حاصل ہے بڑے بڑے ائمۂ فن نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ بشیر بن المفضل کہتے تھے "اب زمین پر کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہا ہے جو سفیان بن عیینہؒ کے مثل ہو۔" امام شافعیؒ کا ارشاد ہے: "امام مالکؒ اور سفیانؒ دونوں حدیث میں قرین ہیں۔" یحییٰ بن سعید نے ابن مدینی سے بیان کیا کہ "اب ابن عیینہ کے سوا اساتذۂ حدیث میں کوئی باقی نہیں رہا ہے۔" اس پر ابن مدینی نے پوچھا "اے ابوسعید! کیا سفیانؒ حدیث میں امام ہیں؟ فرمایا "وہ تو چالیس برس سے امام ہیں" عجلی کا قول ہے۔ "سفیان کوفی ہیں معتمد ہیں۔ حدیث میں ثبت ہیں ان کی حدیثیں حسن ہوتی ہیں اور ان کا شمار حکماء اصحابِ حدیث میں ہے" عثمان دارمی کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں نے ابن معینؒ سے دریافت کیا کہ "آپ کو عمرو بن دینارؒ کے شاگردوں میں ابن عیینہؒ زیادہ پسند ہیں یا ثوریؒ؟" کہا "عمرو بن دینارؒ کی معرفت ابن عیینہؒ کو ثوریؒ سے زیادہ حاصل ہے" پھر دریافت کیا "حماد بن زیدؒ کے متعلق کیا رائے ہے؟" بولے "ابن عیینہؒ کو ان سے بھی زیادہ علم ہے" اس کے بعد انہوں نے حضرت شعبہؒ کی نسبت دریافت کیا تو فرمایا "ابن عیینہؒ ان سے بھی بڑے عالم ہیں۔" ابن مہدیؒ کہتے ہیں "ابن عیینہؒ اہل حجاز کی حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ابوحاتم الرازیؒ کا بیان ہے کہ "ابن عیینہؒ ثقہ امام ہیں اور امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک اور ابن عیینہ سب سے زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں۔"(۱)

فقہ:

حضرت سفیانؒ فقہ میں بھی مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

"ما رایت احدًا من الفقھاء اعلم بالقران والسنن منه." (۲)

"میں نے فقہاء میں سے کسی شخص کو ابن عیینہ سے زیادہ قرآن وسنن کا عالم نہیں دیکھا۔"

لیکن اس کے باوجود احتیاط کا یہ عالم تھا کہ فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

---

(۱) یہ سب اقوال تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰ و ۱۲۱ اور تاریخ بغدادی ج ۹ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰۔

"مارأيت احدًا من الناس فيه جزالة العلم مافی ابن عيينه
ومارأيت احدا انف عن الفتيامنه." (۱)

''میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس میں علم کی بہتات ایسی ہو جیسی ابن عیینہ میں ہے اور میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو ابن عیینہؒ سے زیادہ فتوے سے اجتناب کرنے والا ہو۔''

مرجع خلائق:

ان کمالاتِ علم وفضل کی وجہ سے حضرت ابن عیینہؒ عوام وخواص کے مرجع ہو گئے تھے مسعر بن کدامؒ نے ان سے جبکہ یہ ابھی نوعمر ہی تھے درس حدیث کی فرمائش کی انہوں نے عذر کرتے ہوئے کہا ''میں تو ابھی نوعمر ہوں'' مسعر بولے ''تمہارے پاس امام زہریؒ اور عمرو بن دینارؒ موجود ہیں'' (۲) پھر حضرت سفیانؒ نے درس شروع کیا تو لوگوں کی کثیر تعداد اس کی سماعت کے لئے حاضر ہونے لگی چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے آپ کے تلامذہ کے نام ایک صفحہ میں لکھے ہیں جن میں بعض بڑے بڑے امامِ وقت بھی ہیں۔ لیکن آپ کی فروتنی اور انکسارِ نفس کا یہ عالم تھا کہ اس مجمع کثیر کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتے تھے:

"خلت الديار فسدت غير مسود
ومن الشقاء تفردی بالسودد." (۳)

''ترجمہ: دیار خالی ہو گئے ہیں اس لئے میں بغیر کسی کے سردار بنائے ہوئے خود سردار بن گیا ہوں اور یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں سرداری میں تنہا ہوں۔''

دور دراز کے لوگوں کو آپ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق رہتا تھا کہ آپ مکہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور ہر سال حج کرتے تھے تو اس موسم میں دور دراز سے اور لوگ بھی بکثرت حج کرنے آتے تھے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

"والباعث لهم لقی ابن عيينه فيزد حمون عليه فی ايام الحج."

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۴ ص ۱۲۰۔ (۲) خطیب بغدادی ج۹ ص ۱۷۶۔ (۳) ایضاً ص ۱۷۸۔

''اوران کے لئے بڑا باعث ابن عیینہؒ سے ملاقات کا جذبہ تھا چنانچہ حج کے زمانہ میں ان کے پاس لوگوں کا بہت ہجوم رہتا تھا۔''

زہد وورع:

علمی کمالات کے ساتھ زہد واتقا کے لحاظ سے بھی سب معاصرین میں ممتاز تھے ابو یوسف الغسولی بیان کرتے ہیں ''میں ایک مرتبہ حضرت سفیان کے پاس گیا تو دیکھا کہ ان کے سامنے جو کی دو ٹکیاں رکھی ہوئی ہیں'' مجھ کو دیکھ کر فرمانے لگے ''چالیس سال سے میری غذا یہی ہے۔''(۱) ابن حبان کہتے ہیں ''سفیان معتبر حفاظ حدیث اور ارباب ورع و دین میں سے ہیں'' لالکائی کا بیان ہے سفیان اپنے تثبت اور اتقان کی وجہ سے تزکیہ سے مستغنی ہیں۔'' (۲)

عبادت:

عبادت گزار بھی بہت تھے خصوصاً حج کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں ان کے والد ایک مرتبہ اپنے ساتھ کوفہ سے مکہ معظمہ حج کے لئے لائے تھے۔ اس کے بعد تو ان کا تانتا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ستر حج کئے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر مرتبہ حج کرنے کے بعد دعا کرتے تھے کہ ''اے اللہ تو اس حج کو آخری حج نہ بنا'' ان کی یہ دعا قبول ہوتی تھی اور اس کے بعد بھی انہیں حج کا موقع ملتا تھا۔ آخری مرتبہ حج کرنے کے بعد انہیں پھر یہ دعاء مانگتے ہوئے شرم آئی چنانچہ انہیں اس کے بعد حج کا موقع نہیں ملا۔'' (۳)

جلالت شان:

حضرت سفیانؒ کی اس جلالتِ شان کی وجہ سے خلیفۂ وقت بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا ابوالربیع کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ہارون الرشید امیر المومنین سے ملا تو اس نے پہلے ہاشمی علوئین کا حال پوچھا پھر کہنے لگا ''سید الناس کا کیا حال ہے؟'' میں نے کہا ''امیر المومنین! آپ کے سوا اور کون سید الناس ہے؟ بولا ''سفیان بن عیینہؒ سید الناس ہیں۔'' (۴)

---

(۱) تہذیب الاسماء، ج ۱ ص ۲۲۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۲۔

(۳) تہذیب الاسماء، ج ۱ ص ۲۲۵۔ (۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۷۹

مقولے:

حضرت سفیانؒ کم بولتے تھے لیکن جب بولتے تھے تو ان کی باتیں حکمت و پند کا گنجینہ ہوتی تھیں چنانچہ ان کے بعض مقولے یہ ہیں:

(۱) جس آدمی کی عقل زیادہ ہوتی ہے اس کا رزق کم ہوتا ہے۔

(۲) زہد دراصل صبر ہے اور موت کا انتظار۔ اور علم اگر تم کو نفع نہ پہنچائے تو وہ نقصان پہنچائے گا۔(۱)

وفات:

۳۰ جمادی الاخری ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ ابن مناذر نے مرثیہ کہا جس میں ایک شعر یہ ہے۔

"من کان یبکی رجلاً هالکا
فلیبک للاسلام سفیاناً"

ترجمہ: "جو شخص کسی مرنے والے پر روئے اسے چاہئے کہ اسلام کی خاطر سفیانؒ پر بھی اشک بہائے۔"

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۳۔

یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یحییٰ نام، ابوسعید کنیت، ان کے دادا فروخ بنو تمیم کے غلام تھے۔

پیدائش:

۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کو تبع تابعین کی جماعت کا ''گل سرسید'' کہا جائے تو بالکل بجا ہے حافظ ذہبی انہیں ''الامام العلم'' اور ''سید الحفاظ'' لکھتے ہیں۔ [1] یحییٰ بن معینؒ ایسے یگانہ روزگار محدث کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن مہدی نے فرمایا ''تم اپنی آنکھوں سے یحییٰ القطان جیسا کوئی شخص نہیں دیکھو گے۔'' علامہ نووی فرماتے ہیں: ''علماء نے ان کی امامت، جلالت، اور ان کے حفظ اور علم وصلاح کی بہتات پر اتفاق کیا ہے۔'' امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ''یحییٰ القطانؒ اپنی ایک ایک ادا کے اعتبار سے بے مثل وبے نظیر تھے۔'' [2]

حدیث:

فن حدیث میں حضرت یحییٰ بن سعید کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اہل عراق میں انہی کے دم سے فن حدیث کا چرچا ہوا۔ انہوں نے رواۃ کی تنقید اور ان کی جرح وتعدیل کا خاص اہتمام کیا۔ اور پھر جو راوی ثقہ معلوم ہوئے صرف انہیں کی روایتوں کو رائج کیا، اور جو لوگ ضعیف ثابت ہوئے ان کو ترک کر دیا۔ [3] امام احمدؒ فرماتے ہیں میں نے یحییٰ بن سعید سے کم خطا کرنے والا کوئی نہیں دیکھا'' عجلی کا بیان ہے کہ ''یحییٰ کی حدیثیں بڑی صاف ستھری ہوتی تھیں اور وہ بجز ثقات کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے۔'' [4]

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۴۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴ و ۱۵۵۔

(۳) ایضاً ص ۱۵۵۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۵

انہوں نے جن اکابرامت سے استفادہ کیاان میں سے بعض نام یہ ہیں۔یحییٰ بن سعید الانصاری، حنظلہ بن ابی سفیان، ابن عجلان، ابن جریج، سعید بن ابی عروبہ، ثوری، ابن عیینہ، امام مالک، مسعر بن کدام، شعبہ، سلیمان التیمی، ہشام بن عروہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت شعبہ کے ساتھ ان کو بڑی خصوصیت تھی۔اپنے بیان کے مطابق کامل بیس برس تک وہ ان کی خدمت میں رہے تھے۔اور ہر روز زیادہ سے زیادہ ان سے تیرہ حدیثوں کی سماعت کرتے تھے۔اس طویل ملازمت شیخ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اتنے بڑے محدث ہوگئے کہ کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تھا تو خود حضرت شعبہؒ ان کو حکم بناتے اوران کی طرف رجوع کرتے تھے۔ابن مہدی کہتے ہیں ''ایک مرتبہ حضرت شعبہؒ کے سامنے کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔اس پر لوگوں نے کہا ''آپ ہمارے اوراپنے درمیان کسی کو حکم مقرر کردیجئے حضرت شعبہ نے یحییٰ بن سعید القطان کا انتخاب کیا، چنانچہ حضرت یحییٰ تشریف لائے تو ان کے سامنے اصل معاملہ پیش کیا گیا۔انہوں نے اتفاق کی بات، فیصلہ خود حضرت شعبہ کے خلاف کیا۔لیکن حق پرستی وانصاف پسندی کی شان دیکھو، شعبہ شیخ واستاذ ہونے کے باوجود اس پر ذرا ناراض نہیں ہوئے، بلکہ فرمایا تو یہ کہ ''اے احول (یحییٰ کی ایک آنکھ میں بھینگا پن تھا) تمہاری گمشدگی کو کون برداشت کرسکتا ہے۔'' (۱)

ان کو حدیث سے انتہا درجہ شغف تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ذوق تنقید اتنا صحیح دیا تھا کہ صحیح وسقیم حدیثوں میں فوراً امتیاز کرلیتے تھے۔ابن مہدی کا بیان ہے کہ ''میں نے حدیث کی طلب اوراس کے قبول کرنے میں یحییٰ بن سعید القطان اورسفیان بن حبیب سے زیادہ اچھا کوئی شخص نہیں دیکھا'' ابن المدینی کہتے ہیں ''صرف تین شخص ایسے ہیں جنہوں نے حدیث طلب کی، اس کے ساتھ اعتنا کیا اس پر جمے رہے اور ساری عمر اسی مقدس کام میں صرف کردی۔ ایک یحییٰ بن سعید القطان دوسرے سفیان بن حبیب تیسرے یزید بن زریع۔'' (۲)

فن حدیث میں سب سے مشکل اور اہم مرحلہ علم اسماء الرجال کا ہے، اورایک بڑی حد تک حدیث کی صحت وسقم کا دارومدار اسی پر ہے۔حضرت یحییٰ بن سعید کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ انہیں اس فن میں سب سے زیادہ کمال حاصل تھا۔علی بن المدینی فرماتے ہیں ''میں نے یحییٰ القطان سے بڑا کوئی عالم علم رجال نہیں دیکھا، اسی لئے ابن مہدی سے زیادہ حدیث کے خطا وصواب کو جاننے والا کوئی نہیں ملا، پس یہ دونوں جس راوی کو ضعیف قرار دیدیتے ہیں میں

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۳۶۔اصل عبارت یہ ہے ''من یستطیع فقدک'' لیکن بعض کتابوں میں بجائے فقد کے مقد کا لفظ لکھا ہوا اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تمہاری تنقید کو کون سہار سکتا ہے۔ (۲) ایضاً ص ۱۳۸۔

اس کو ترک کر دیتا ہوں اور جس راوی سے یہ دونوں روایت قبول کرتے ہیں میں بھی قبول کر لیتا ہوں۔ (۱)

حضرت یحییٰ بن سعید کے تثبت فی الحدیث پر سب کا اتفاق ہے۔ اثرم کا بیان ہے کہ ''میں نے مختلف مواقع پر امام احمد بن حنبل کو یہ کہتے سنا ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان کس درجہ قوی الحافظہ اور کتنے بڑے ثقہ تھے، وہ محدث تھے۔'' اور یہ فرما کر دیر تک ان کی ثنا کرتے رہے۔'' فضل بن زیاد کی روایت امام احمدؒ سے متعلق یہ ہے کہ ''میں نے خود انہیں فرماتے سنا ہے'' اللہ کی قسم! ہم نے یحییٰ بن سعید القطان جیسا کوئی شخص نہیں پایا۔'' ایک اور مقولہ میں ارشاد فرماتے ہیں'' بصرہ میں حضرت یحییٰ بن سعید تثبت کی انتہا ہے۔'' (۲)

قوت حافظہ:

علم الرجال میں کمال پیدا کرنے کے لئے قوت حافظہ کی سخت ضرورت ہے۔ قدرت کو جس سے جو کام لینا منظور ہوتا ہے، اس کی فطرت میں اسی کے مطابق قویٰ اور صلاحیتیں ودیعت رکھ دی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت قطانؒ کا حافظہ بھی غیر معمولی اور قوی تھا۔ سلیمان بن الاشعث نے ایک دفعہ امام احمدؒ سے پوچھا'' کیا یحییٰ آپ کو اپنے حافظہ سے روایات سناتے تھے؟'' فرمایا ہم نے ان کے پاس کتاب نہیں دیکھی وہ ہماری کتاب کی طویل طویل حدیثیں پڑھ دیا کرتے تھے۔''

بعض محدثین امتحاناً ان کے سامنے تدلیس کر کے روایت کرتے تھے، لیکن وہ فوراً روایت کا سقم معلوم کر لیتے اور اس پر متنبہ کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ثوریؒ نے ایک روایت کی سند اس طرح نقل کی "حدثنا ابو سهل عن الشعبي" حضرت یحییٰؒ نے فوراً کہا'' یہ ابو سہل تو محمد بن سالم ہیں'' ثوری یہ سن کر حیران رہ گئے اور فرمایا'' میں نے آپ جیسا کوئی نہیں دیکھا، آپ سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں۔''

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ محمد بن سالم جن کی کنیت ابو سہل تھی ایک ضعیف راوی تھا۔ اس کا نام محمد بن سالم مشہور و معروف تھا، مگر کنیت ابو سہل کوئی نہیں جانتا تھا حضرت ثوری نے اسناد بیان کی تو اس میں راوی کا نام لینے کے بجائے اس کی کنیت ذکر کر دی اور خیال یہ کیا کہ حضرت یحییٰؒ بن سعید القطان کو کیا راوی کی کنیت معلوم ہوگی؟ اس لئے وہ اس اسناد پر کچھ نہ کہیں گے اور شاید

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۷۔ (۲) یہ سب مقولے تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۸ سے ماخوذ ہیں۔

قبول کرلیں گے۔ لیکن ان کی یہ توقع غلط ہوئی "حضرت یحییٰؒ جو علم الرجال کے امام تھے" نام کی طرح اس راوی کی کنیت سے بھی باخبر تھے چنانچہ انہوں نے سنتے ہی فرمادیا کہ یہ ابوسہل تو محمد بن سالم ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور عجیب واقعہ قابل ذکر ہے۔ ابن مہدی کہتے ہیں ایک مرتبہ مجھ سے حضرت سفیان نے فرمایا "تم کوئی ایسا آدمی لاؤ جس سے میں حدیث بیان کروں" یہ حضرت یحییٰ القطانؒ کو لے کر پہنچ گئے دونوں میں مذاکرہ دیر تک ہوتا رہا حضرت یحییٰؒ یہاں سے فارغ ہوکر گھر تشریف لے گئے تو سفیان نے مجھ سے کہا کہ مہدی! میں نے تم سے کوئی انسان لانے کے لئے کہا تھا، لیکن تم بجائے انسان کے جن لے آئے" حافظ ذہبی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت سفیانؒ نے حضرت یحییٰؒ کے غیر معمولی قوت حافظہ سے مرعوب ہوکر یہ فرمایا تھا۔" (۱)

جلالتِ علم

انؒ کے علمی تبحر اور کمال فضل کی وجہ سے زعماء امت ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ بندار کہتے ہیں " **وھو امام اھل زمانہ** " امام نسائی فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے اللہ کی طرف سے امانت دار تین بزرگ ہیں۔ امام مالکؒ، شعبہؒ اور یحییٰ القطانؒ۔" (۲) ابن سعد فرماتے ہیں "**کان ثقۃ حجۃ رفیعا ماموناً**" (۳) خلیلی کا بیان ہے کہ وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے اور بصرہ میں امام مالک کے اصحاب میں سب سے زیادہ جلیل القدر تھے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "ان سے تمام ائمہ نے احتجاج کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ جو یحییٰؒ کو ترک کرے گا ہم اسے ترک کردیں گے۔" (۴)

اگرچہ ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے وہ کچھ زیادہ وجیہ نہیں تھے اور دیکھنے میں ایک معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے، لیکن ان کی علمی تمکنت ووقار کا یہ عالم تھا کہ وہ خود عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مسجد ہی میں ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور بڑے بڑے اساطینِ علم حدیث جن میں علی بن المدینیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ جیسے اکابر شامل ہوتے تھے۔ کھڑے کھڑے ان سے حدیث کے متعلق استفسارات کرتے رہتے تھے۔" (۵) ابن عمار کا بیان ہے کہ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۷۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۷۵-۲۷۶۔ (۳) بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۲۱۹۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۲۲۰۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۲۱۹۔

''میں حضرت یحییٰ القطان کی طرف دیکھتا تھا تو وہ بظاہر ایک بڑھئی معلوم ہوتے تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ یہ کسی مسئلہ کی نسبت کیا کوئی تسلی بخش جواب دے سکیں گے؟ لیکن جب وہ تقریر شروع کرتے تھے تو اعاظم فقہاء خاموش ہو کر اسے سنتے تھے۔''(۱)

تلامذہ:

ان کی شہرت سن کر دور دور سے طلباء علم حدیث ان سے استفادہ کے لئے آتے تھے جن میں بعض بڑے بڑے نامور محدثین ہوئے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابن مہدی، امام احمد بن حنبل، مسدد، ثوری، ابن عیینہ، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ، ابوعبید القاسم بن سلام، ابوخیثمہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، عمرو بن علی، ابن مثنیٰ، ابن بشار رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (۲)

خشیت ربانی:

خوف خدا علماء کا خاص شعار ہے حضرت یحییٰ القطان علم و فضل کے لحاظ سے جتنے بلند پایہ امام تھے، اسی قدر خوف خدا بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، کوئی آیت جس میں قیامت کے دن کا ذکر، یا عذاب الٰہی کا بیان ہوتا، سنتے تھے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا اور بعض اوقات فرطِ تاثر سے غشی بھی طاری ہو جاتی تھی۔ ابن مدینی کا بیان ہے کہ ''ہم یحییٰ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے سورۂ دخان کی تلاوت شروع کر دی، اس کا سننا تھا کہ حضرت یحییٰ القطان پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔''(۳) بندار کہتے ہیں ''میں بیس سال تک برابر حضرت یحییٰ بن معین کی خدمت میں آتا جاتا رہا، میں گمان نہیں کرتا کہ انہوں نے کبھی کوئی گناہ کیا ہو۔''(۴) زہیر بن حرب کہتے ہیں ''ہم ایک دفعہ حضرت یحییٰ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں محمد بن سعید الترمذی آ گئے۔ حضرت یحییٰ نے ان سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی، انہوں نے تلاوت جو شروع کی تو یحییٰ پر غشی چھا گئی یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو گھر پہنچایا گیا۔''(۵) یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ ''حضرت یحییٰ القطان قرآن مجید کے سننے کی تاب ہی نہیں لا سکتے تھے۔ جب ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت ہوتی تھی وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا منہ زمین سے لگ جاتا تھا۔''(۶)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۰۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔
(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۶۔ (۴) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۵۔
(۵) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۱۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۵۔

عبادت:

اس خشیتِ ربانی کی وجہ سے وہ عبادت بھی زیادہ کرتے تھے، قرآن مجید کی تلاوت سے بڑا شغف تھا، بیس سال تک ان کا معمول رہا کہ پوری شب میں ایک قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ (۱) نماز باجماعت کے اتنے پابند تھے چالیس سال کی مدت میں کبھی ایک مرتبہ بھی ان سے جماعت فوت نہیں ہوئی۔ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ نماز چاشت کے بھی اتنے پابند تھے کہ چالیس سال تک کبھی ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے نماز چاشت مسجد میں ادا نہ کی ہو۔"(۲) ان کے ہاتھ میں ایک تسبیح رہتی تھی جس سے وہ برابر ذکر اللہ کرتے رہتے تھے۔

تسلیم ورضا:

کمالِ عبدیت یہ ہے کہ انسان خوشی اور غم، صحت اور مرض دونوں حالتوں میں خداوند تعالیٰ کی رضامندی اور اس کی مشیت پر صابر وشاکر رہے اور کسی حالت میں بھی اپنے لبوں کو حرف شکایت سے آشنا نہ ہونے دے۔ اس لحاظ سے بھی حضرت یحییٰؒ پیکر تسلیم ورضا اور مجسمۂ صبر ووفا تھے۔ بیماری میں اگر کوئی بر سبیل عیادت اُن سے کہتا "عافاک اللہ" خدا آپ کو شفا عطا فرمائے تو وہ اس کے جواب میں کہتے "جو بیماری خدا کی مرضی سے آئی ہے میں بھی اس پر خوش اور رضامند ہوں۔"(۳)

متانت وسنجیدگی:

خدا کی جلالت وعظمت کا تصور ہر وقت ان پر طاری رہتا تھا، اس لئے وہ ہمیشہ بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے پوتے احمد بن محمد کا بیان ہے کہ "میرے دادا کبھی نہ مذاق کرتے تھے، نہ ہنستے تھے۔ انہوں نے کبھی قہقہہ نہیں لگایا، ایسی ہی کوئی بات ہوتی تو زیادہ سے زیادہ متبسم ہو جاتے تھے، وہ کبھی حمام میں داخل نہیں ہوئے، کبھی سرمہ نہیں لگایا اور نہ کبھی بالوں کو کسی تیل سے مہکایا۔ البتہ ہاں خضاب عمدہ قسم کا استعمال کرتے تھے۔"(۴)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔

(۳) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰۔ (۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۱۔

قناعت:

ان تمام اوصاف حسنہ کالازمی نتیجہ قناعت ہے۔ چنانچہ ان میں یہ وصف بھی بدرجہ اتم موجود تھا، محمد بن ابی صفوان کا بیان ہے کہ "حضرت یحییٰؒ کے گھر میں جو غلہ آجاتا تھا وہ اس پر ہی قناعت کرتے اور اسی سے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ گیہوں آگئے تو وہی کھالئے، جَو مہیا ہوگئے تو انہی پر اکتفا کرلیا، اور کبھی فقط کھجوریں آگئیں تو انہیں پر بس کرتے تھے۔"(۱)

رقت قلب:

ان کا قلب نہایت رقیق اور کمزور تھا، ابن معین فرماتے ہیں "یحییٰ القطانؒ ضعیف القلب تھے۔ ایک دفعہ ان کے پڑوسی میں اور خود ان میں کسی بات پر نزاع ہوگیا، پڑوسی نہایت دریدہ دہن اور گستاخ زبان تھا، غصہ میں حضرت قطانؒ کو برا بھلا کہہ بیٹھا۔ حضرت یحییٰ رونے لگے اور اس حالت میں بار بار فرماتے تھے "ہاں یہ سچ تو کہتا ہے، میں بھلا ہوں کون؟ اور کیا ہوں؟"

حضرت یحییٰ کے ساتھ عام طور پر لوگوں کو جو عقیدت وارادت تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کی زندگی میں ہی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی متعدد لوگوں نے ایسے خواب دیکھے جن سے حضرت یحییٰ کی بلندی مرتبت، آخرت میں ان کا علو مقام خدا کی بے پایاں مغفرت وبخشش اور آخرت کی پکڑ سے ان کی نہایت عزت ووقعت کے ساتھ خلاصی ورستگاری متبادر ہوتی ہے۔(۲)

وفات:

ماہ صفر ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۴۲۔

(۲) اس طرح کے کئی خواب تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۴۲، ۱۴۴ پر مذکور ہیں۔

یحییٰ بن ابی زائدہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یحییٰ نام، ابو سعید کنیت، والد کا نام زکریا تھا۔ لیکن اپنے دادا ابو زائدہ کی نسبت سے مشہور ہیں۔ محمد بن المبشر الہمدانی کے غلام تھے۔

تعلیم وتربیت:

حضرت یحییٰ کے والد زکریا بن ابی زائدہ خود بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے اس لئے حضرت یحییٰ کو علم کے ساتھ ایک علمی گھرانہ میں پیدا ہونے کے باعث قدرتی مناسبت تھی۔ پھر ان کے والد کو بھی شروع سے ہی اپنے بیٹے کی تعلیم کا بڑا خیال تھا۔ عیسیٰ بن یونس بیان کرتے ہیں ''میں نے زکریا بن ابی زائدہ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے صغیر السن بچہ یحییٰ کو مجالد بن سعید کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے تھے اور ان سے کہتے تھے'' بیٹے ان حدیثوں کو یاد کرلو۔ مزید براں طرفہ یہ ہوا کہ حضرت یحییٰ، کوفہ کے رہنے والے تھے جو اس زمانہ میں اسلامی علوم وفنون کا گھوارہ تھا۔ آپ نے ان قدرتی مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔

علم وفضل:

چنانچہ آپ نے حدیث کا سماع اپنے والد ماجد زکریا بن ابی زائدہ کے علاوہ ہشام بن عروہ، اسماعیل بن ابی خالد، سلیمان الاعمش، عبداللہ بن عمر العمری، حجاج بن ارطاۃ، بن عون، اور عاصم الاحول وغیرہم سے کیا۔ اور اپنے ذوق وشوق اور شیوخ کے فیض التفاق سے علم وفضل میں وہ مرتبۂ بلند حاصل کیا کہ سرآمد علماء روزگار بن گئے۔ ان کی فضیلت کی دلیل یہی کیا کم ہے کہ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن آدم، قتیبہ بن سعید، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ ایسے جلیل المرتبت ائمۂ اسلام ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں۔ (۱)

علی بن المدینی کی جلالتِ شان سے علم حدیث کا کوئی طالب ناواقف نہیں آپ فرماتے ہیں ''حضرت ابن عباسؓ اپنے زمانہ میں علم کے منتہیٰ تھے۔ ان کے بعد حضرت شعبیؒ اپنے

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۱۵۔

عہد میں علم کے مرکز قرار پائے۔ پھر حضرت سفیان ثوریؒ کا عہد آیا تو وہ امام وقت ہوئے اسی طرح حضرت یحییٰ بن ابی زائدہؒ اپنے زمانہ میں علم کے منتہیٰ تھے۔"(۱) ایک مقولہ میں اس پر اور اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ "امام ثوریؒ کے بعد حضرت یحییٰ سے بڑھ کر کوئی شخص معتبر فی الحدیث نہیں تھا۔"(۲) حضرت یحییٰ بن سعید القطان مشہور امام جرح وتعدیل ہیں لیکن وہ بھی حضرت یحییٰ بن ابی زائدہ کی علمی وجاہت وجلالت سے اس درجہ مرعوب تھے کہ فرمایا کرتے تھے "کوفہ میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی مخالفت میرے لئے یحییٰ بن ابی زائدہ کی مخالفت سے زیادہ صبر آزما اور شدید ہو۔"(۳) حضرت یحییٰ بن معینؒ سے پوچھا گیا "آپ کو اسماعیل بن زکریا زیادہ پسند ہیں یا یحییٰ بن ابی زائدہؒ؟" فرمایا "یحییٰ بن ابی زائدہ، سائل نے پھر بات بنانے کے لئے دریافت کیا "تو آپ کے نزدیک یہ دونوں بھائی ہیں" ارشاد ہوا "نہیں"۔(۴)

حدیث:

ان کا خاص فن حدیث تھا۔ جس میں وہ مسلمہ روزگار امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ ابوخالد الاحمر بیان کرتے ہیں "کان یحییٰ جید الاخذ للحدیث" حضرت یحییٰ کو حدیث کے انتخاب میں بڑی بصیرت حاصل تھی، حضرت یحییٰ میں خاص کمال یہ تھا کہ وہ عموماً کتاب دیکھے بغیر اپنے حافظہ سے روایت کرتے تھے۔"(۵) لیکن اس کے باوجود کیا مجال تھی کہ کہیں خطا ہو جائے۔ حضرت یحییٰ بن معین نقد وجرح میں نہایت متشدد ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک حدیث میں حضرت یحییٰ کی غلطی کا ادعاء کر سکے۔ فرماتے ہیں یحییٰ بن ابی زائدہ نہایت فہیم وعقیل تھے۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ ایک حدیث کے علاوہ انہوں نے کوئی اور خطا کی ہے(۶) اسماعیل بن حماد کہتے تھے "یحییٰ بن ابی زائدہ حدیث میں ایک "خوشبوؤں میں بسی ہوئی دلہن" کی مانند ہیں"۔(۷)

حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں "عبداللہ بن مبارکؒ اور یحییٰ بن ابی زائدہؒ دو ایسی شخصیتیں ہیں کہ ہم نے ان کا مثل دیکھا ہی نہیں۔"(۸)

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۵۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۸۔ (۳) کتاب الانساب للسمعانی ص ۵۹۲۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۸۔ (۵) ایضاً ص ۲۰۹۔ (۶) تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۷۔

(۷) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۹ (۸) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۷۔

مدارِ اسناد:

حضرت یحییٰ اپنے زمانہ میں اسناد کے سب سے بڑے مدار تھے۔ علی بن المدینیؒ بیان کرتے ہیں ''اسناد کا دارومدار پہلے زمانہ میں چھ بزرگوں پر تھا (آپ نے ان کے اسماءِ گرامی بھی شمار کرائے) پھر ان چھ اربابِ علم وفضل کا علم ایسے مختلف اصحاب کی طرف منتقل ہو گیا جنہوں نے علم کی مختلف شاخوں میں کمال پیدا کیا (حضرت علی بن المدینی نے اس موقع پر بھی ان بزرگوں کا نام لیا) پھر ان سب کا علم دو بزرگوں پر آ کر منتہی ہو گیا ایک ابو سعید یحییٰ بن سعیدؒ جو بنو تمیم کے غلام تھے اور جنہوں نے صفر ۱۹۸ھ میں وفات پائی اور دوسرے بزرگ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح یہ دونوں بزرگ نام اور کنیت میں ایک ہیں علم کی جامعیت ومرکزیت میں بھی ایک ہی ہیں۔''(۱)

ثقاہت:

ثقاہت وتثبت کے لحاظ سے بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ تمام ائمۂ حدیث ان کی ثقاہت پر متفق ہیں۔ حضرت یحییٰ بن معینؒ سے پوچھا گیا ''آپ کو ابن مسہر زیادہ محبوب ہیں یا یحییٰ بن ابی زائدہؒ'' بولے ''دونوں ثقہ اور قابلِ وثوق ہیں۔''(۲) امام نسائی اور عجلی انہیں ثقہ بتاتے ہیں۔ ابن نمیر، اتقان کے لحاظ سے ان کو امام شافعی سے بھی فائق مانتے ہیں۔ ابو حاتم فرماتے ہیں ''مستقیم الحدیث ثقہ صدوق''(۳) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ''یحییٰ بن ابی زائدہ کا شمار کوفہ کے حفاظ حدیث میں ہوتا ہے، وہ متقن، ثبت اور صاحبِ سنت تھے۔''(۴) ابن عماد الحنبلی بھی ''شذرات الذہب'' میں یہی لکھتے ہیں۔(۵)

حدیث میں تصنیف:

حضرت یحییٰ بن ابی زائدہؒ کو علم حدیث میں ایک نمایاں خصوصیت یہ حاصل ہے کہ یہ کوفہ کے سب سے پہلے امام فن ہیں جس میں انہوں نے تصنیف کی علامہ بغدادی، علامہ سمعانی، اور حافظ ابن حجر تینوں لکھتے ہیں ''**وهو اول من صنف الكتب بالكوفة**'' ان کا اندازِ تصنیف

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۵ و ۱۱۶۔ (۲) ایضاً ص ۱۱۷۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۶۔

(۴) ایضاً۔ (۵) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۸۔

اتنا مقبول ہوا کہ ان کے بعد بعض اور اماموں نے تصنیف کی طرف توجہ کی تو انہیں ان کے ہی نقش قدم پر چلنا پڑا۔ چنانچہ حضرت وکیعؒ نے اپنی کتابوں میں حضرت یحییٰؒ کی کتابوں کی ہی پیروی کی۔"(۱)

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کا شمار کوفہ کے فقہاء محدثین میں ہوتا تھا۔ (۲) ایک مرتبہ حضرت عجلیؒ کے سامنے یحییٰ بن ابی زائدہؒ کا ذکر آ گیا تو انہوں نے فرمایا "حضرت یحییٰ کے والد زکریا بن ابی زائدہؒ ثقہ تھے۔ ان کے فرزند یحییٰ بھی ثقہ ہیں اور یہ دونوں باپ بیٹے ان اکابرِ امت میں سے ہیں جو حدیث اور فقہ دونوں کے جامع تھے۔"(۳) حسن بن ثابتؒ ایک مرتبہ حضرت یحییٰؒ سے ملاقات کرنے کے بعد واپس لوٹے تو انہوں نے بیان کیا کہ میں کوفہ کے سب سے بڑے فقیہ (یحییٰ بن ابی زائدہؒ) کے پاس مہمان تھا۔"(۴)

افتاء:

فقہی کمال کے ساتھ وہ صاحب افتاء بھی تھے۔ (۵) ابن عماد الحنبلیؒ انہیں امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں شمار کرتے ہیں۔ (۶)

عہدۂ قضاء اور وفات:

کمال تفقہ اور تثبت فی العلم کی وجہ سے ان کو وفات سے چار ماہ پیشتر مدائن کی قضا کا عہدہ پیش کیا گیا جس کو انہوں نے منظور کرلیا۔ یہ زمانہ ہارون کی حکومت کا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور اسی عہدۂ قضا پر مامور ہونے کی حالت میں بماہ جمادی الاولیٰ ۱۸۳ھ مدائن میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ (۷)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۱۰۹۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۴ص ۱۱۶۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۱۱ص ۲۰۸۔ (۵) تاریخ بغدادی ج ۱۴ص ۱۱۶۔

(۶) شذرات الذہب ج ۱ص ۲۹۸۔ (۷) ایضاً۔

یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ابوزکریا کنیت، یحییٰ نام، والد کا نام معین تھا۔ قبیلۂ مرۃ عطفان کے غلام تھے ابن ابی خثیمہ کا بیان ہے کہ ''میں نے یحییٰ سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ میں جنید بن عبدالرحمٰن مری کا آزاد کردہ غلام ہوں۔''

ولادت وسکونت:

بغداد سے ۳۶ میل کی مسافت پر ایک گاؤں ہے جس کا نام نقیا ہے یحییٰ بن معین وہاں کے رہنے والے تھے۔ ابوجعفر کے عہد حکومت میں ۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم:

حضرت یحییٰؒ کے والد معین رے کا خراج وصول کرنے پر مامور تھے۔ اس میں انہوں نے بہت دولت کمائی تھی۔ جب انتقال ہونے لگا تو ان کے پاس دس لاکھ پچاس ہزار درہم نقد جمع تھے۔ ان کی وفات پر حضرت یحییٰؒ نے اس تمام سرمایہ کو علمِ حدیث کی تعلیم پر صرف کر دیا یہاں تک کہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں ''لم یبق له نعل یلبسه''، ''ترجمہ: ان کے پاس پہننے کے لئے ایک جوتا بھی نہیں بچا۔'' (۱)

علم وفضل:

علم کے لئے ان کے اس ایثار وفداکاری کا نتیجہ یہ ہوا کے وہ وقت کے سب سے بڑے محدث وعلامہ بن گئے خطیب بغدادی لکھتے ہیں ''وہ بڑے ربانی امام، عالم حافظ ثبت فی الحدیث اور پختہ علم والے تھے۔'' (۲)

حافظ ذہبی انہیں ''الفرد سید الحفاظ'' لکھتے ہیں۔ امام نسائیؒ کہا کرتے تھے ''ابوزکریا معتمد ہیں، مامون ہیں اور ائمۂ حدیث میں سے ہیں'' ابن مدینی کا بیان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۷۷، ۱۷۸۔ (۲) ایضاً ص ۱۷۷۔

کے زمانہ سے اب تک مجھ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے یحییٰ بن معینؒ کی برابر حدیثیں لکھی ہوں۔ ابن مدینی کہتے ہیں ''لوگوں کا علم یحییٰ بن معین پر ختم ہوگیا'' یحییٰ القطانؒ کہتے ہیں: ''ہمارے پاس ان دو شخصوں جیسا کوئی نہیں آیا۔ ایک احمد بن حنبلؒ، اور دوسرے یحییٰ بن معینؒ۔'' امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے ''یحییٰ بن معینؒ ہم سب سے زیادہ عالم ہیں (۱)۔'' امام نووی فرماتے ہیں ''سب لوگوں کا ان کی امامت، توثیق، حفظ جلالتِ شان، اور علم میں تقدم وانہماک پر اتفاق ہے۔'' (۲)

علمِ حدیث:

یوں تو انہوں نے اس زمانہ کے مروجہ اسلامی علوم سب کچھ ہی پڑھے ہوں گے لیکن ان کو حدیث سے اتنا شغف تھا اور خاص اس علم میں انہوں نے وہ کمال پیدا کیا کہ ان کی شخصیت خود فن کے لئے سرمایۂ ناز وافتخار بن گئی اور دوسرے فنون کا علم ان کے علم حدیث کے بالمقابل بے آب وتاب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب سیر ان کی امامت فی الحدیث کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تفسیر دانی یا تفقہ کا کہیں ذکر تک نہیں کرتے۔

شیوخ:

حضرت یحییٰ بن معینؒ کو حدیث کا فطری ذوق تھا۔ انہوں نے بیشمار شیوخ سے احادیث کا سماع کیا جن میں سے چند مشہور نام یہ ہیں:

عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، وکیع۔ ابن ابی عدوی، القطان، ابن مہدی، عبدلصمد بن عبدالوارث وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حدیث کی کتابت:

یحییٰ بن معین نے صرف سماع پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو کچھ سنتے تھے اسے لکھ بھی لیتے تھے۔ چنانچہ علی بن المدینیؒ کا بیان ہے کہ ''یحییٰ بن معینؒ نے حدیث کی جتنی کتابت کی ہے مجھ کو نہیں معلوم کہ کسی اور نے بھی اتنی کتابت کی ہو۔'' احمد بن عقبہؒ کہتے ہیں: ''ایک مرتبہ میں نے یحییٰ بن معینؒ سے پوچھا'' آپ نے کتنی احادیث قلمبند کی ہیں'' فرمایا ''میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں'' اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد احمد بن عقبہ کہتے ہیں ''میرا گمان ہے کہ محدثین کرام

---

(۱) یہ سب معلومات تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶ سے ماخوذ ہیں۔ (۲) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۷۔

نے ان چھ لاکھ احادیث کے علاوہ جن کو یحییٰ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا چھ چھ لاکھ احادیث خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر حضرت یحییٰ کو دی ہیں۔"(۱) **محمد بن نصر طبری** کا بیان ہے کہ "ایک مرتبہ میں حضرت یحییٰ بن معینؒ کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہاں دفتروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ حضرت یحییٰ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے "جو حدیث ان دفاتر میں نہ ملے وہ کاذب ہے۔" ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے ان کی کتابوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ تیس الماریاں (قمطر) اور بیس صندوق کتابوں سے پُر ہیں۔"(۲) پھر لکھتے وقت احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک روایت کو پچاس پچاس مرتبہ لکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ "اگر ہم کسی حدیث کو اتنی مرتبہ نہ لکھیں تو ہم اسے پہچان ہی نہیں سکتے۔"(۳)

تنقیدِ احادیث:

علمِ حدیث میں حضرت یحییٰ بن معینؒ کو سب سے زیادہ کمال تنقید روایات میں تھا اس میں ان کو ایسا ملکہ تھا کہ روایات کے انبار میں جو روایت نادرست ہوتی تھی اسے فوراً پہچان جاتے اور اس کی غلطی پر تنبیہ کر دیتے تھے۔ ابوسعید الحداد کا بیان ہے کہ "ہم کسی محدث کے پاس جا کر اس کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تو معلوم یہ ہوتا کہ ہر لکھی ہوئی حدیث درست اور صحیح ہے۔ اتنے میں ابوزکریا یحییٰ بن معینؒ تشریف لے آتے تو سب سے پہلے چیز جو ان کے ہاتھ لگتی وہ خطا ہوتی تھی اور وہ خطا اس قدر باریک ہوتی تھی کہ حضرت یحییٰ بن معینؒ کے بتائے بغیر ہم میں سے کوئی اس کا پتہ لگا نہیں سکتا تھا' ایک مجلس میں علی بن مدینی اور امام احمد تشریف فرما تھے، امام یحییٰ بن معینؒ بھی تشریف رکھتے تھے۔ حدیث پر مذاکرہ ہو رہا تھا، کسی شخص نے کہا "اے یحییٰ بن معین! آج ہم آپ کو بہترین احادیث سناتے ہیں" بولے "ہاں سناؤ" ان کی یہ خواہش دیکھ کر لوگوں نے حدیثیں سنانی شروع کیں۔ ان حدیثوں میں جہاں جہاں غلطی تھی یحییٰ بن معینؒ اس پر تنبیہ کرتے رہے۔ پھر ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت ابن معین کی تنقید بالکل درست تھی۔"(۴)

تنقید حدیث کے فن میں حضرت ابن معینؒ کی مہارت اس زمانہ کے بڑے بڑے ائمہ فن کے نزدیک مسلم تھی۔ ابن الرومی کا بیان ہے کہ "ایک مرتبہ میں امام احمد بن حنبل کے پاس بیٹھا

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۲۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۲۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۔ (۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۷۹۔

ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا ''اے ابوعبداللہ! ذرا ان احادیث کو دیکھئے ان میں کچھ خطا معلوم ہوتی ہے'' آپ نے فرمایا ''تم ابوزکریا (یحیٰ بن معینؒ) کے پاس جاؤ وہ خطا کو پہچانتے ہیں۔''(۱)

امام احمد بن حنبلؒ اور ایک محدث عبدالخالق دونوں مغازی کی احادیث سننے کے لئے یعقوب بن ابراہیمؒ کے پاس جاتے تھے اس زمانہ میں حضرت یحیٰ بن معینؒ بصرہ میں قیام پذیر تھے۔ ایک دن امام احمدؒ نے فرمایا ''اے کاش ابوزکریا یہاں ہوتے'' عبدالخالق نے کہا ''اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو آپ کیا کرتے؟ بولے ''وہ خطا کو پہچانتے ہیں'' امام احمد بن حنبلؒ حضرت یحیٰ بن معینؒ سے سماعِ حدیث کے اس درجہ مشتاق تھے کہ آپ فرماتے تھے ''السماع یحییٰ بن معین شفاء للصدور'' ترجمہ: یحیٰ بن معین سے احادیث کا سننا سینوں کے لئے پیغام شفاء ہے۔ ایک دفعہ امام احمد بن حنبلؒ نے خواہش ظاہر کی کہ یحیٰ بن معین یہاں آ جائیں۔ ایک شخص نے کہا ''اگر وہ یہاں آ بھی جائیں گے تو کیا کریں گے؟ وہی سنی سنائی احادیث پھر سنائیں گے۔'' امام احمدؒ نے فرمایا ''چپ رہو! وہ حدیث میں جہاں کہیں خطا ہوتی ہے اسے فوراً پہچان جاتے ہیں۔''(۲)

علی بن المدینی کا بیان ہے کہ ''چالیس سال تک میرا یہ معمول رہا کہ میں جب کبھی بغداد آتا تھا تو امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیث پر مذاکرہ کرتا تھا اس مذاکرہ میں اگر کسی چیز میں میرا اور امام احمد بن حنبلؒ کا اختلاف ہو جاتا تو ہم حضرت یحیٰ بن معینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے رجوع کرتے تھے، وہ فوراً حدیث اس کے اصل مخرج سے نکال دیتے تھے، اس میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔(۳)

عمرو الناقد کہتے ہیں ''ہمارے اصحاب میں یحیٰ بن معینؒ سے زیادہ کوئی علمِ اسناد کا ماہر نہیں تھا'' صالح بن محمدؒ کہتے ہیں ''جن لوگوں کو میں نے پایا ہے ان میں ''علل حدیث کے سب سے بڑے عالم، ابن مدینی، اور فقہ حدیث میں سب سے زیادہ کمال رکھنے والے امام احمد بن حنبلؒ اور مذاکرہ کے وقت سب سے بڑے حافظ ابوبکر بن ابی شیبہؒ تھے'' لیکن احادیث میں مشائخ نے جو تصحیفات(۴) کی ہیں ان کے سب سے بڑے عالم یحیٰ بن معینؒ تھے۔(۵) ایک دوسری روایت میں علی بن المدینی کے الفاظ یہ ہیں ''یحییٰ اعلم بالرجال والکنی'' ابوداؤد سے کسی نے دریافت کیا ''اسماء الرجال کا بڑا عالم کون ہے علی بن المدینی یا یحیٰ؟'' بولے ''یحیٰ عالم بالرجال ہیں، اور علی کو اہل شام کی کوئی خبر نہیں ہے۔''(۶)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۷۹۔ (۲) ایضاً ص ۱۷۹ و ۱۸۰۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳۔
(۴) بمعنی تغیرات۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳۔ (۳) ایضاً۔

احتیاط وورع:

تنقید رواۃ اوران کی جرح وتعدیل کا کام جس قدر مشکل ہے اس سے زیادہ بہت بڑی اخلاقی جرأت کا طلبگار ہے۔ بسا اوقات جرح وتعدیل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بعض ایسے ایسے مشائخ علم وطریقت کو ساقط کردینا پڑتا ہے جو عوام کی نظروں میں نہایت وقیع اور محترم ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ کسی راوی پر تنقید کرتے وقت ذاتی خصومت ومخالفت کو مطلقاً اثر انداز نہ ہونے دینا چاہئے۔ حضرت یحیٰ بن معینؒ اس باب میں بڑے محتاط واقع ہوئے تھے چنانچہ ہارون بن بشیر الرازی کا بیان ہے کہ ''میں نے یحیٰ بن معینؒ کو دیکھا قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے۔ یہ دعا مانگ رہے تھے ''اے خدا اگر میں نے کسی ایسے شخص میں کلام کیا ہو جو درحقیقت میرے نزدیک کاذب نہ ہو تو تو میری مغفرت نہ فرما'' اسی احتیاط کی وجہ سے وہ ایک ایک حدیث کو تیس تیس مرتبہ لکھتے تھے۔''(۱)

حضرت یحیٰ بن معین کا علمِ روایات اس درجہ پختہ اور یقینی تھا کہ ان کے سامنے جو روایت آتی تھی۔ اس پر فوراً حکم لگادیتے تھے وہ کسی حدیث کے متعلق نہ تو استفہام کرتے تھے اور نہ اس میں انہیں کوئی تردد پیش آتا تھا۔ (۲)

جلالتِ علم:

حضرت یحیٰ بن معینؒ کی جلالتِ علم کے سامنے بڑے بڑے ائمہ فن کو پسینہ آجاتا تھا ہارون بن معروفؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شام کے ایک شیخ ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث کی املاء کی درخواست کی انہوں نے اس کو منظور فرمالیا اور اپنی کتاب اٹھا کر اس کی املا کرانے لگے۔ اتنے میں دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی معلوم ہوا کہ امام احمد بن حنبلؒ تشریف لائے ہیں شیخ نے امام کو آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ آپ اندر تشریف لے آئے لیکن میں نے دیکھا کہ امام احمد بن حنبلؒ کے آجانے سے شیخ کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا، وہ اسی طرح کتاب ہاتھ میں لئے املاء لکھاتے رہے۔ امام احمدؒ کے بعد احمد الدورقی، عبداللہ بن الرومی، ابوخیثمہ زہیر بن حرب اسی طرح علی الترتیب آکر اجازت

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۷۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳۔

حاصل کر کے شریکِ درس ہوتے رہے۔ لیکن شیخ کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا وہ بدستور کتاب ہاتھ میں لئے املا لکھاتے رہے۔ جب یہ سب حضرات آ چکے تو پھر کنڈی کھٹکھائی گئی۔ اس مرتبہ معلوم ہوا کہ یحییٰ بن معین تشریف لائے ہیں۔ شیخ نے حضرت ابن معینؒ کو دیکھا ہی تھا کہ ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور کتاب نیچے گر پڑی۔'' (۱)

ان کی علمی وجاہت وجلالت کا یہ عالم تھا کہ جس کسی محدث کے پاس سماع حدیث کے لئے چلے جاتے یا اس کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آتے تو وہ اس پر بے حد مفتخر ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبدالوہاب بن عطاء بغداد آئے ہوئے تھے کہ حضرت یحییٰ بن معینؒ ان کے پاس تشریف لائے حضرت ابن معینؒ کے آنے سے ابن عطاء کو جو فخر آمیز مسرت ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے متعلقین کے نام بصرہ خط لکھا تو اس میں یہ بھی تحریر کیا ''میں بغداد آیا، یہاں یحییٰ بن معینؒ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ کو بوسہ دیا۔ والحمدللہ رب العلمین۔ (۲)

حضرت یحییٰ کے عہد کے بڑے بڑے علماء کسی مسئلہ میں کوئی قطعی فیصلہ اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ انہیں اس مسئلہ کے متعلق حضرت ابن معینؒ کی رائے معلوم نہیں ہو جاتی تھی ابوسعید الحداد کہتے تھے:

''الناس کلھم عیالٌ علیٰ یحییٰ بن معین.''

''تمام لوگ یحییٰ بن معین کی طرف محتاج ہیں۔''

پھر کہا کہ ''دنیا میں ان کے برابر کوئی سچا آدمی نہیں ہے وہ اس باب میں سب سے سبقت لے گئے ہیں رہے وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے ان کی نسبت کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' (۳)

تمام معاصرین ان کے اظہارِ حق اور جرأت بیان کے معترف تھے اور اسی بنا پر ان کی جرح وتعدیل کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ابن الرومی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین کے علاوہ کوئی شخص نہیں دیکھا جو مشائخ کی شان میں امرِ حق کا اظہار کرتا ہو دوسرے لوگ تو محض لگی لپٹی باتیں کرتے ہیں۔'' (۴)

امام احمد بن حنبلؒ جیسا امامِ وقت محدث حضرت یحییٰ سے بے تکلف استفادہ کرتا تھا۔ اور ان کی ایک ایک بات کو اپنے لئے حرز جاں بنا کر رکھتا تھا۔ عباس الدوری کہتے ہیں ''میں نے

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۸۱۔ (۲) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۸۱۔

(۲) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۸۳۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ص ۱۸۳۔

روح بن عبادۃ کی مجلس میں امام احمد بن حنبل کو دیکھا کہ یحییٰ بن معینؒ سے سوالات کرتے جاتے تھے کہ اے ابوزکریا! یہ حدیث کیسی ہے اور یہ کیسی ہے؟'' یہ واضح رہنا چاہئے کہ امام احمد کا یہ سوال ان احادیث کی نسبت تھا جو عام طور سے لوگ سنتے رہتے ہیں، ان سوالات کے جواب میں حضرت یحییٰؒ جو کچھ فرماتے امام احمد اسے قلمبند کرتے جاتے تھے۔ امام احمد بسا اوقات حضرت یحییٰ بن معین کی نسبت فرماتے تھے:

''رجل خلقه الله لهٰذا الشان يظهر كذب الكاذبين.''(۱)

''وہ ایک ایسے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ جھوٹوں کا جھوٹ ظاہر کریں۔''

محمد بن رافع کہتے ہیں ''ایک مرتبہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے سنا، فرمارہے تھے جو حدیث یحییٰ بن معینؒ کے نزدیک معروف نہ ہو، سمجھ لو کہ وہ حدیث ثابت نہیں ہے''(۲) ابو حاتمؒ کہتے تھے ''تم اگر یحییٰ بن معینؒ کو دیکھو کہ امام احمدؒ سے محبت کرتے ہیں تو جان لو کہ امام صاحبِ سنت ہیں۔ امام احمدؒ کو دیکھو کہ وہ یحییٰ بن معین سے بغض رکھتے ہیں تو سمجھ لو کہ وہ کذاب ہیں۔''(۳)

قبولِ روایت میں احتیاط:

اس ذوقِ تنقید کے کمال کی وجہ سے وہ کسی روایت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ انہیں اس کی نسبت پوری تسلی اور تشفی نہیں ہو جاتی تھی۔ جس حدیث میں انہیں کہیں ذرا سا شک ہوتا اسے ترک کر دیتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ''جو شخص صحح فی الحدیث نہیں کرتا وہ کاذب ہے۔'' لوگوں نے پوچھا ''صحح فی الحدیث کس طرح ہوتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ جب اسے حدیث میں کوئی شک ہو تو ترک کر دے۔''(۴)

حدیث کی صحت معلوم کرنے میں محنت ومشقت:

حضرت یحییٰ بن معینؒ تنقیدِ روایات میں کس درجہ دیدہ ریزی اور محنت ومشقت سے کام لیتے تھے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ ''میں بعض اوقات حدیث بیان کر دیتا ہوں۔ لیکن پھر اس خوف سے جاگتا رہتا ہوں کہ کہیں میں نے اس میں غلطی نہ کر دی ہو۔''

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۳ ص ۱۵۷۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۶۔
(۳) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۶۔ (۴) ایضاً

ان کی اس جدوجہد، کمال اور ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دروغ بیان راویوں کے اختلاط کے باعث جو غلط روایتیں مسلمانوں میں پھیل گئی تھیں ان کی قلعی کھل گئی اور صحیح وغلط روایات میں خطِ امتیاز کھنچ گیا۔ چنانچہ یحییٰ بن معین خود فرماتے ہیں ''ہم کاذبوں کی روایتیں برابر لکھتے رہے، لیکن اب ہم نے ان سے تنور بھر دیئے ہیں اور اس سے پکی پکائی روٹیاں نکالی ہیں۔'' حضرت یحییٰ بن معینؒ کے پیکر صدق وصفا ہونے کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ ان سے بغض رکھنا جھوٹا ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ محمد بن ہارون نے کہا کہ ''اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ یحییٰ بن معینؒ کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے تو سمجھ لو وہ جھوٹا ہے اور احادیث وضع کرتا ہے اور حضرت ابن معینؒ سے اس لئے بغض رکھتا ہے کہ وہ جھوٹوں اور افترا پردازوں کی حقیقت کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔''

ادب:

لیکن اسماء الرجال کے اتنے بڑے عالم اور نقاد ہونے کے باوجود حضرت یحییٰؒ جس کسی راوی میں کوئی عیب پاتے تھے رسوائی کے خیال سے لوگوں میں اس کی تشہیر نہیں کرتے تھے بلکہ چپکے سے اسی کو اس کے عیب پر متنبہ کر دیتے تھے۔ تاکہ وہ اصلاح کرے۔ خود ان کا بیان ہے کہ ''عفان نے تقریباً بیس حدیثوں میں غلطی کی تھی لیکن میں نے ان پر کسی شخص کو مطلع نہیں کیا بلکہ صرف عفان کو ان پر تنبیہ کر دی'' ایک موقع پر انہوں نے فرمایا کہ میں نے کسی شخص میں جب کوئی غلطی پائی تو میں نے اس کا اخفا کیا اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح اس کا معاملہ درست ہو جائے۔ اگر وہ میری بات مان لیتا ہے تو خیر ورنہ پھر میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔''[1]

فقہ:

حدیث کی طرح انہیں فقہ میں بھی کمال حاصل تھا، بعض مسائل ایسے ہیں جن میں وہ منفرد تھے حافظ ابن حجر نے ان کو بیان کیا ہے۔''[2]

ورع وتقویٰ:

ان علمی کمالات کے ساتھ وہ عملی کمالات کے بھی گل سرسبد تھے۔ نہایت اتقا اور پاکیزگی وطہارت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ اشعار ان کے وردزبان رہتے تھے:

---

(۱) یہ سب معلومات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۴ سے ماخوذ ہیں۔ (۲) دیکھو تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۷۔

"المال يذهب حله وحرامه
طوعا وتبقى فى غدٍ اثامه
ليس التقى بمتق لا لٰهه
حتى يطيب شرابه وطعامه
ويطيب ماتحوى وتكسب كفه
ويكون فى حسن الحديث كلامه
نطق النبى لنابه عن ربه
فعلى النبى صلاته وسلامه"

ترجمہ: "مال حلال وحرام سب کچھ برضا ورغبت ختم ہو جاتا ہے اور کل کے لئے اس کے گناہ باقی رہ جاتے ہیں۔
پرہیز گار صرف وہ ہی شخص نہیں ہوتا جو خدا سے ڈرنے والا ہو، بلکہ پرہیز گاری کے لئے ضروری ہے کہ انسان کا کھانا پینا بھی طیب اور پاکیزہ ہو۔
اور جو چیز کہ اس کا ہاتھ جمع کرتا ہے اور کما رہا ہے وہ طیب ہو۔ اور اس کا کلام اچھی باتوں پر مشتمل ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اپنے رب کی طرف سے اس کے متعلق ہدایات دے دی ہیں، پس ان پر اللہ کا صلوٰۃ وسلام ہو۔"

تنقید حدیث کا ان میں ایسا صحیح ذوق پیدا ہو گیا تھا کہ بعض اوقات لوگ ان کے سامنے مختلط احادیث کا ایک مجموعہ پیش کرتے تو وہ فوراً بتادیتے کہ یہ حدیث اس طرح ہے اور یہ اس طرح۔ پھر دیکھا جاتا تو واقعی وہ احادیث اسی طرح ہوتی تھیں۔

بعض لوگ ان کی تنقید سے ناراض ہوتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم بن ہانی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوداؤد نے حضرت یحییٰ بن معین کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے تو ابراہیم بولے "تم یحییٰ بن معین کی شان میں ایسے الفاظ بولتے ہو؟" لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے وہی لوگ تھے جن کو حضرت یحییٰ بن معین کے ساتھ رشک وحسد کی وجہ سے کوئی ذاتی عناد تھا۔ ورنہ بڑے بڑے ائمۂ عصر ان کی جلالت علم وعمل، اور ان کی بےنفسی اور خلوص وللّٰہیت کے مدح خواں تھے۔
عجلی کہتے ہیں "اللہ نے کوئی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو ابن معینؒ سے زیادہ حدیث کو جاننے والا ہو۔"

یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، ابن مدینی اور دوسرے علماءِ اعلام عصر کے ساتھ مجالست کرتے تھے لیکن ان لوگوں کو ابن معین ہی احادیث انتخاب کر کے دیتے تھے کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ ان پر سبقت کرتا۔ ابن حبان نے اور وضاحت سے بتایا ہے ''ابن معین ثقات میں سے تھے۔ اور دین اور فضل کے مالک تھے۔ انہوں نے سنن کو جمع کرنے میں دنیا ترک کردی تھی انہی پر متوجہ رہتے تھے۔ اور ان حدیثوں کا یاد کرنا ہی ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ دین و ہدایت کے ایسے علم ہو گئے کہ اخبار و روایات کی نسبت ان کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اور آثار میں ان کو ہی امام تسلیم کیا جاتا ہے۔''(۱)

وفات:

ستر برس کی عمر ہونے میں ابھی دس دن کی کسر باقی تھی کہ پیک اجل آ پہنچا۔ ان کی وفات کے سلسلہ میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جو بہت کم پیش آتے ہیں اس لئے ہم ذرا کسی قدر تفصیل سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ عام طور پر مصنفین سیر کی رائے یہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن معین ۲۳۳ھ میں مکہ معظمہ سے حج کر کے واپس ہوتے ہوئے مدینہ آئے اور یہاں دو تین دن قیام کر کے روانہ ہو رہے تھے کہ رات کو خواب میں ایک ہاتف کو دیکھا جو کہہ رہا تھا ''اے ابوزکریا! کیا تم میرے پڑوس سے اعراض کرتے ہو؟'' صبح ہوئی تو ساتھیوں سے فرمایا ''تم سب جاؤ میں تو مدینہ ہی واپس لوٹ رہا ہوں، چنانچہ یہ سب رفقاء چلے گئے اور حضرت ابن معین تن تنہا مدینہ آ گئے یہاں دوبارہ آئے ہوئے ان کو تین دن ہی ہوئے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ علامہ بغدادی اس تمام واقعہ سے متفق ہیں۔ لیکن اس میں صرف اتنی ترمیم کرتے ہیں کہ حضرت یحییٰ کا حج کے وقت وفات پانا صحیح نہیں بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ وہ حج کے ارادہ سے روانہ ہونے کے لئے مدینہ منورہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ وفات ہوگئی۔

والی مدینہ کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ ''جس چارپائی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گئے تھے، حضرت یحییٰ کا جنازہ بھی اسی پر لے جایا جائے۔'' پھر جنازہ اٹھا تو اس شان سے کہ جنازہ کے آگے آگے ایک شخص ندا کرتا جاتا تھا'' یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ منسوب ہونے والی باتوں کو دور کرتا تھا۔

---

(۱) یہ حصہ تہذیب التہذیب ج۱۱ ص ۲۸۸ سے ماخوذ ہے۔

ابراہیم بن المنذر رالخرامی نے اعلان کیا ''جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو مامون عن الکذب کر دینے والے کے جنازہ میں شریک ہو اس کو یحییٰ بن معین کے جنازہ میں آنا چاہئے۔'' کون سنگدل ہوگا جو ان اعلانات کو سننے کے بعد بھی اس ''عاشق'' کے دھوم سے اٹھتے ہوئے جنازہ میں شرکت نہ چاہتا ہوگا چنانچہ جنازہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع ہو گیا۔ لوگ آپس میں کہتے جاتے تھے ''ہذا الذاب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکذب'' یہ وہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ کو دور کیا ہے۔ والی مدینہ نے نماز پڑھائی، جنت البقیع میں دفن ہوئے جس کی خاک کو بڑے بڑے جلیل المرتبہ صحابہ وصحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجسام کا امانت دار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

وفات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرنے کے لئے بلند مرتبت محدثین نے ان کے مرثیے لکھے ہیں جن میں سے ایک مرثیہ کے بعض اشعار یہ ہیں:

''ذهب العليم بعيب كل محدث
وبكل مختلف من الاسناد
وبكل وهم فى الحديث ومشكل
يعيٰى به علماء كل بلاد''

ترجمہ: ''اس محدث کا انتقال ہو گیا جو ہر محدث کے عیب سے اور اسانید کے اختلاف سے پوری طرح باخبر تھا۔ اور وہ ان تمام مشکلات و اوہام حدیث سے واقف تھا جن سے تمام جگہوں کے علماء عاجز آ گئے تھے۔''(۱)

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۶ و ۱۸۷۔

یزید بن ہارون السلمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱)

نام ونسب:

یزید نام، ابوخالد کنیت، دراصل بخاری کے رہنے والے تھے۔ قبیلۂ بنوسلم کے غلام تھے اس لئے سلمی کہلاتے تھے۔

ولادت:

۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔

علم وفضل:

علم حدیث میں کمال رکھتے تھے اس میں انہوں نے اپنے عہد کے کثیر علماء سے استفادہ کیا جن میں چند نام یہ ہیں:

یحییٰ بن سعید الانصاری، سلیمان التیمی، عاصم الاحول، عبداللہ بن عون، محمد بن عمرو دونوں حماد، شعبۃ ابن الحجاج، ان سے روایت کرنے والوں میں بڑے بڑے ائمہ کے اسماء گرامی شامل ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

امام احمد بن حنبل، علی بن المدینی، ابوخیثمہ، ابوبکر بن ابی شیبی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

قوتِ حافظہ:

ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ چنانچہ ''وہ خود فرماتے تھے مجھ کو چوبیس ہزار حدیثیں اسناد کے ساتھ یاد ہیں اور اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔'' علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے یزید بن ہارون سے زیادہ کوئی قوی الحافظ شخص نہیں دیکھا، ایک دوسری روایت میں ان کے الفاظ یہ ہیں ''**ما رأیت احدًا احفظ عن الصغار والکبار من یزیدبن ہارون**'' یحییٰ بن یحییٰ فرماتے تھے عراق کے حفاظ حدیث چار ہیں۔ دوشیخ اور دوادھیڑ عمر کے۔ زیادہ سن رسیدہ (شیخ) تو ہشیم اور یزید بن زریع ہیں، اور ادھیڑ عمر کے (کہل) وکیع اور یزید بن ہارون ہیں لیکن آخر میں فرماتے ہیں ''**واحفظ الکہلین یزید بن ہارون**''

---

(۱) یزید ہارونؒ کے حالات اور کتابوں میں بھی ملتے ہیں لیکن نہایت مختصر ہیں۔ اس لئے میں ان کے یہ تمام حالات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴۔ از ص ۳۴۷ تا ص ۳۴۵ و تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۶۳، ۲۹۳ سے اخذ کئے ہیں۔

آخر عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی اس لئے وہ اپنی کتاب پڑھ نہیں سکتے تھے ان کی ایک لونڈی تھی جو تعلیم یافتہ تھی۔ انہیں جب کبھی کسی حدیث میں کچھ اشکال ہوتا تھا وہ مزید توثیق وتصدیق کے لئے اپنی جاریہ سے حدیث پڑھوا لیتے تھے۔ بعض لوگ اس پر طعن کرتے تھے، اور جاریہ سے پڑھوانے کو ان کے عدم تثبت کی دلیل قرار دیتے تھے لیکن علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں ''ایک سے زیادہ ائمہ حدیث نے حضرت یزید بن ہارونؒ کی غیر معمولی قوتِ حفظ کا اعتراف کیا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ انہیں اپنی حدیثیں خوب یاد تھیں، البتہ ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے کہ بڑھاپے میں زیادتی عمر، پھر نابینائی اور افراط ضعف کے باعث وہ خود اپنے حافظہ پر پورا اعتماد نہیں کرتے تھے، اور اس بناء پر انہیں کسی حدیث میں کوئی اشکال اور تردد ہوتا تھا تو اس کی توثیق وہ جاریہ سے کرا لیتے تھے۔ پس ان کا ایسا کرنا تو ان کے کمال احتیاط کی دلیل ہے نہ کہ ان کے ناقابل اعتبار و استناد ہونے کی۔ (۱)

اس حالت سے قبل خود ان کو اپنے حافظہ پر بڑا وثوق واعتماد تھا، ایک مرتبہ ان سے کسی نے کہا کہ ہارون آپ کے پاس اس لئے آ رہا ہے کہ وہ چند حدیثوں کے الفاظ میں ردوبدل کر کے آپ کے حافظہ کا امتحان لے۔ کہنے والے نے ابھی بات پوری نہ کی تھی کہ ہارون خود مکان میں داخل ہو گیا حضرت یزیدؒ نے اس کی آواز سن کر فرمایا۔ ''ہارون مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ تم میری قوت حفظ کا امتحان لینے کی غرض سے مجھ پر بعض مشتبہ احادیث پیش کرنا چاہتے ہو تو تم اپنی جیسی کوشش کر دیکھو۔ خدا مجھ کو کھڑا نہ کرے اگر میں اپنی احادیث کو اچھی طرح یاد نہ رکھ سکوں۔'' ایک اور موقع پر انہوں نے فرمایا ''میں بیس ہزار احادیث یاد رکھتا ہوں جس کا جی چاہے ان میں کوئی ایک حرف کم وبیش کر کے دیکھ لے۔''

درسِ حدیث:

انہوں نے بغداد اور واسط میں حدیث کا مستقل درس دیا تھا جس میں بڑے بڑے علماء شریک ہو کر کسبِ سعادت کرتے تھے۔

---

(۱) حافظ ذہبی ایسا نقادِ فن بھی لوگوں کے اس طعن کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے ''ما بهذا من باس فيزيد حجة حافظ بلا مثنوية'' اس میں کوئی حرج نہیں ہے ہاں یزید حجت اور حافظِ حدیث ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں۔

فقہ:

فقہ میں ان کو بڑی دستگاہ تھی۔ ابوعبداللہ سے کسی نے پوچھا ''کیا یزید بن ہارونؒ فقیہ تھے؟'' انہوں نے فرمایا ''ہاں! ان کی ذہانت، فطانت، ذکاوت اور فہم کے کیا کہنے ہیں'' سائل نے کہا ''اچھا ابن علیہ سے متعلق کیا کہتے ہو'' بولے ''وہ فقیہ تو ضرور تھے لیکن مجھ کو ان کی نسبت علم نہیں ہے جتنا کہ یزید بن ہارون کی نسبت ہے۔

زہد و عبادت:

ان علمی کمالات کے ساتھ عبادت بھی حد سے زیادہ کرتے تھے۔ وہ نماز نہایت خشوع و خضوع سے ادا کرتے تھے۔ احمد بن سنان کا بیان ہے کہ میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا جو یزید بن ہارون سے زیادہ اچھے طریقہ پر نماز ادا کرتا ہو وہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی ستون ہے جو بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ہے، مغرب اور عشا اور ظہر اور عصر کے درمیان بھی نماز پڑھتے رہتے تھے۔ وہ اور ہشیم دونوں دن اور رات کی نماز کی درازی میں مشہور ہیں۔ چاشت کے وقت سولہ رکعات پڑھتے تھے۔

انہیں اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو وہ خود فرماتے ہیں ''مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں کسی غلطی کے صادر ہو جانے کی وجہ سے میں ان خوارج کا مصداق نہ بن جاؤں جن کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ **"یقرئون القران لایجاوز حنا جرهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة."**

عاصم بن علی کا بیان ہے کہ میں اور یزید بن ہارون مدت تک ابن الربیع کے پاس رہے ہیں۔ اس اثناء میں میں نے تقریباً چالیس سال تک یزید بن ہارون کو دیکھا کہ وہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے اور تمام رات نماز میں کھڑے ہی کھڑے گزار دیتے تھے، ایک شخص نے حضرت یزیدؒ سے پوچھا ''آپ رات میں کتنی دیر سوتے ہیں؟'' بولے ''اگر میں رات کے کسی حصہ میں سوتا ہوں تو خدا میری آنکھوں کو نیند سے محروم کر دے۔''

خوفِ خدا:

ان پر بحکم "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" خوفِ خدا کا بڑا غلبہ تھا۔ یہاں تک کہ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق خوفِ خدا میں رونے کے باعث ان کی دونوں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "ذھب بھما بکاء الاسحار"۔

علمی وقار و تمکنت:

باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے عہد میں خلق قرآن کا فتنہ اس زور و شور سے اٹھا تھا کہ اس نے قصرِ خلافت کو متزلزل کر دیا تھا۔ خود مامون الرشید جو معتزلہ کے زیر اثر تھا اور اکثر مسائل میں انہی کے مسلک کی تائید کرتا تھا خلقِ قرآن کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے اس عقیدہ کی تبلیغ و اشاعت کرے لیکن حضرت یزید بن ہارون کی علمی تمکنت و وقار کے سبب وہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ یحیٰی بن اکثم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مامون نے ہم سے کہا "لو لا مکان یزید بن ھارون لاظھرت القران مخلوق" اگر یزید بن ہارون کے وقار کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں قرآن کے مخلوق ہونے کا اظہار کر دیتا۔ اس پر کسی مصاحب نے پوچھا "اے امیر المومنین! یہ یزید بن ہارون کون ہیں جن سے اس قدر خوف کیا جاتا ہے؟" مامون نے کہا "میں ان سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی سلطنت ہے، یا وہ کسی جگہ کے بادشاہ ہیں، البتہ مجھ کو خوف یہ ہے کہ اگر میں نے اپنے عقیدہ کا اظہار کر دیا۔ اور انہوں نے میری تردید کی تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہو کر ایک فتنہ کھڑا ہو جائے گا، اور میں فتنہ سے ڈرتا ہوں۔ وہ شخص بولا "اچھا! میں اس بات کی تحقیق کرتا ہوں۔ چنانچہ یہ شخص واسط آیا اور ایک مسجد میں جہاں حضرت یزید بن ہارون تشریف رکھتے تھے ان کی خدمت میں حاصر ہوا اور کہنے لگا "امیر المومنین آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں اس بات کا ارادہ کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا اظہار کر دوں۔ یزید بن ہارون بولے "تم امیر المومنین پر تہمت طرازی کرتے ہو، وہ لوگوں کو کسی ایسی بات پر آمادہ نہیں کر سکتے جس کو وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو ذرا بیٹھو، یہاں تک کہ مجلس کا وقت ہو جائے۔ جب لوگ جمع ہو جائیں تو اس بات کا پھر اعادہ کرنا" چنانچہ دوسرے دن جب لوگ حضرت یزید بن ہارون کی مجلس میں اکٹھے ہوئے تو یہ شخص کھڑا ہوا اور اس نے حضرت

یزید کی طرف مخاطب ہوکر کہا ''ابو خالد! امیر المومنین آپ کو سلام کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں'' یزید بن ہارون بولے ''تم امیر المومنین پر تہمت باندھتے ہو وہ کسی ایسی بات پر لوگوں کو آمادہ نہیں کر سکتے جس کو لوگ بالکل نہ جانتے ہوں اور جس کا قائل کوئی ایک شخص بھی نہ ہوا ہو'' اس گفتگو کے بعد اس شخص نے مامون کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا ''امیر المومنین! آپ جو کچھ فرماتے تھے بالکل بجا اور درست تھا۔ اس معاملہ میں بے شبہ آپ اعلم تھے۔

یزید بن ہارون کو معلوم تھا کہ مامون رشید کا رجحان خلق قرآن کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود ان کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ بے خوف ہوکر اعلان کرتے تھے ''قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے۔''

اپنی تعریف سننے سے نفرت:

انہیں اپنی تعریف سننے سے طبعاً نفرت تھی علی بن الجندی الحرانی اس عہد میں ایک پرگو شاعر تھا، اس کو حضرت یزید سے قلبی عقیدت وارادت تھی۔ ایک مرتبہ اس نے حاضر ہوکر آپ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ پڑھا جس میں تشبیب کے بعد وہ کہتا ہے:

''الی یزید بن هارون الذی کملت
فیه الفضائل اواشفی علی ختن
حتیٰ اتیت امام الناس کلهم
فی العلم والفقة والاثار والسنن
والدین والزهد والاسلام قدعلموا
والخوف لله فی الاسرار والعلن
برا، تقیا نقیا، خاشعا، ورعا
مبرأ من ذوی الأفات والابن
مازال مذکان طفلاً فی شبیبة
حتی علاه مشیب الراس والذقن
مبارکا هادیا، للناس محتسبا
علی الانام بلامن ولاثمن

اذا بداخلت بدرًا عند طلعته
نورًا حياه به الرحمن ذوالمنن
يظل منعفرًا لله مبتهلاً
يدعو الاله بقلب دائم الحزن"

ان اشعار کے بعد شاعر نے حضرت یزید بن ہارونؒ کے شیوخ کے اسماء گرامی نظم کئے ہیں جن کے اخیر میں طلباء علوم کو خطاب کر کے کہا ہے:

"یا طالب العلمِ، لاتعدل به احدًا
قد کنت فی غفلة عنه وفی دون
بقية الناس من هذا يعادله؟
فی سالف الدهرا وفی غابر الزمن
يلقى اليه رفاق الناس عابدة
على المحامل والاقتاب والسفن
من الجزيرة ارسالاً متابعة
ومن خراسان، اهل الريف والمدن
ومن حجاز هناك العير قاصدة
ومن عراق، ومن شام ومن يمن
ياتون عنه غزير العلم محتسبًا
ترى الحديث لديه غير محتنرن
يزيد اصبحت فوق الناس كلهم
شيئًا خصَصتُ به ياواسع العطن
ساويت شعبة والثورى قد علموا
وابن المبارك لم يصيح على عين"

شاعر نے یہ قصیدہ نہایت دلسوزی اور محبت سے لکھا تھا، اس کو گوشِ التفات سے نہ سننا کج خلقی پر محمول کیا جاتا۔ اسی لئے حضرت یزید بن ہارونؒ نے نہایت توجہ سے یہ قصیدہ سنا لیکن انکسارِ نفس کا یہ عالم تھا کہ شاعر وہ اشعار جن میں آپ کی مدح کی گئی تھی پڑھتا تھا تو آپ اس کو ان اشعار کے پڑھنے سے روک دیتے تھے اور اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹنے لگتے تھے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

اعمال میں سب سے زیادہ مشکل کام امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ہے لیکن یزید بن ہارونؒ اس میدان دشوار گزار کے بھی باہمت شہسوار تھے۔ چنانچہ مامون کا جو واقعہ اوپر گزرا ہے اس سے اس کی پُر زور تائید ہوتی ہے، محمد بن احمد اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ یزید بن ہارون ان بزرگوں میں سے تھے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔

مرجع خلائق:

حضرت یزید بن ہارون اپنے علمی وعملی کمالات کے باعث عوام وخواص کے مرجع تھے۔ بعض اوقات تو ان کے پاس مسائل دریافت کرنے والوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ابوبکر یحییٰ بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم یزید بن ہارونؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، لوگ ان پر جھکے ہوئے ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ لیکن وہ خود خاموش تھے۔ اور کسی کو کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ جب سب خاموش ہو گئے تو آپ نے فرمایا ''ہم واسط کے رہنے والے ہیں (واسط کے لوگ تغافل میں ضرب المثل ہیں)۔

خضاب:

بڑھاپے میں اکثر مائل بہ سرخ خضاب کا استعمال کرتے تھے۔

وفات:

۲۰۶ھ میں اس پیکر علم وعمل نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔

لیث بن سعد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

لیث نام، ابوالحرث کنیت، اصل میں اصفہان کے رہنے والے تھے، قیس بن رفاعہ کے غلام ہونے کی وجہ سے جو قبیلہ فہم سے تعلق رکھتا تھا فہمی کہلاتے ہیں۔

ولادت:

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے حسن المحاضرہ میں لیث بن سعد کی تاریخ پیدائش ۰۶۴ھ لکھی ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''میرے نزدیک یقینی یہ ہے کہ وہ ۰۹۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ [۱] فرقشندہ کا گاؤں ان کی جائے پیدائش ہے۔ [۲]

طلب علم:

حضرت لیث بن سعدؒ غلام تھے لیکن تحصیلِ علم کا قدرتی شوق رکھتے تھے، انہوں نے امام زہری کا زمانہ پایا تھا۔ ان کے فیضانِ درس سے مکہ کا کوچہ کوچہ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلنواز صداؤں سے گونج رہا تھا۔ لیثؒ نے بھی ادھر کا رخ کیا اور حضرت زہریؒ کے فیوض سے سیراب ہوئے وہ خود فرماتے ہیں ''میں نے ابن شہاب الزہری کے علم کا بہت بڑا حصہ لکھا ہے۔ اور میں برید (ڈاک) پر سوار ہو کر ان سے ملنے کے لئے رصافہ جایا کرتا تھا۔ پھر مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرا یہ فعل خدا کے لئے نہ ہو۔ تو میں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ [۳]

شیوخ:

امام زہری کے علاوہ حضرت لیث نے جن اساطینِ علم ودرایت سے استفادہ کیا ان کی فہرست بہت طویل ہے ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ عطا بن ابی رباح، عبداللہ بن ابی ملیکہ، نافع مولی ابن عمر، یحییٰ انصاری، ابوالزبیر۔ ان بزرگوں کے التفات خاص نے انہیں علم وعمل کا ایک ایسا پیکرِ لطیف بنا دیا کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ اور امام ہو گئے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۸۵۔ (۳) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸

''علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت لیث بن سعد فقہ اور حدیث میں بہت بلند مرتبہ اور امامت کا درجۂ عالی رکھتے تھے اور اپنے زمانہ میں وہ اہل مصر کے امام تھے۔''(۱)

شرجیل بن جمیل کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں یزید بن ابی حبیب ایک بلند پایہ محدث و مفسر اور ان کے ساتھی مصر میں مقیم تھے، حضرت لیث کی جوانی کا عہد تھا لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس نوعمری کے باوجود یزید بن ابی حبیب اور مصر کے دوسرے معمر علما ولیث کا بڑا احترام کرتے، ان کو مجلسوں میں مقدم رکھتے۔ اور ان کے علم وفضل اور ورع کا اقرار کرتے تھے۔

حدیث:

حضرت لیثؒ کو قریب قریب تمام علوم مرجہ سے طبعی مناسبت تھی۔ اور وہ ان کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے زیادہ محبوب فن حدیث تھا علامہ ابن سعد تحریر کرتے ہیں ''لیث بن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث تھے اور ان کی احادیث صحیح بھی ہوتی تھیں۔'' امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ہے کہ وہ ان کو ''کثیر العلم صحیح الحدیث'' کہا کرتے تھے۔ مشہور نقادِ حدیث حضرت یحیٰ بن معین ان کو ثقہ سمجھتے تھے۔ عثمان الدارمی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابن معین سے پوچھا آپ کو لیث زیادہ پسند ہیں یا یحیٰ بن ایوب؟ بولے لیث زیادہ پسند ہیں اور یحیٰ ثقہ ہیں۔ ابن المدینی کہتے ہیں ''ثقة ثبتٌ''(۲)

ابن بکیر کا بیان ہے ''میں نے بڑے بڑے علماء کو دیکھا ہے لیکن لیث جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا'' اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے لیث سے زیادہ کامل کوئی نہیں دیکھا۔ انہوں نے حجاز وعراق کے سفر اور وہاں کے طویل قیام میں احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا کہ ایک دفعہ ان سے کسی نے کہا ''آپ بعض مرتبہ ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں نہیں ہیں'' فرمایا ''کیا وہ ہر چیز جو میرے سینہ میں محفوظ ہے، کتابوں میں بھی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اس قدر بڑا دفتر ہو جاتا کہ یہ سواری اس کو نہیں اٹھا سکتی تھی۔ (۳)

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۷۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۱، ۴۶۲۔ (۳) ایضاً ص ۴۶۳۔

فقہ:

حدیث کی طرح فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ابن وہب کہتے ہیں ''قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ہم نے لیث سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔[۱] علامہ نووی فرماتے ہیں ''حضرت لیثؒ کی مہارت فقہ پر علماء کا اجماع ہے۔امام شافعی سے منقول ہے کہ وہ حضرت لیث کو امام مالک سے بڑا فقیہ مانتے تھے، لیکن فرماتے تھے کہ ان کے اصحاب نے انہیں ضائع کر دیا اور یہ بھی فرماتے تھے کہ لیث امام مالک سے زیادہ آثار کا اتباع کرنے والے ہیں[۲] امام احمد کا بیان ہے کہ لیث فقیہ البدن تھے''[۳] امام شافعی کا بیان ہے ''مجھ کو کسی سے جدا ہونے کا اتنا ملال نہیں ہوا جتنا کہ حضرت لیث بن سعد کی جدائی کا ہے ابن وہب نے لوگوں اور احادیث کے اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد کہا ''اگر لیث اور امام مالک سے میری ملاقات نہ ہوتی تو میں گمراہ ہو جاتا۔[۴]

فتویٰ:

اس کمال تفقہ کے باعث اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے مفتی یہی تھے۔[۵]
ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید نے کسی بات سے متاثر ہو کر قسم کھالی کہ میرے لئے دو جنتیں ہیں۔ بعد میں اس کو خیال آیا کہ یہ قسم تو بڑی سخت ہے، میں کس طرح اس سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں اس نے ایک غلام بھیج کر حضرت لیث بن سعد کو بلایا، اس وقت ہارون کی بیوی زبیدہ بھی پردہ کے پیچھے موجود تھی حضرت لیث کو پورا واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے ہارون سے کہا ''تم تین مرتبہ اس بات کی قسم کھاؤ کہ میں خدا سے خوف کرتا ہوں'' ہارون کے تین مرتبہ قسم کھانے کے بعد حضرت لیث نے فرمایا ''جاؤ! اب تمہاری قسم درست ہوگئی۔'' کیونکہ قرآن مجید میں ہے ''**ولمن خاف مقام ربه جنتان**'' ترجمہ: ''جو لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے خوف کریں گے ان کے لئے دو جنتیں ہیں'' ہارون اس عجیب نکتہ سنجی سے بہت خوش ہوا اور کئی جاگیریں بطور انعام حضرت لیث کو عطا کیں۔[۶]

---

(۱) ابن خلکان ج ا ص ۴۳۸۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۰۸۔ (۳) ایضاً ص ۲۰۹۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۳۔ (۵) تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۷۴۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۰۸۔

جامعیت:

"اپنے علمی و عملی کمالات کی وجہ سے حضرت لیث محاسن وفضائل کا ایک گلدستۂ سدا بہار تھے۔" ابن بکیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے لیث سے زیادہ کامل کوئی نہیں دیکھا، وہ فقیہ البدن اور عربی اللسان تھے، قران مجید خوب پڑھتے تھے۔ نحو کے بڑے اچھے عالم تھے، اشعار بہت یاد تھے حدیث کے امام تھے اور مذاکرہ ومباحثہ کا بہت عمدہ سلیقہ رکھتے تھے راوی کا بیان ہے کہ بکیر حضرت لیث کے فضائل وکمالات کا شمار کرتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے دس کمالات شمار کرائے۔ (۱) مناظرہ میں کمال کا یہ عالم تھا کہ جس جلسہ میں کسی سے مناظرہ کرتے تھے اس پر پوری طرح چھا جاتے تھے۔"(۲)

علماء کا اعتراف:

تمام بڑے بڑے علماء ان کی عظمت و برتری کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ امام نوویؒ کا بیان ہے "واقوال العلماء فی فضله کثیرة مشهورة" لیث مدینہ میں قیام پذیر تھے کہ کسی بات پر یحییٰ بن سعید الانصاریؒ نے ان سے کہا "آپ ایسا نہ کیجئے کیونکہ آپ امام ہیں، لوگوں کی نظریں آپ کی طرف لگی رہتی ہیں۔ امام مالک بن انسؒ نے انہیں ایک خط لکھا تو اس میں وہ لکھتے ہیں، آپ اپنی امامت فضل اور منزلت اور مرجوعۂ خلائق ہونے کے اعتبار سے لوگوں کے نزدیک ایک مسلم شخصیت کے مالک ہیں۔ (۳) دراوردی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ لیث، یحییٰ بن سعید اور ربیعہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ حضرت لیثؒ کی جلالتِ شان کے باعث ان دونوں سے ٹھیک بات بھی نہیں ہوتی تھی اور یہ دونوں لیث کا بڑا احترام کرتے تھے۔ (۴)

خلفاء کی تعظیم:

علماء تو علماء خلفاء تک ان کی بارگاہِ عقیدت وارادت میں سر نیاز خم کرتے تھے۔ حضرت لیثؒ عراق میں تشریف لائے تو خلیفۂ مہدی نے اپنے وزیر سے جس کا نام یعقوب تھا، کہا "تم اس شیخ (لیثؒ) کی خدمت میں حاضر رہو میرے نزدیک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اب ان سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ (۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۲۔

(۳) ایضاً ص ۴۶۳۔ (۴) ایضاً ص ۴۶۲۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹

علامہ ابن خلکان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لیث مصر کے عہدۂ قضا پر مامور تھے [1] لیکن حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ابو جعفر منصور نے ان سے درخواست کی کہ آپ میری طرف سے مصر کے والی ہو جایئے تو انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "اے امیر المومنین میں موالی میں سے ہوں اس لئے اس بارِگراں کے اٹھانے سے عاجز ہوں۔ ابو جعفر بولا "آپ میں تو کوئی ضعف نہیں ہے۔ البتہ آپ کا ارادہ کمزور ہے۔ بہر حال حضرت لیثؒ نے نیابت خلافت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تاہم اگر چہ وہ صورتاً نائب نہیں تھے لیکن ان کا رعب وداب اور جلالت وشوکت کسی نائب سے کم نہیں تھی۔ مصر کا گورنر اور قاضی دونوں ان کے زیر فرمان رہتے تھے انہیں کسی کے متعلق اگر کوئی نارو ابات معلوم ہوتی تو وہ فوراً خلیفہ کو لکھ بھیجتے اور وہ معزول کر دیا جاتا تھا۔" [2] ابن عماد حنبلی، ابن الاہدل کا قول نقل کرتے ہیں کہ لیث بن سعدؒ نے اگر چہ ولایت مصر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن قضاءِ مصر کو قبول کر لیا تھا۔ [3] ہمارے نزدیک صحیح یہی ہے اس طرح دونوں مختلف اقوال میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔

سخاوت:

حضرت لیثؒ ان اکابرامت میں سے تھے جن کو خداوند تعالی نے اقلیم علم کی فرمانروائی کے ساتھ دولت وثروت کی افراط سے بھی نوازا تھا، چنانچہ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کی سالانہ آمدنی اسی ہزار دینار تھی۔ لیکن طبیعت اس درجہ مستغنی اور سیر چشم وفیاض تھی کہ علماء و فضلا اور ارباب حوائج پر سب خرچ کر دیتے تھے اور یہ رقم سال بھر تک اتنی بھی نہیں رہتی تھی کہ اس پر زکوۃ واجب ہو جاتی۔ [4]

علماء کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ابن لہیعہ کے مکان میں آگ لگ گئی تو حضرت لیثؒ نے ان کو ایک ہزار دینار مرحمت فرمائے۔ ایک دفعہ منصور بن عمار ان سے ملاقات کی غرض سے آئے، چلنے لگے تو حضرت لیثؒ نے ان کو ایک ہزار دینار نذر کئے [5] قتیبہ بن سعید کو سندس کی ایک قمیص دی تھی جو ان کے پاس بہت عرصہ تک رہی [6] کوئی شخص اگر ان سے کسی چیز کا سوال کرتا تو وہ اس سے تنگ دل ہونے کی بجائے بڑی فیاضی سے پورا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک

---

(۱) ابن خلکان ج اص ۴۳۸۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۰۸۔ (۳) شذرات الذہب ج اص ۲۸۵۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۰۸ وتہذیب التہذیب۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۰۸۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۴۔

عورت ایک پیالہ لے کر شہد مانگنے آئی تو آپ نے شہد کا برتن ہی اس کے حوالہ کر دیا۔ (۱) کھانا تنہا کبھی نہیں کھاتے تھے۔ عبداللہ بن صالح کا بیان ہے کہ میں حضرت لیثؒ کے ساتھ کامل بیس سال تک رہا ہوں اس مدت میں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ صبح کا یا شام کا کھانا انہوں نے بغیر ایک جماعت کے تنہا کھایا ہو۔ (۲)

امام مالکؒ سے ان کو خاص تعلق خاطر تھا۔ چنانچہ حضرت لیث انہیں سو دینار سالانہ مستقلاً دیتے تھے۔ اور اس کے علاوہ انہیں جب کبھی کوئی اہم ضرورت پیش آتی تھی تو اس میں بھی بڑی فراخ دلی سے ان کی امداد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام مالکؒ نے انہیں لکھا کہ میں اپنی بیٹی کی رخصتی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کچھ ''عصفر'' بھیج دیجئے۔ حضرت لیثؒ نے تعمیل ارشاد میں ''عصفر'' کی تیس گٹھڑیاں بھیج دیں۔ یہ عصفر اس درجہ وافر تھا کہ اس سے تمام کپڑے رنگ لینے کے بعد بقیہ کو فروخت کیا گیا تو پانچ سو دینار میں فروخت ہوا۔ (۳)

ایک دفعہ امام مالکؒ نے لکھا ''مجھ پر کچھ قرض ہوگیا ہے'' حضرت لیثؒ نے فوراً پانچ سو دینار خدمت اقدس میں پیش کر دیئے۔ (۴) امام مالک انہیں کبھی کوئی چیز بطور ہدیہ ارسال کرتے تھے تو وہ اس کے جواب میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور بھیج دیتے تھے۔ ایک مرتبہ امام نے انہیں مدینہ کے بعض نئی اور عمدہ چیزیں تحفۃً بھیجیں، آپ نے اس کے بدلہ میں ایک ہزار دینار بھیج دیئے۔ (۵)

تحدیث بالنعمۃ:

حضرت لیث جس طرح دوسروں پر خوب خرچ کرتے تھے، تحدیثاً بالنعمۃ خود اپنے اوپر بھی بہت خرچ کرتے تھے۔ لباس فاخر پہنتے تھے، اور بود و ماند میں پر تکلف طریقہ سے رہتے تھے۔ سلیمان بن حرب ایک مرتبہ حضرت شعبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ان کے گدھے، زین اور لگام اک اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اٹھارہ سے بیس درہم تک کی قیمت کی تھیں۔ اس پر محمد بن معاویہ نیشاپوری بولے کہ ایک دفعہ لیث ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے اس وقت ہم نے ان کے کپڑوں، سواری، انگوٹھی ان سب کی قیمت کا اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ چیزیں اٹھارہ ہزار سے بیس ہزار درہم تک کی ہیں۔ (۶)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۴۔ (۳) ایضاً۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸۔ (۵) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۷۴۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹۔

قتیبہ کا بیان ہے ہم اسکندریہ سے حضرت لیث کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے تو اس وقت ان کے ساتھ تین کشتیاں تھیں جن میں سے ایک کھانے پینے کے سامان سے پر تھی، ایک میں ان کے اہل وعیال تھے اور ایک کشتی میں ان کے مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ (۱)

وقار علم کے تحفظ کا خیال:

حضرت لیث اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ علماء کے لئے علم کے وقار کو محفوظ رکھنے کی خاطر ازبس ضروری ہے کہ وہ معاشی اعتبار سے ارباب ثروت و دولت کے دست نگر نہ ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ منصور بن عمار آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ نے انہیں ایک ہزار دینار عطا کئے اور ساتھ ہی فرمایا

صُن بھذہ الحکمۃ التی اتاک اللہ تعالیٰ (۲)

اللہ تعالیٰ نے تم کو جو حکمت عطا فرمائی ہے تم ان دنانیر کے ذریعہ اس کی حفاظت کرو۔

ان کے پاس جو طلباء حدیث دور دراز سے آتے تھے حضرت لیث کا معمول تھا کہ واپسی کے وقت اس درجہ سامان اور کھانا وغیرہ ان کے ساتھ کر دیتے تھے جو ان کے وطن تک پہنچنے کے لئے کافی ہو سکے۔ (۳)

دوست نوازی:

ان کے دوست احباب جو ان کے پاس جمع ہوتے تھے ان کو خوب کھلاتے پلاتے تھے وہ اپنے احباب کے لئے عموماً فالودہ تیار کراتے تھے، اور پھر دیناروں کی شرط لگا کر فرماتے تھے کہ جو شخص اپنے ساتھیوں سے زیادہ کھائے گا اس کو اتنے دینار ملیں گے (۴)۔ غرض یہ ہے کہ وہ اپنے علمی وعملی کمالات کے باعث نظیری کے اس شعر کے پورے مصداق تھے۔

زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۲۔ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸۔

(۳) کتاب الانساب ص ۴۳۴۔ (۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸۔

ابن حبان فرماتے ہیں ''وہ ثقہ ہیں، اور فقہ، زہد واتقاء، علم وفضل اور جود وسخا کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے سرداروں میں سے ہیں۔ ابن ابی مریم کا بیان ہے کہ ''میں نے اللہ کی مخلوق میں لیث سے افضل کوئی نہیں دیکھا کوئی خصلت جو تقرب الی اللہ کا سبب ہو، ایسی نہ تھی جو ان میں موجود نہ ہو'' ابو یعلی الخلیلی کہتے ہیں ''لیث بے خوف تردید اپنے وقت کے امام تھے[1] علامہ ابن سعد انہیں ''سریا من الرجال نبیلاً سخیا'' [2] لکھتے ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں ''وھو امام حجۃ کثیر التصانیف ومناقب اللیث عدیدۃ'' [3] علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

''امام اھل مصرفی الفقه الحدیث معاً فاق اھل زمانه بالسخاوۃ والبذل.''[4]

''وہ فقہ اور حدیث دونوں میں اہل مصر کے امام تھے اور سخاوت وبذل میں اہل زمانہ سے فائق۔''

وفات:

۱۵ شعبان المعظم ۱۷۵ھ جمعہ کی شب میں بمقام فسطاط انتقال کیا۔ اس وقت آپ کی عمر اکیاسی برس کی تھی۔ [5] جب لوگ دفن سے فارغ ہوگئے تو انہوں نے کسی کو یہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا۔

ذھب اللیث فلا لیث لکم
ومضی العلم قریبًا وقبر

ترجمہ:۔ لیث چلے گئے اب وہ تمہیں نہیں مل سکتے ان کے ساتھ علم بھی چلا گیا اور دفن ہوگیا لیکن ہر چند لوگوں نے تلاش کیا، پڑھنے والے کا پتہ نہیں چلا۔'' [6]

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۴۔ (۲) ایضاً ۴۶۱۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹۔

(۴) کتاب الانساب ص ۴۴۴۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹۔ (۶) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۹۔

عبداللہ بن وہب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبداللہ نام، ابومحمد کنیت۔ ریحانہ مولاۃ ابوعبدالرحمٰن یزید بن انیس الفہری کے غلام تھے۔ فہر بن مالک کی طرف ہی قریش کا انتساب ہوتا ہے، اس لئے انہیں قریشی بھی کہا جاتا ہے۔[۱]

۱۲۴ھ میں بماہ ذی القعدہ مصر میں پیدا ہوئے۔[۲]

تعلیم:

اپنے بیان کے مطابق انہوں نے سترہ برس کی عمر میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔[۳] انہوں نے تابعین کرام کی جماعت میں حضرت ہشام بن عروہ اور عبیداللہ بن عمر کو دیکھا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ ان سے استفادہ نہیں کر سکے ان میں سے اول الذکر کی نسبت خود ان کا بیان یہ ہے کہ میں نے ہشام بن عروہ کو مسجد میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر میں ان کے مکان پر حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں، اس وقت میں نے ان کو بیدار کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور حج کرنے چلا گیا، وہاں سے واپس لوٹا تو ان کی وفات حسرت آیات کی خبر سنی، رہ گئے حضرت عبیداللہ تو میں نے ان کو دیکھا ضرور ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ نابینا ہو گئے اور غالباً اسی بناء پر انہوں نے حدیث کی روایت ترک کر دی تھی۔[۴]

علم وفضل:

تاہم انہوں نے جن مشائخ وقت اور ائمۂ روزگار سے علم حاصل کیا ان کی باطنی توجہ اور خود ان کی محنت وشوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے ممتاز عالم ہو گئے۔ حافظ ذہبی انہیں ''الامام الحافظ'' اور ''احد الائمۃ الاعلام'' لکھتے ہیں۔ ابن خلکان لکھتے ہیں۔ ''کان احد ائمۃ عصرہ'' ابن عماد الحنبلی ان کو ''الامام الحبر'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔[۵]

---

(۱) کتاب الانساب للسمعانی ص ۴۳۴۔ (۲) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۹۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۳۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰۔ (۵) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۷۔

حضرت سفیان ابن عیینہؒ نے ایک مرتبہ انہیں دیکھا تو ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''یہ عبداللہ بن وہب ہیں جو مصر کے شیخ ہیں'' ابن عدی کا قول ہے ''ابن وہب جلیل المرتبہ اور ثقات ناس میں سے ہیں۔''(۱)

حدیث:

حدیث میں ان کو خاص درک اور کمال حاصل تھا ابوزرعہ کا بیان ہے کہ ''میں نے ابن وہب کی تیس ہزار حدیثوں کو خوب اچھی طرح سے جانچا، لیکن مجھ کو اس مجموعہ میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملی جس کی اصل نہ ہو۔ اور وہ ثقہ تھے۔'' امام نسائی فرماتے ہیں ابن وہب ثقہ ہیں، میں نہیں جانتا کہ انہوں نے کسی ثقہ سے کوئی منکر حدیث روایت کی ہو۔''(۲)

ابن وہبؒ نے جن محدثین سے حدیث کا فن حاصل کیا تھا۔ امام مالک کا نام ان میں سرفہرست ہے، لیکن شاگرد کے کمال کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امام مالک ایسا استاد انہیں خط میں ''مفتی اہل مصر'' لکھتا تھا۔ اور مختلف مسائل میں ان سے استفسار کرتا رہتا تھا۔ حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ صرف عبداللہ بن وہب کی خصوصیت تھی ورنہ امام مالک ان کے علاوہ کسی اور شخص کو اس طرح خطاب نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ ''وضو کرتے وقت پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنے کا کیا حکم ہے؟'' آپ نے فرمایا مجھے نہیں معلوم' عبداللہ بن وہب اس وقت موجود تھے، انہوں نے کہا اس بارے میں ہمارے پاس ایک روایت موجود ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے وہ پوری روایت مع اسناد کے پڑھ کر سنادی۔ امام مالک نے اس کو معتبر قرار دیا، چنانچہ اس دن کے بعد اگر کوئی ان سے یہ مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اسے انگلیوں میں خلال کرنے کا حکم کرتے اور عبداللہ بن وہب کی روایت کا حوالہ دے کر یہ بھی فرماتے تھے کہ ''میں نے اب تک اس کو کسی اور سے نہیں سنا ہے۔''(۳)

حضرت ابن وہب امام مالک کے علوم کے مخصوص حامل تھے۔ ہارون بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ''مدینہ کے لوگ امام مالک کی کسی روایت یا ان سے منقول کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تھے تو انہیں ابن وہب کے آنے کا انتظار رہتا تھا۔ جب وہ تشریف لے آتے تو سب جمع ہو کر ان سے رفع شکوک کرتے تھے۔'' (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ٦ ص ۷۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۸۱۔ (۳) ایضاً۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ٦ ص ۷۲۔

عبداللہ بن وہب کو حدیث میں جو مرتبۂ بلند حاصل تھا اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن القاسم الفقیہ کا بیان ہے کہ ''اگر سفیان بن عیینہ زندہ نہ ہوتے تو لوگ شد رحال کر کے حضرت ابن وہب کے ہی پاس جایا کرتے کسی شخص نے علم اتنا مدون نہیں کیا جتنا کہ انہوں نے کیا ہے۔'' (۱)

شیوخ:

انہوں نے امام مالک کے علاوہ جن بزرگوں سے روایت کی ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ یونس بن زید، ابن جریج، حنظلہ بن ابی سفیان، حیوٰۃ بن شریح، اسامہ بن زید اللیثی ابو صخر حمید بن زیاد، عمرو بن الحارث، سفیان، لیث بن سعید رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تلامذہ:

جنہوں نے ان کے دامانِ فیض سے خوشہ چینی کی، ان کی فہرست بڑی طویل ہے چند اکابر تلامذہ یہ ہیں۔ ابن مہدی، احمد بن صالح، سعید بن ابی مریم، ربیع بن سلیمان المرادی، یونس بن عبدالاعلیٰ۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ لیث بن سعد، ابن وہب کے شیخ ہیں لیکن وہ بھی ان سے روایت کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

فقہ:

ابن وہب، امام مالک کی صحبت میں بیس سال رہے تھے (۲) اس لئے حدیث کے ساتھ ان کو فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ ابن یونس کا بیان ہے کہ ''ابن وہب فقہ اور حدیث اور عبادات تینوں کے جامع تھے۔'' یحییٰ بن بکیر ان کو ابن القاسم سے بڑا فقیہ مانتے تھے۔ (۳)

ابو مصعب حضرت ابن وہب کی تعظیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ امام مالک کے جو مسائل ان کے ذریعہ منقول ہیں سب صحیح ہیں۔ حارث بن المسکین کا بیان ہے کہ ابن وہب فقہ، حدیث اور عبادات کے جامع تھے۔ ان کو علماء سے طبعاً بڑی محبت تھی اور امام مالک سے انہوں نے بڑا فیض اٹھایا تھا۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۸۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰ و ۲۸۱۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۲ و ۷۳۔

فتویٰ:

امام مالکؒ اگر چہ انہیں ''فقیہ مصر'' لکھتے ،اوران کے مفتی ہونے کی حیثیت کوتسلیم کرتے تھے لیکن خودابن وہب ازراہ ورع واحتیاط فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے تھے۔محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم کہتے ہیں کہ ''عبداللہ بن وہب،ابن القاسم سے بڑے فقیہ تھے لیکن ان کا ورع انہیں افتاء سے باز رکھتا تھا۔''(۱)

جلالت شان:

عبداللہ بن وہب کی شان جامعیت علم کوتمام بڑے بڑے علماء تسلیم کرتے تھے ابوزید بن ابی العمر کا بیان ہے کہ ''ہم نے ابن وہب کا نام علم کا دفتر رکھ دیا تھا۔''(۲) حارث کہتے ہیں ''کبھی ایسانہیں ہوا کہ میں عبداللہ بن وہب کے پاس آیا ہوں اور میں نے ان سے کسی مسئلہ میں استفادہ نہ کیا ہو،لوگ ان کوعلم کا دیوان کہتے تھے''ابن سعد کا بیان ہے کہ عبداللہ بن وہب کثیر العلم اورثقہ تھے''(۳) علامہ سمعانی لکھتے ہیں ''یہ وہی ہیں جنہوں نے اہل حجاز اور اہل مصر کا علم محفوظ کرلیا تھا۔''(۴) ان کی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مشائخ وقت ان کو دیکھتے تھے تو فرطِ ادب سے ان کے سامنے خم ہوجاتے تھے۔(۵)

عہدۂ قضاء سے انکار:

ان کے علمی وفقہی کمالات کی بناپر خلیفۂ وقت نے ان سے درخواست کی کہ مصر کے عہدۂ قضاء کوقبول فرمالیں،انہیں اس کی خبر ہوئی تو روپوش ہوکر خانہ نشین ہوگئے۔اسی اثناء میں ایک دن اسد بن سعد نے ان کواپنے گھر کے صحن میں وضوکرتے ہوئے دیکھ لیا۔کہنے لگا'' کیا آپ اسے پسند نہیں کرتے کہ باہر نکل کرلوگوں میں اللہ کی کتاب اور سنت نبوی کے مطابق حکم کریں۔''آپ نے یہ سن کرسر اٹھایا اور جواب دیا'' کیا تمہاری عقل بس یہیں تک پہنچی ہے کیا تم کوخبر نہیں ہے کہ قیامت میں علماء انبیاء کے ساتھ اٹھائے جائیں گے اور قضاء کا حشر سلطان کے ساتھ ہوگا۔''(۶)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۶ ص۷۳۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۲۸۱۔ (۳) تہذیب التہذیب ج۱ ص۷۳۔
(۴) کتاب الانساب للسمعانی ص۴۲۴۔ (۵) تہذیب التہذیب ج۶ ص۷۳۔ (۶) ابن خلکان ج۱ ص۲۴۹۔

خوفِ خدا:

قرآن مجید میں خشیت ربانی کو علماء کا خاص شعار بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ **انما یخشی اللہ من عبادہِ العلماء** اس کے مطابق حضرت عبداللہ بن وہب میں بھی خوف خدا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک دفعہ غسل کے لئے حمام میں داخل ہوئے وہاں کوئی قاری وہ آیۃ تلاوت کر رہا تھا جس میں فرمایا گیا ہے "**واذیتحاجون فی النار**" آپ پر اس آیت کا اتنا شدید اثر ہوا کہ فوراً غشی طاری ہوگئی۔ (۱) بلکہ آپ کی وفات بھی اسی خوف خدا کے ایک واقعہ کے سلسلہ میں ہوئی ہے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے آپ کے سامنے خود ان کی تصنیف "**کتاب اھوال یوم القیامۃ**" کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا، آپ اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ برداشت نہ کر سکے، بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بات چیت بالکل بند ہوگئی یہاں تک کہ اسی حالت میں چند روز کے بعد انتقال پر ملال ہوگیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر سن کر ان کا قلب شق ہوگیا تھا واللہ اعلم۔ (۲)

خوفِ خدا کی زیادتی کے باعث وہ اعمالِ خیر اور زہد میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ جن اعمال کو وہ اللہ کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی کا ذریعہ سمجھتے تھے ان کو اگر چہ کسی نے نہ کیا ہو وہ خود ان اعمال پر شدت کے ساتھ عمل پیرا ہو جاتے تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

> "**وکان ثقۃ حجۃ حافظاً مجتھدًا لایقلد احدًا اذا تعبد وتزھد**۔" (۳)
>
> ابن وہب معتبر، حجت، حافظ اور مجتہد تھے وہ عبادت اور زہد میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔
>
> ان کو جہاد اور حج کا بڑا شوق تھا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چھتیس حج کئے تھے۔ (۴)

تصنیف:

حضرت عبداللہ بن وہبؒ نے جو کچھ علم حاصل کیا تھا، وہ ضیاع کے خوف سے اس کو مدون بھی کرتے رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مؤطا امام مالک کے طرز پر ایک موطا لکھی اس کے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۸۱۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۳۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۸۰۔ (۴) ایضاً

علاوہ فقہ میں بھی انہوں نے کئی کتابیں مرتب کیں، علامہ ابن خلکان کا بیان ہے: "وله مصنفاتٌ في الفقة معروفة" ایک کتاب جو قیامت کے احوال پر ہے اس کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے عبدالرحمٰن بن القاسم کہتے ہیں "کسی شخص نے علم کی تدوین اتنی نہیں کی جتنی کہ ابن وہبؒ نے کی ہے۔" (۱)

وفات:

ماہ شعبان ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ان کی وفات کا عبرت انگیز واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے، حضرت سفیان بن عیینہ کو یہ خبر وحشت اثر ملی تو انہوں نے فرمایا "انا للہ وانا الیہ راجعون ابن وہب کی وفات سے مسلمانوں کو عموماً اور مجھ کو خصوصاً صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔" (۲)

عبدالرحمٰن بن مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبدالرحمٰن نام، ابوسعید کنیت، والد کا نام مہدی تھا، بصرہ کے رہنے والے اور قبیلۂ ازد کے غلام تھے، موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔اسی بنا پر ان کو لؤلؤی کہا جاتا ہے بعض لوگ انہیں بنو تمیم کی ایک شاخ بنی العنبر کی طرف منسوب کر کے عنبری کہتے ہیں ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ (۳)

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار کبار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔حافظ ذہبی انہیں "الحافظ الكبير والامام العلم الشهير" (۴) لکھتے ہیں۔علی بن المدینی کا بیان ہے کہ "ابن المہدی سب سے بڑے عالم تھے۔اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر قسم کھاؤں تب بھی میں یہی کہوں گا کہ میں نے ان جیسا یا ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا چونکہ غلام تھے اس لئے ان کو بصرہ کے شریف وممتاز غلاموں میں سے سمجھا جاتا تھا۔" (۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص ۲۸۰۔ (۲) تہذیب التہذیب ج۶ ص ۷۴۔

(۳) خطیب بغدادی ج۱۰ ص ۲۴۰۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص ۳۰۱۔ (۵) شذرات الذہب ج۱ ص ۳۵۵۔

علم کی نسبت ان کا نظریہ:

علامہ ابن جوزیؒ نے ان کا ایک طویل مقولہ نقل کیا ہے جس سے علم کی حقیقت اور اس کی وقعت واہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں ”کوئی شخص اگر کسی ایسے شخص سے ملاقات کرے جو اس سے زیادہ عالم ہو تو وہ دن اس کے لئے غنیمت کا دن ہے۔ اور اگر کسی ایسے شخص سے ملے جو علم میں اس کا ہمپایہ ہو تو اس کو چاہئے کہ اس سے مذاکرہ کرے۔ اور کچھ اس سے فائدہ اٹھائے اور اگر اس کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جو علم میں اس سے کم مرتبہ ہے تو اسے چاہئے کہ تواضع سے پیش آئے اور اس کو کچھ سکھائے۔ اور جو شخص ہر سنی ہوئی بات کو نقل کر دیتا ہو، یا ہر کس و ناکس کی روایت کو قبول کر لیتا ہو اسے علم کا امام نہیں کہا جا سکتا، اور نہ وہ امام ہو سکتا ہے جو شاذ روایتوں کے بیان کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہ لیتا ہو۔“(۱)

حدیث:

فن حدیث میں ان کو بڑی مہارت تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں ان کو حدیث کی طرف توجہ نہیں تھی۔ ابو عامر العقدی کا بیان ہے کہ ”عبدالرحمٰن بن مہدی پہلے پہل وعظ و قصہ گوئی کی طرف مائل تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا ”آپ کو ان واعظوں اور قصہ گو حضرات سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ میرے اس کہنے کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ حدیث کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔“(۲) پھر انہوں نے اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ سرآمدِ علماء حدیث بن گئے۔

علماء کا اعتراف:

بڑے بڑے محدثین ان کی اس فضیلت کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ”ابن مہدیؒ اپنے زمانہ میں اصحابِ حدیث کے امام تھے، اور حدیث کے تمام علوم و معارف میں انہی پر اعتماد تھا۔“(۳) صدقۃ بن الفضل کا بیان ہے کہ ”میں ایک دفعہ یحییٰ بن سعید القطان کے پاس آیا، اور حدیث سے متعلق بعض سوالات کئے، انہوں نے جواب دیا کہ تم عبدالرحمٰن بن مہدی کی ملازمت کرو، اور اس کے ساتھ ہی ان کی روایت کی ہوئی چند حدیثیں بھی مجھ کو سنائیں، چنانچہ میں ابن مہدی کے پاس آیا، اور انہوں نے مجھ سے حدیثیں بیان کیں۔“(۴) علی بن مدینی بار بار

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۔ (۲) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۰۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵۔ (۴) بغدادی ج ۱۰ ص ۳۴۱۔

کہتے تھے کہ ''اگر مجھ سے رکن اور مقام کے درمیان کھڑا کر کے بھی قسم لی جائے تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے ہرگز ابن مہدی سے بڑا کوئی عالم حدیث نہیں دیکھا۔''(۱) ابوربیع الزہرانی کا بیان ہے کہ ''میں نے ابن مہدیؒ سے بڑھ کر کسی شخص کو حدیث کا مبصر نہیں پایا۔''(۲)

علامہ سمعانی کتاب الانساب (ص۴۹۶) میں لکھتے ہیں ''عبدالرحمٰن بن مہدی پختہ کار حافظ، صاحبِ تقویٰ، اور جامع حدیث تھے انہوں نے تفقہ پیدا کیا، کتابیں تصنیف کیں اور حدیث کا درس دیا۔ وہ بجز ثقات کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے اور انہوں نے ایک ایسی جماعت سے روایتیں نقل کی ہیں جس نے صحابہ کو پایا تھا۔''

قوتِ حافظہ

ان کی قوتِ حافظہ نہایت قوی تھی جو سنتے تھے یاد رکھتے تھے اور مجال نہیں تھی کہ اس میں کوئی غلطی یا خطا واقع ہو جائے۔ اسی بنا پر لوگ ان کی مہارتِ حدیث کو جادو سے تعبیر کرتے تھے'' (۳) محمد بن یحییٰ کہتے ہیں ''میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ ''میں نے ان سے جو کچھ سنا ہے زبانی سنا ہے۔ وہ اپنی یاد سے روایت کرتے تھے۔'' (۴)

احتیاط:

زبانی روایت کرنے میں اکثر غلطی کا احتمال رہتا ہے، لیکن ابن مہدیؒ اس معاملہ میں بے حد محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ روایت باللفظ کریں۔ اسماعیل بن اسحاق القاضی کا بیان ہے کہ ''علی بن مدینی غایت درجہ محتاط تھے ایک دن انہوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کا امتحان لینے کی غرض سے ان کے سامنے کوئی حدیث خلط ملط کر کے پیش کی لیکن انہوں نے فوراً پہچان لیا، اور کہا کہ یہ حدیث فلاں شخص سے اس طرح مروی ہوگی۔ بعد میں ہم نے اس کی تحقیق کی تو واقعی وہ حدیث اسی طرح نکلی۔''(۵) ابوعبداللہ سے کسی نے پوچھا ''کیا عبدالرحمٰن بن مہدی حافظ تھے؟'' بولے ''ہاں، حافظ تھے اور وہ بڑی احتیاط کرتے تھے۔ وہ تحدیث باللفظ کو زیادہ پسند کرتے تھے۔''(۶)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۰۔ (۳) ابن خلکان ج ۶ ص ۲۸۱۔
(۴) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۷۔ (۵) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۵۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۸۰۔

تنقید:

شب و روز کی ممارست، اور صحیح قوت فیصلہ کی وجہ سے ان میں تنقید حدیث کا ایک ایسا ملکہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بیک نظر صحیح کو سقیم سے جدا کر لیتے تھے۔ خود ان کا مقولہ تھا کہ "کسی شخص کے لئے امام ہونا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ صحیح اور غیر صحیح میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔"(۱) اس کے ساتھ ہی وہ فرماتے تھے "حدیث کی پہچان بڑا مشکل کام ہے۔" (۲)

محمد بن ابی بکر المقدمی کا بیان ہے کہ "عبدالرحمٰن بن مہدی جو کچھ سنتے تھے اسے اور جو نہیں سنتے تھے اسے دونوں کو خوب اچھی طرح پرکھ سکتے تھے۔ اور اس وصف میں میں نے ان سے بڑا کوئی اور عالم نہیں دیکھا وہ یقیناً امام ثبت تھے اور یحییٰ بن سعیدؒ سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔"(۳)

ایک شخص نے ان سے پوچھا "آپ صحیح حدیث کو غیر صحیح سے کس طرح متمیز کر لیتے ہیں؟" فرمایا "جس طرح طبیب مجنوں کو پہچان لیتا ہے۔" (۴) علی بن مہدی بیان کرتے ہیں کہ "ایک شخص عبدالرحمٰن بن مہدی کے پاس آیا اور دریافت کرنے لگا "اے ابوسعید! آپ فرماتے ہیں یہ راوی قوی ہے اور یہ ضعیف، اور یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ تو آپ کو یہ امتیاز کس طرح ہو جاتا ہے؟" ابن مہدی بولے "اگر تم کسی صراف کے پاس جا کر چند درہم اس کو دکھاؤ اور وہ کہے کہ یہ درہم کھرے ہیں اور یہ کھوٹے۔ تو کیا تم اس سے بھی پوچھو گے کہ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا، یا معاملہ اس کے سپرد کر کے اس پر بھروسہ کرو گے؟" سائل نے جواب دیا "میں تو معاملہ اسی کے ہی سپرد کر دوں گا" ابن مہدیؒ نے فرمایا "بس ہم لوگوں کا حال بھی یہی ہے کثرت مجالست، مذاکرہ اور بار بار کے غور و خوض کے بعد ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم صحیح حدیث کو غیر صحیح سے فوراً پہچان لیتے ہیں۔" (۵)

ناقدینِ حدیث کا ان پر اعتماد:

ان کی مہارتِ فن، وسعت نظر، اور صحیح قوتِ تنقید کے باعث اس عہد کے تمام بڑے بڑے ناقدینِ حدیث ان پر اعتماد کرتے، اور دوسروں پر ان کی فوقیت کو تسلیم کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ "ابن مہدیؒ کی پیدائش ہی حدیث کے لئے ہوئی ہے۔" (۶)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۰۲۔ (۲) ایضاً ص ۳۰۳۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۰۲۔ (۴) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۶۔ (۵) تہذیب الاسماء ج ا ص ۳۰۵۔ (۶) ایضاً۔

ابن حبان انہیں خراجِ ستائش اس طرح پیش کرتے ہیں ''وہ ثقہ تھے۔ اور حدیث کے پختہ کار حفاظ میں سے اور دین کے ارباب ورع میں سے تھے۔ انہوں نے حدیثیں حفظ کیں، جمع کیں، تفقہ حاصل کیا، تصنیف کا کام انجام دیا اور حدیثوں کی روایت کی، اور وہ سوائے معتبر راویوں کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے (۱) خلیلی کا قول ہے کہ وہ بے خوف تردید امام ہیں'' امام شافعیؒ فرماتے ہیں ''مجھ کو نہیں معلوم کہ دنیا میں ان کی کوئی نظیر ہے یا نہیں'' علامہ ابن سعد کا ارشادِ حق بنیاد ہے کہ ''وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے'' (۲) علی بن مدینی فرماتے ہیں ''یحییٰ بن سعید فن رجال میں بڑے ماہر تھے۔ اور عبدالرحمٰن بن مہدی علم حدیث میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔'' انہی کا ایک اور مقولہ ہے کہ یحییٰ بن سعید اور ابن مہدی یہ دونوں اگر کسی راوی کے ترک پر متفق ہو جائیں تو میں اسے چھوڑ دوں گا لیکن اگر ان میں اختلاف ہو تو پھر میں ابن مہدی کا قول اختیار کروں گا کیونکہ وہ زیادہ معتدل ہیں، اور یحییٰ میں تشدد ہے۔'' ابو حاتم کہتے ہیں ''حماد بن زیدؒ کے اصحاب میں ابن مہدی سب سے زیادہ صاحب تثبت ہیں۔ وہ امام ثقہ ہیں اور یحییٰ بن سعید سے اثبت اور وکیعؒ سے اتقن ہیں۔'' ابن عمار کا بیان ہے کہ ابن مہدی وکیع سے زیادہ حدیث کے اختلافات کو جانتے اور پہچانتے تھے۔'' ابو عبداللہ کہتے ہیں ''کسی روایت کے بارہ میں وکیع اور عبدالرحمٰن دونوں کا اختلاف ہو جائے تو عبدالرحمٰن کا قول لینا چاہئے کیونکہ وہ اثبت اور قرآن مجید سے زیادہ قریب رہنے والے ہیں۔ امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ ''حضرت سفیان ثوری کی تقریباً پچاس حدیثوں میں عبدالرحمٰن بن مہدی اور وکیع بن الجراح کا اختلاف ہوا، پھر ہم نے تحقیق و تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ عام صواب عبدالرحمٰن کی طرف تھا'' حضرت یحییٰ بن سعید سے کسی نے کہا۔ ''ابو سعید! فلاں شخص کہتا ہے کہ ابن مہدی روایات کے قبول کرنے میں محتاط نہیں تھے۔ وہ کسی شیخ سے سماع حدیث کرتے تھے اور کتاب ان کی آستین میں ہوتی تھی۔'' (یعنی اس کو قلمبند نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ کو یہ سن کر غصہ آ گیا اور کہنے لگے ''عبدالرحمٰن کا سوتے سوتے سننا بھی مجھ کو دوسروں کی املاء سے زیادہ محبوب ہے۔'' (۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۱۔ (۲) ایضاً۔

(۳) یہ سب معلومات خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۳، ۲۴۴ سے ماخوذ ہیں۔

شیوخ:

انہوں نے جن شیوخ سے حدیث کا سماع کیا ان میں چند نام یہ ہیں:

ایمن بن نابل، یہ صغار تابعین میں سے ہیں، جریر بن حازم، عکرمہ بن عمار، خالد بن دینار، مہدی بن میمون، مالک، شعبہ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، ہشام بن سعد، ہمام بن یحییٰ، مثنیٰ بن سعید الضبعی، ابراہیم بن نافع المکی، منصور بن سعد رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (۱)

اگرچہ انہوں نے ان سب سے فیض حاصل کیا تھا۔ لیکن حضرت سفیانؒ اور حضرت اعمشؒ کی احادیث کے باب میں ان کا علم نہایت وسیع تھا۔ ابو عبید کہتے ہیں "وکان معینا بحدیث سفیان" علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میں کوفہ آیا تو حضرت اعمش کی احادیث جمع کرنے میں مشغول ہو گیا۔ پھر اسی سلسلہ میں بصرہ آ کر حضرت ابن مہدی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا "حضرت! اب کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ کو اعمش کی احادیث سنائے" ابن مہدیؒ یہ سنکر غضبناک ہو گئے اور فرمایا "اس طرح کی باتیں اہل علم کے شایانِ شان نہیں ہیں اور ہاں! ایسا ہے کون جس نے علم کے تمام گوشوں پر احاطہ کرلیا ہو۔ اور وہ سب اس کے سینہ میں محفوظ ہو۔ تم جیسا شخص ایسی بات کہتا ہے! اچھا! تمہارے پاس لکھنے کے لئے کچھ ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں" فرمایا "تو پھر لکھو" میں نے عرض کی "آپ لکھوانے سے قبل مجھ سے مذاکرہ کر لیجئے، ممکن ہے جو کچھ آپ لکھوائیں وہ میرے پاس موجود ہی ہو۔" جواب دیا "نہیں! تم لکھو، میں تم کو وہی حدیثیں لکھواؤں گا جو تمہارے پاس نہ ہوں گی۔" ابن مدینیؒ کہتے ہیں "اس کے بعد انہوں نے مجھ کو تیس ایسی حدیثیں لکھوائیں جن میں سے ایک بھی میری سنی ہوئی نہ تھی۔" (۲)

تلامذہ:

ان کے دامانِ علم سے وابستہ ہو کر جنہوں نے فیض حاصل کیا ان میں ان کے صاحبزادوں موسیٰ، احمد، اور اسحاق وعلی کے علاوہ عبداللہ بن مبارک، ابن وہب، یحییٰ بن معین، یحییٰ بن یحییٰ، ذہلی، ابوخیثمہ، احمد بن سنان شامل ہیں رحمہم اللہ تعالیٰ۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۷۹۔ (۲) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۵۔

شوقِ حدیث:

حضرت ابن مہدیؒ کو احادیث جمع کرنے کا جو شوق تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے پوچھا ''خدا آپ کا ایک گناہ معاف کردے۔ آپ کو یہ زیادہ محبوب ہے، یا یہ کہ اس کے بدلہ میں آپ ایک حدیث حفظ کرلیں۔'' بولے ''حفظِ حدیث'' (۱)

درس:

معلوم ہوتا ہے انہوں نے طلب علم کے زمانہ میں ہی درس دینا شروع کردیا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں ''میں ابھی امام مالک کے حلقۂ درس میں شامل ہوتا ہی تھا کہ لوگ مجھ سے حدیثیں لکھتے تھے'' (۲) ان کی مجلسِ درس نہایت باوقار پر رعب ہوتی تھی۔ احمد بن سنانؒ کہتے ہیں ''کوئی شخص ابن مہدی کے درس میں بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں تک کہ قلم بھی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ نہ کوئی کھڑا ہوتا تھا سب حاضرین مجلس نہایت خاموشی کے ساتھ ان کی تقریر سننے میں محو رہتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ نماز میں ہیں۔'' (۳)

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال تھا۔ ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں۔ ''کان فقیها مفتیا عظیم الشان'' (۴) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ''وہ یحیٰی القطان سے بڑے فقیہ تھے۔'' کسی شخص نے ان سے پوچھا ''کیا عبدالرحمٰن بن مہدیؒ فقیہ نہیں تھے؟'' فرمایا وہ فقہ میں بڑا کمال رکھتے تھے یہاں تک کہ یحیٰیؒ سے بھی زیادہ وسیع النظر تھے۔ حضرت یحیٰی کوفیوں کے اقوال کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے۔ اور ابن مہدیؒ بعض مذاہبِ حدیث کی پیروی کرتے اور اہل مدینہ کی رائے کو زیادہ وقعت دیتے تھے۔'' (۵)

ایک مرتبہ سلیمان جوجح کے مسائل میں بڑی وسیع اور دقیق نظر رکھتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے پاس آئے اور ان کو چھیڑنے کے لئے کہنے لگے ''اب کوئی ایسا شخص نہیں رہا ہے جو حج کے مسائل میں ہماری مفید رہنمائی کرے'' ابن مہدیؒ نے یہ سن کر امتحاناً پوچھا

---

(۱) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۲۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۸۰۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۳۔

(۴) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۵۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲۔

"آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے حج کے تمام ارکان سوائے طواف بیت اللہ کے ادا کر لئے لیکن طواف سے قبل بیوی سے مباشرت کر بیٹھا" سلیمان نے جواب میں ایک حدیث پڑھی جس کا مفاد یہ تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی "آئندہ سال حج کی قضا کریں۔ اور اس میں اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ پہلے حج میں جس جگہ پر مجتمع (۱) تھے وہاں متفرق ہو جائیں اور جہاں جدا تھے وہاں اکٹھے ہو جائیں" ابن مہدی بولے "اس بات کے لئے کوئی روایت کیجئے کہ کب مجتمع ہوں اور کب متفرق؟" سلیمان اس موقع پر خاموش ہو گئے، پھر ابن مہدی نے ارشاد فرمایا "اچھا! تم اب لکھو" انہوں نے لکھنا شروع کیا تو حضرت عبدالرحمٰن نے اس ایک نشست میں ہی تیس مسئلے لکھا دیئے اور ہر مسئلہ کے لئے ایک ایک یا دو دو حدیثیں بھی قلمبند کرائیں (۲)۔ ان کے کمال تفقہ کی وجہ سے معاذ بن معاذ کہتے تھے "بصرہ میں اب ایک شخص کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو "قضا" کی صلاحیت رکھتا ہو۔" کسی نے ان سے پوچھا "وہ ایک شخص کون ہے؟" جواب دیا "عبدالرحمٰن بن مہدی"۔ (۳)

مرجوعۂ خلق:

اپنے علمی تبحر، وسعت نظر، اصابت رائے اور ثقاہت کی بنا پر لوگ خیل در خیل اپنے دینی اور دنیوی معاملات میں ان کی ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایوب بن المتوکل کا بیان ہے "ہمیں جب کبھی کسی دینی یا دنیوی معاملہ میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو ہم عبدالرحمٰن بن مہدی کے گھر چلے جاتے تھے۔" (۴) اور یوں بھی لوگ ان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ محمد بن حسان الازرق نے ان سے کوئی روایت نقل کی تو ان کا نام لینے کے بعد کہا "وکان قرۃ عین" وہ آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ (۵)

عبادت:

ابن مہدیؒ جس طرح آسمانِ علم و فضل کے آفتابِ درخشندہ تھے زہد و عبادت میں بھی ابناءِ عصر سے امتیاز رکھتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں زاہد شب زندہ دار تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے۔ "کان ابی یحییٰ اللیل کلہ" (۶) ان کا معمول تھا کہ شب میں نصف قرآن اور دو راتوں میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ (۷)

---

(۱) یعنی جہاں مباشرت کی تھی۔ (۲) بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۵ و ۲۴۶۔ (۳) ایضاً ص ۲۴۲۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲۔

(۵) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۷۔ (۶) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۰۵۔ (۷) ایضاً۔

ایک دفعہ وہ رات بھر عبادت الٰہی میں جاگتے رہے۔ فجر کا وقت نزدیک آیا تو اتفاق سے ان کی آنکھ لگ گئی، اور نیند کا ایسا شدید غلبہ ہوا کہ نماز ہی قضا ہوگئی۔ بیدار ہونے پر انہیں اس کا سخت ملال ہوا، ان کے صاحبزادہ کا بیان ہے کہ انہوں نے اس کوتاہی کی مکافات کرنے کے لئے اس بات کا عہد و پیمان کیا کہ وہ دو ماہ تک اپنے جسم اور زمین کے درمیان کسی چیز کو حائل نہ ہونے دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسم کا حصہ زیریں زخمی ہوگیا۔'' (۱)

زہد وورع:

ان کے زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی چیز میں ذرا بھی شک ہو جاتا تو خواہ وہ کتنی ہی پرمنفعت ہو، اس سے بے تامل ترک کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ''اگر تم کسی چیز کو اللہ کی خوشنودی اور اس کا ثواب حاصل کرنے کے لئے ترک کر دو گے تو وہ گھوم گھام کر آخر کار تم کو ہی ملے گی۔'' چنانچہ اس کے بعد وہ خود اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں ''میں اور میرا بھائی دونوں ایک تجارت میں شریک تھے۔ اس میں ہم کو غیر معمولی نفع ہوا، لیکن جب تقسیم منافع کا وقت آیا تو میرے دل میں اس مال کی نسبت کوئی شبہ پیدا ہوگیا اور میں نے ''دع مایریبک الی مالا یریبک'' کے مطابق اس سے اپنے بھائی کے حق میں دستبرداری دے دی۔ لیکن خدا کی شان دیکھئے میری وفات سے پہلے ہی وہ سب مال مجھ کو اور میرے بیٹے کو مل گیا۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ میرے شریک تجارت بھائی نے اپنی تین لڑکیوں کی شادی میرے لڑکوں سے اور میں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی بھائی کے لڑکے سے کردی تھی۔ اس کے بعد اتفاق یہ ہوا کہ بھائی کا انتقال ہوگیا اور میرے والد ماجد اس کے ترکہ کے وارث ہوئے۔ پھر جب والد کی وفات ہوئی تو وہ سب مال میری اور میرے فرزند کی طرف منتقل ہوگیا۔'' (۲)

ایک مرتبہ انہوں نے کسی زمین کے بیچنے کا ارادہ کیا تو اس کی قیمت فی جریب ڈھائی سو دینار قرار پائی۔ اس پر دلال نے کہا ''آپ کو اس ویران زمین کی اتنی قیمت مل رہی ہے، اگر میں اور آپ کا غلام دونوں مل کر اس میں کھاد ڈال دیں اور اس طرح اسے درست کرلیں تو آپ کو ایک جریب پر پچاس دینار اور زیادہ مل جائیں گے اور پھر پوری زمین کی قیمت میں آپ کو چار ہزار دینار ملیں گے۔ یہ رقم بہت کافی ہے آپ اجازت دیجئے کہ ہم ابھی نہیں بلکہ درست کرنے کے بعد

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲۔ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۳۔

اس زمین کو فروخت کریں۔" ابن مہدی کو یہ سن کر غصہ آ گیا، اور فرمایا" کیا صرف چار ہزار دینار! اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی "لایستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث فاتقوا اللہ یا اولی الباب" نہیں ہرگز نہیں اس طرح تو مجھ کو چار ہزار چھوڑ کر ایک لاکھ بھی ملیں، میں اسے قبول نہیں کروں گا۔"(۱)

حصولِ ثواب کا شوق:

اجر و ثواب حاصل کرنے کا شوق اس درجہ تھا کہ فرماتے تھے "اگر مجھ کو اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ اللہ کی معصیت کا ارتکاب ہوگا تو میں اس بات کی تمنا کرتا کہ شہر کا ایک ایک شخص مجھ کو برا کہے، اور میری غیبت کرے۔ بھلا اس نیکی سے بڑھ کر انسان کے لئے کیا چیز ہو سکتی ہے کہ جس کو اس نے نہ خود کیا ہو، اور نہ اس کا اسے علم ہو، اور اس کے باوجود قیامت کے دن جب اس کا صحیفۂ اعمال کھولا جائے تو وہ نیکی اس میں موجود ہو۔"(۲)

عقائد میں تشدد:

اپنے عقائد و خیالات میں نہایت متشدد تھے۔ ان کا مقولہ تھا "اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو جو لوگ قرآن مجید کو مخلوق مانتے ہیں میں ان کی گردن اڑا کر دجلہ میں غرق کر دیتا۔(۳)

خضاب:

پینتالیس یا چھیالیس سال کی عمر میں بال سفید ہونے شروع ہو گئے تھے، آپ ان پر خضاب لگاتے تھے۔(۴)

وفات:

بصرہ میں بماہ جمادی الاخریٰ ۱۹۸ھ، تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

---

(۱) صفوۃ الصفوۃ ج ۴ص ۳۔ (۲) ایضاً ص ۴۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۳۰۲۔ (۴) بغدادی ج ۱۰ص ۲۴۱۔

ولید بن مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ولید نام ابوالعباس کنیت والد کا نام مسلم تھا، بنوامیہ کے شاہی غلام (دقیق الامارۃ) تھے اس لئے اموی لکھے جاتے ہیں وطن دمشق تھا۔

ولادت:

۱۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔

علم وفضل:

ولید اگرچہ غلام کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اسلامی سوسائٹی کے ماحول سے متاثر ہوکر اوراپنی ذاتی محنت وشوق سے باعتبار علم وفضل وہ مرتبۂ بلند حاصل کیا جوکسی خوش نصیب کوہی میسر ہوسکتا ہے، علامہ نووی لکھتے ہیں ''علماء کا ان کی جلالت شان علم میں ان کے رتبۂ بلند، اور توثیق پر اتفاق ہے۔[1] حافظ ذہبی انہیں ''الامام الحافظ'' لکھتے ہیں۔ ابن ناصر الدین کا بیان ہے کہ ''ولید امام حافظ، اور دمشقیوں کے عالم تھے۔'' [2]

حدیث:

انہوں نے حدیث کا سماع وقت کے ائمۂ حدیث سے کیا تھا جن میں سے چند نام یہ ہیں: یحییٰ بن الحارث الذماری، ثور بن یزید، محمد بن عجلان، ہشام بن حسان، ابن جریج، مثنیٰ بن الصباح، امام اوزاعی، یزید بن ابی مریم، صفوان بن عمرو۔ اوران سے جنہوں نے روایت کی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے بعض مشہور یہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابن المدینی، ہشام بن عمار، ابوخیثمہ، علی بن محمد، موسیٰ بن عامر۔

حدیث میں ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ ابوالیمان کہتے ہیں ''میں نے ولید بن مسلم جیسا کوئی نہیں دیکھا'' صدقۃ بن الفضل المروزی کا بیان ہے ''طویل طویل حدیثوں کو یادرکھنے میں

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۴۷۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۴۔

میں نے ولید سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا۔ انہیں ابواب کی حدیثوں پر حدیثیں یاد تھیں۔''(۱)
ابراہیم بن المنذر بیان کرتے ہیں ''ایک مرتبہ مجھ سے علی بن المدینی نے فرمائش کی کہ میں ان کو حضرت ولید بن مسلم کی بعض احادیث سناؤں، میں نے کہا ''سبحان اللہ آپ کے سماع سے میرے سماع کو کیا نسبت ہوسکتی ہے؟'' وہ بولے ''ولید جب شام آئے تو ان کے پاس علم کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، اور میں اس سب سے فیض یاب نہیں ہوسکتا تھا'' میں نے ان کو کچھ حدیثیں سنائیں تو بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے ''واقعی ولید بالکل ٹھیک کہتے تھے۔''

وہ احادیث کی بغیر تنقید و تحقیق کے روایت نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف انہی روایات کو لیتے تھے جن پر ان کو اچھی طرح اعتماد اور جن کی صحت کا یقین ہوجاتا تھا اور یہی دراصل ایک محدث کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ ہے، اور یہی وہ خصوصیت ہے ''جس کی وجہ سے محدث محدث کہلاتا ہے۔'' ولید بن مسلم اسی صفت کی بنا پر محدث کہلاتے تھے۔ ابوحاتم سے محمد بن ابراہیم نے دریافت کیا ''آپ ولید بن مسلم کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟'' بولے ''وہ صالح الحدیث تھے'' امام احمد بن حنبل نے ابوزرعۃ الدمشقی سے کہا ''تین بزرگ واقعی اصحاب حدیث ہیں، مروان بن محمد، ولید بن المسلم، اور ابومسہر، یعقوب بن سفیان کہتے ہیں ''میں اپنے اصحاب سے سنتا تھا کہ لوگوں کا علم صرف دو شخصوں کے پاس ہے، اسماعیل بن عیاش اور ولید بن المسلم، لیکن ولید کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ نہایت قابلِ تعریف طریقہ سے اپنے طریقہ پر اخیر وقت تک چلتے رہے۔ وہ اہل علم کے نزدیک پسندیدہ، قابل اعتماد و اعتبار، صحیح اور صحیح العلم تھے۔''(۲)

انہوں نے حدیث کے لئے ابن جابر کی سترہ سال تک مصاحبت و ملازمت کی تھی، امام اوزاعیؒ سے ان کو بڑا اختصاص تھا وہ اگر کسی شیخ سے کوئی روایت سننا بھی چاہتے تھے تو پہلے امام اوزاعی سے اس کی نسبت استفسارِ حال کرلیتے تھے۔ (۳)

احتیاط:

وہ اگرچہ قوی الحافظہ تھے لیکن پھر بھی حدیث کے معاملہ میں صرف حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جو کچھ سنتے تنقیح و تحقیق کے بعد اسے لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ شدہ شدہ ان کے مسودات ستر کتابوں کی شکل میں ہوگئے۔ ان کی یہ کتابیں نوع بنوع احکام کی احادیث کا مجموعہ تھیں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۵۳۔ (۳) ایضاً ص ۱۵۲۔

جوشریعت کے ایک جامع دستور کا کام دے سکتی تھیں۔ چنانچہ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ جو شخص ولید بن مسلم کی کتابوں کو لکھ لے گا اس میں عہدۂ قضا کی صلاحیت و اہلیت پیدا ہو جائے گی۔ (۱)

تاریخ:

حدیث کے علاوہ ان کی تاریخی معلومات بھی وسیع تھیں اور اس موضوع پر بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی تھیں، حافظ ذہبی لکھتے ہیں ''انہوں نے کثرت سے کتابیں لکھیں اور تاریخی تصنیفات بھی کیں۔ اور ان کو اس موضوع سے بڑی دلچسپی تھی۔ (۲)'' ابوزرعۃ الرازی کا بیان ہے کہ ولید مغازی کے علم میں وکیع سے بڑے عالم تھے۔'' (۳)

جلالتِ علم:

بعض ناقدینِ حدیث نے کہا ہے کہ ولید کبھی کبھی ضعیف راویوں سے احادیث روایت کر دیتے تھے اور کبھی وہ تدلیس بھی کرتے تھے یعنی جس شخص سے روایت سنتے تھے اس کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ اس سے اوپر کے شیخ کا نام لے کر کسی غیر واضح صیغہ کے ساتھ حدیث کی روایت کرتے تھے۔ لیکن ان پر یہ گرفت محض فنی ہے ورنہ ان کی جلالت علم اور کمالِ فضل پر سب کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبیؒ فنِ تنقیدِ رجال کے امام ہیں فرماتے ہیں ''ولیدؒ کے علم اور ان کے حفظ میں کوئی نزاع نہیں ہے، البتہ وہ مدلّس تھے اس لئے جب تک سماع کی تصریح نہ کریں ان سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا'' (۴) علامہ ابن سعد انہیں ''ثقہ کثیر الحدیث'' لکھتے ہیں۔ (۵)

عقل و فرزانگی:

فہم و خرد کے لحاظ سے بھی وہ اربابِ کمال میں نہایت ممتاز تھے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں ''میں نے اہل شام میں ان سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا۔'' (۶)

اخلاق و عادات:

کمال علم و فضل کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات بھی نہایت کریمانہ اور بزرگانہ تھے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۷۹۔ (۲) ایضاً ص ۲۷۸۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۳۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۷۹۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۲۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۷۹۔

ہشام بن عروہ سے کسی نے ان کے متعلق استفسار کیا تو ”انہوں نے کہا ولید بہت بڑے عالم، صاحب زہد و ورع اور متواضع اور منکسر الطبع تھے۔“(۱)

وفات:

۱۹۴ھ میں حج سے فارغ ہو کر آ رہے تھے کہ دمشق پہنچنے سے قبل ایک موضع ذی المروۃ میں بیمار ہوئے۔ اپنے ایک دوست حرملہ بن عبدالعزیز کے مکان پر قیام کیا اور وہیں مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر کے آشیانہ قدس میں پہنچ گیا۔“(۲)

حماد بن زید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

حماد نام، ابو اسمٰعیل کنیت تھی والد کا نام زید تھا، جریر بن حازم کے خاندان کے غلام تھے، ان کے دادا درہم بجستان کی جنگ میں گرفتار کر کے غلام بنالئے گئے تھے۔“ (۳)

ولادت:

۹۸ھ میں پیدا ہوئے جوانی میں ہی آنکھوں کی نعمت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس بنا پر ضریر (نابینا) کہلاتے تھے۔

علم وفضل:

انہوں نے علم کی تحصیل طفولیت میں ہی شروع کر دی تھی۔ یحییٰ کا بیان ہے ”ایوب کے پاس حماد کے سوا کوئی اور حدیثوں کی کتابت نہیں کرتا تھا“ ابن ابی خثیمہ کہتے ہیں ایک شخص نے عبیداللہ بن عمر سے دریافت کیا ”حماد لکھنا بھی جانتے تھے یا نہیں“؟ بولے ”ایک مرتبہ میں بارش کے دن میں حضرت حماد کے پاس آیا تو میں نے خود دیکھا کہ وہ لکھتے جاتے اور پھونکیں مار مار کر اسے خشک کرتے جاتے تھے۔“ (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۵۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۴۔

(۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۴۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۱۔

نابینا ہو جانے سے صورتاً جو تھوڑا بہت نقص پیدا ہو گیا تھا حماد نے اس کی مکافات اس طرح کی کہ اپنی ذاتی محنت وکوشش اور شوق والتفات سے علمِ حدیث کے نمایاں شیخ بن گئے، چنانچہ حافظ ذہبیؒ انہیں "الامام الحافظ المجود شیخ العراق" کہتے ہیں۔ علامہ نووی لکھتے ہیں ''وہ امام عالی مقام ہیں جن کی جلالت وعظمت پر سب کا اتفاق ہے۔ (۱) علامہ ابن سعد فرماتے ہیں ''حماد ثقہ معتمد، برہان حق، اور کثیر الحدیث تھے۔''(۲)

ائمہ علم کا اعتراف:

ان کے عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے ان کی جلالت وعظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ابن مہدیؒ کا بیان ہے ''اپنے اپنے زمانہ کے ائمہ چار ہیں۔ ثوری، مالک، اوزاعی، حماد بن زید''، یحییٰ بن یحییٰؒ کہتے ہیں ''میں نے حمادؒ سے زیادہ کوئی حافظ روایات نہیں دیکھا۔

یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں ''حماد بن زیدؒ سے زیادہ ثابت فی الحدیث کوئی نہیں ہے'' امام احمد ابن حنبل ان لفظوں میں حماد کے کمالِ علم وعمل کی داد دیتے ہیں:

''هو من ائمة المسلمين من اهل الدين وهو احب الى من حماد بن سلمة.''

''وہ مسلمانوں کے ائمہ میں سے ہیں اور بڑے دیندار ہیں اور مجھ کو حماد بن سلمہ سے زیادہ پسند اور محبوب ہیں۔''

ابن مہدی کا ایک دوسرا قول ہے ''میں نے حمادؒ سے بڑا کوئی شخص عالمِ سنت نہیں دیکھا اور نہ علم میں حمادؒ، مالکؒ اور سفیانؒ سے افضل واعلیٰ کوئی شخص دیکھا۔'' ایک روایت میں ابن مہدی کے الفاظ اس طرح نقل کئے گئے ہیں ''کہ میں نے حماد سے بڑا کوئی عالم دیکھا ہی نہیں یہاں تک کہ سفیانؒ اور مالکؒ کو بھی حماد سے بڑا عالم نہیں پایا'' ابو عاصم کا بیان ہے ''حماد بن زید کی حیات میں ان کی سیرت واخلاق کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی مثل موجود نہ تھا۔'' یزید بن زریع انہیں ''سید المسلمین'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ محمد بن مصفیٰ کا بیان ہے کہ ''میں نے بقیۃ سے سنا وہ کہتے تھے "مارأیت بالعراق مثل حماد بن زید" میں نے عراق میں حماد بن زید جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔'' وکیع فرماتے ہیں ''ہم حماد کو بجز مسعر کے اور کس کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔''(۳) یزید بن زریع سے کسی نے پوچھا ''آپ حماد بن زیدؒ اور حماد بن سلمہؒ میں کس کو افضل قرار دیتے ہیں؟'' فرمایا

---

(۱) تہذیب الاسماء، ج ۱ص ۱۶۷۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۳ص ۱۲۔ (۳) یہ اقوال تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۲۲۱،۲۱۳ سے ماخوذ ہیں۔

''حماد بن زید تو حماد بن زید ہی ہیں، رہے حماد بن سلمہ تو وہ رجلِ صالح تھے'' عبداللہ بن معاویۃ الجمعیؒ کہتے ہیں ''ہم نے حماد بن زیدؒ سے حدیثیں سنی ہیں اور حماد بن سلمہ سے بھی لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو دینار اور درہم میں ہوتا ہے۔ (۱)

حافظہ:

ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ عجلی کہتے ہیں ''حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ اور ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔'' (۲)

احتیاط:

اس درجہ علم وفضل اور قوتِ حافظہ کے باوجود حدیث روایت کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں ''حماد بن زید، حماد بن سلمہ سے اور دوسرے ثقات سے زیادہ ثابت فی الحدیث ہیں۔ لیکن ابن زید اس وصف میں مشہور ہیں کہ وہ اسانید کو مختصر کردیتے ہیں اور کبھی مرفوع کو موقوف بنادیتے ہیں۔ وہ اپنی احتیاط کی وجہ سے بڑے شکی تھے۔ وہ عظیم المرتبت تھے، ان کے پاس کتاب نہیں تھی جس کی طرف وہ رجوع کرسکتے پس کبھی وہ سلسلۂ اسناد کو صحابی سے آگے بڑھا کر حدیث کو مرفوع کردیتے تھے اور کبھی مرفوع کو موقوف وہ حدیث بیان کرتے وقت خوفزدہ ہوجاتے تھے۔'' (۳)

فقہ:

حدیث کے ساتھ فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ابو اسامہ کہا کرتے تھے ''تم جب حماد بن زید کو دیکھو گے تو کہو گے کہ ان کو کسریٰ نے ادب اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فقہ سکھایا ہے۔'' (۴) ابن مہدی کا بیان ہے ''میں نے بصرہ میں حماد سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔'' (۵)

عقلمندی:

دنیوی معاملات میں بھی بڑی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ خالد بن خراش کا بیان ہے ''حماد بن زید عقلاءِ روزگار اور دانشورانِ زمانہ میں سے تھے۔'' (۶) ابن الطباع کا قول ہے ''میں نے حماد بن زید سے بڑا کوئی عقلمند نہیں دیکھا۔'' (۷)

وفات: ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰۔
(۷) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲۔

ابن جریج القرشی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبدالملک، ابوالولید یا ابو خالد کنیت، والد کا نام عبدالعزیز تھا، ان کے دادا جریج ام حبیب بنت جبیر کے جو عبدالعزیز بن عبداللہ کی بیوی تھی، غلام تھے۔ ابوالولید اپنے دادا کی نسبت سے ہی ابنِ جریج کہلاتے ہیں اور ان کے ہی ولاء کے تعلق سے انہیں قرشی یا اموی کہا جاتا ہے۔

پیدائش:

۸۰ھ میں مکہ میں پیدا ہوئے، لیکن آبائی وطن روم تھا۔

تعلیم وتربیت:

ابن جریج کو شروع سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا، لیکن شروع شروع میں وہ عربی شعر وشاعری اور علم انساب کی طرف مائل رہے، کہولت کی عمر میں انہوں نے حدیث کی طرف توجہ کی تو اس شان کے ساتھ کہ تمام چیزوں سے قطع تعلق کر کے ہمہ تن حدیث میں مشغول ہو گئے اور اس سلسلہ میں پورے اٹھارہ برس تک حضرت عطاء بن ابی رباح کے دامن علم وفضل سے وابستہ رہے۔ ان کے آغازِ شباب تک بعض صحابہؓ حیات تھے۔ اگر ان کو اس وقت حدیث کی طرف توجہ ہوتی تو کئی ایک صحابہؓ سے سماع حدیث کا شرف حاصل کر سکتے تھے۔ (۱) غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ نووی ان کو تبع تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ (۲)

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ابن جریج کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ ''حافظ ذہبی انہیں الامام الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ (۳)، امام نووی فرماتے ہیں ''علماء سلف وخلف کے اقوال ابن جریج کی ثنا اور ان کے مناقب کے ذکر میں ناقابل شمار ہیں'' (۴) امام احمد بن حنبلؒ ان کو علم کا ظرف (۵) اور عطا ابن رباح اہل حجاز کا سردار کہتے تھے۔'' (۶)

---

(۱) شذرات الذہب ج اص ۲۳۶۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۲ص ۲۹۷۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۶۰۔
(۴) تہذیب الاسماء ج ۲ص ۲۹۷۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۶۰۔ (۶) تہذیب الاسماء ج ۲ص ۲۹۷۔

حدیث:

انہوں نے حدیث کا فن سیکھنے کے لئے حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق حضرت عطاء بن ابی رباح کی معیت وملازمت کا شرف سترہ سال تک حاصل کیا اس کے بعد سات سال تک وہ حضرت عمرو بن دینار کی خدمت میں رہے۔ (۱) ان دو بزرگوں کے علاوہ انہوں نے وقت کے جن یگانۂ روزگار ائمہ حدیث سے استفادہ کیا، ان میں امام زہری، حضرت نافع، عمرو بن شعیب، میمون بن مہران، مجاہد، زید بن اسلم، صالح بن کیسان ایوب السختیانی وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت عطاءؒ کی طویل مصاحبت وملازمت کی وجہ سے ابن جریج ان کے علوم وفنون کے سب سے زیادہ معتبر ترجمان اور شارح سمجھے جاتے تھے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں "ابن جریج اثبت الناس فی عطاء" اور خود استاد کو بھی شاگرد پر بڑا اعتماد تھا۔ چنانچہ ان سے کسی نے پوچھا "ہم آپ کے بعد کس سے سوال کیا کریں؟" تو فرمایا "ابن جریج سے، اگر وہ زندہ رہیں، پھر فرمایا "ابن جریج اہل حجاز کے بہترین نوجوان ہیں" ابن المدینی کا بیان ہے "میں نے اسانید کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف چھ آدمیوں میں دائر سائر ہیں۔ ان میں ایک ابن جریج بھی ہیں۔" (۲)

امام ذہلی فرماتے ہیں "جب ابن جریج حَدَّثَنِی سَمِعْتُ کہیں تو ان کی حدیث قابل احتجاج ہے۔ ان کا شمار امام زہری کے اصحاب کے طبقۂ اولیٰ میں ہے" (۳) سلیمان ابن النضر کہتے ہیں "میں نے ابن جریج سے زیادہ کوئی شخص صادق اللہجہ نہیں دیکھا" یحییٰ بن سعید امام نقد وجرح ہیں وہ بھی انہیں "صدوق" مانتے ہیں۔ (۴)

تصنیف:

ابن جریج کے لئے یہ امر کچھ کم باعث فخر نہیں ہے کہ وہ ان بزرگان امت میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے تدوین احادیث کی خدمت انجام دی، اور احادیث کا جو ذخیرہ اب تک صرف زبانوں پر تھا وہ کتابوں کے سینہ میں محفوظ ہو گیا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "اسلام میں سب سے پہلے جنہوں نے تصنیف کی وہ ابن جریجؒ اور ابن ابی عروبہؒ ہیں۔" (۵) ابن خلکان میں ہے "انه اول من صنف الکتب فی الاسلام" (۶) حضرت عمر بن عبدالعزیز کی

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۴۔ (۳) ایضاً ص ۴۰۶۔

(۴) ایضاً ص ۴۰۴، ۴۰۵۔ (۵) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۹۷۔ (۶) ابن خلکان ج ۱ ص ۲۷۶۔

تحریک سے اس عہد میں علماء حدیث کو تدوین حدیث پر توجہ ہو چکی تھی مختلف مقامات کے ائمہ اعلام نے اپنے اپنے شہروں کی احادیث کو جمع کیا۔ ابن جریجؒ چونکہ حجاز میں تھے اس لئے انہوں نے اہل حجاز کی احادیث مدون و مرتب کیں انہوں نے جس کاوش اور محنت سے یہ عظیم الشان کام انجام دیا انہیں خود اس پر ناز تھا، چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا ''کسی نے میری طرح علم مدون نہیں کیا۔''

حضرت ابن جریج کو شروع سے یہ خیال رہتا تھا کہ وہ جو کچھ حاصل کریں اس کو اس طرح اپنی زندگی میں محفوظ کر جائیں کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ ولید بن مسلم بیان کرتے ہیں ''میں نے ایک مرتبہ امام اوزاعی اور دوسرے علماء سے پوچھا '' آپ نے علم کس کے لئے حاصل کیا ہے؟'' سب نے باتفاق جواب دیا ''اپنے نفس کے لئے'' اس مجمع میں صرف ایک ابن جریج ایسے تھے جنہوں نے فرمایا ''میں نے علم لوگوں کے لئے حاصل کیا ہے'' ان کی کتابیں گویا علم کی ایک گراں قدر امانت تھی جو وہ امت کے سپرد کر گئے تھے چنانچہ یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں ''ہم ابن جریجؒ کی کتابوں کا نام ''کتب الامانت'' رکھتے تھے''(۱) بعض لوگوں نے ان پر تدلیس کا الزام لگایا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بعض اوقات جس شیخ سے حدیث سنتے ہیں اس کا نام نہیں لیتے بلکہ اس شخص کا نام لے دیتے ہیں جس سے ان کے راوی نے حدیث سنی ہے، اور روایت میں صیغہ ایسا بولتے ہیں جس سے متبادر ہوتا ہے کہ خود انہوں نے اصل راوی سے حدیث کا سماع کیا ہے۔ اس بنا پر یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ ابن جریج اگر کسی روایت کو ''حَدَّثَنِی'' کہہ کر نقل کریں تو سمجھو کہ انہوں نے خود سماع کیا ہے، اور اگر وہ ''اخبرنی'' کہیں تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ انہوں نے اپنے شیخ پر حدیث کی قرأت کی ہے

لیکن جب وہ قال کہہ کر کسی حدیث کو بیان کریں تو وہ ہوا کے مشابہ ہے۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ محض ایک فنی گفتگو ہے ورنہ حضرت ابن جریج کی صداقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ حافظ ابن حجر جنہوں نے واقعہ بالا نقل کیا ہے وہ خود فرماتے ہیں ''وکان ثقة کثیر الحدیث''(۲) اور انہوں نے یحییٰ بن سعید کا بھی قول نقل کیا ہے: ''کان ابن جریج صدوقا''

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۵۔

فقہ:

ان کو فقہ میں بھی یکساں کمال حاصل تھا۔حافظ ذہبیؒ انہیں ''فقیہ الحرم'' کے معزز خطاب سے یاد کرتے ہیں، امام نووی تحریر کرتے ہیں ''تم یاد رکھو کہ ابن جریج ہمارے پرانے سلسلہ کے شیخ اور امام ہیں کیونکہ امام شافعی نے ایک واسطہ سے فقہ انہی سے حاصل کیا ہے''(۱)''ابن حبان کہتے ہیں ابن جریج اہل حجاز کے فقیہ، قاری، اور ثقہ لوگوں میں سے تھے۔''(۲)

قرأت:

قرأت میں بھی ان کو بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ حافظ ذہبی، عبدالرزاق کی روایت ہے لکھتے ہیں ''وہ قراء کے بادشاہوں میں سے تھے۔''(۳) ابن حبان کا قول ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

عبادت:

ان تمام علمی کمالات کے باوصف وہ نہایت درجہ عابدِ مرتاض تھے۔ جب نماز پڑھتے تھے تو پیکرِ خشوع وخضوع بن جاتے تھے۔عبدالرزاق کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر طریقہ پر کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔(۴) ابن عاصم کہتے ہیں ''ابن جریج بڑے عبادت گزار تھے وہ تین دن کے علاوہ ہمیشہ مہینہ بھر روزے سے رہتے تھے۔ان کے فیضانِ صحبت سے ان کی بیوی بھی بڑی عابدہ ہوگئی تھیں۔''(۵)

سخاوت:

اس کے ساتھ ہی نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دست تھے۔ایک مرتبہ ان کے پاس ایک سوال کرنے والا آیا۔آپ نے بے تکلف اس کو ایک دینار عطا فرمادیا۔(۶)

نفاست طبع:

خوشبو کا اکثر استعمال کرتے تھے، شروع میں سیاہ خضاب استعمال کرتے تھے پھر اسے ترک کرکے سرخ خضاب استعمال کرنے لگے تھے۔(۷)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج۲ص ۲۹۸۔ (۲) تہذیب التہذیب ج۶ ص ۴۰۶۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۶۲۔
(۴) تہذیب الاسماء ج۲ص ۲۹۷۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۶۲۔ (۶) ایضاً (۷) تذکرۃ الحفاظ وشذرات الذہب۔

رقت طبع:

طبعاً نہایت زود انفعال اور سریع التاثر تھے۔ایک مرتبہ یمن میں معن بن زائدہ کے ساتھ قیام پذیر تھے کہ عمر بن ابی ربیعہ کے مندرجہ ذیل دوشعران کو یاد آ گئے:

بالله قولی له من غیر معتبة
ماذا اردت بطول المکث فی یمن
ان کنت حاولت دینا او نعمت بها
فما وجدت لترک الحج من ثمن

فوراً حج کا عزم کرلیا،اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔(۱)

وفات:

۱۰ ذی الحجہ ۱۵۰ھ میں ستر سال کی عمر پا کر وفات پائی۔اخیر عمر میں بصرہ میں فروکش ہو گئے تھے اور یہیں درسِ حدیث کا شغل رکھتے تھے۔''(۲)

علی بن مسہر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

علی نام،ابوالحسن کنیت والد کا نام مسہر تھا،کوفہ کے رہنے والے تھے اور قریش سے غلامی کا تعلق رکھتے تھے۔(۳)

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے جلیل المرتبت، تبع تابعین میں سے ہیں۔انہوں نے حدیث کا سماع اسماعیل بن ابی خالد،ابواسحاق الشیبانی،محمد بن قیس،داؤد بن ابی ہند،اعمش ،ہشام بن عروہ، ابو مالک الاشجعی رحمہم اللہ سے کیا تھا۔خود ان سے ایک جماعت کثیر نے احادیث سنیں،ان میں سے چند نام یہ ہیں: زکریا بن عدی،اسماعیل بن الخلیل، خالد ابن المخلد ،ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہم۔

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ص ۲۲۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۶۱۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۲۶۷۔

ثقاہت:

علامہ نووی فرماتے ہیں ''ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے ان کی روایتوں کی تخریج کی ہے [1] امام احمد انہیں صالح الحدیث اور ابو معاویہ سے زیادہ ثبت وثقہ بتاتے ہیں [2] عثمان دارمی کا بیان ہے، ''میں نے مشہور نقادِ رواۃ حضرت یحییٰ بن معین سے پوچھا ''آپ کو علی بن مسہر زیادہ محبوب ہیں یا ابو خالد الاحمر؟'' فرمایا ''ابن مسہر'' پھر دریافت کیا ''اچھا! ابن مسہر زیادہ محبوب ہیں یا اسحٰق بن الارزق؟'' جواب دیا ''ابن مسہر'' پھر دریافت کیا ''اور ابن مسہر اور یحییٰ بن ابی زائدہ ان دونوں میں آپ کس کو ترجیح دیتے ہیں؟'' ارشاد ہوا ''دونوں ثقہ ہیں۔'' [3]

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال تھا۔ احمد العجلی فرماتے ہیں، وہ حدیث وفقہ دونوں کے جامع تھے۔ [4]

قضا:

مہارت فقہ کے باعث ہی انہیں ارمینیہ کا عہدۂ قضا دیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ان کے ساتھ ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ ارمینیہ کے عہد قضا میں ایک مرتبہ ان کی آنکھیں آشوب کر آئیں وہ ایک معالج چشم کے پاس گئے۔ ان سے پہلے جو شخص یہاں کا قاضی تھا اس نے ازراہ رشک وحسد اس معالج کو معقول رقم دے کر کہا ''ان کو نابینا بنادے'' یہ کمبخت روپیہ کے لالچ میں آ گیا اور اس نے علاج کے بہانہ ان کو نابینا کر دیا۔ چنانچہ وہ کوفہ تشریف لائے تو ان کی قوت بینائی سلب ہو چکی تھی، [5] لیکن ان کا حافظہ اس درجہ قوی تھا کہ وہ اس واقعہ کے بعد اپنے حفظ سے کام لے کر احادیث روایت کرتے تھے۔ ''علامہ ابن سعد انہیں ثقہ، کثیر الحدیث بتاتے ہیں، [6] حافظ ذہبی انہیں **الامام الحافظ** لکھتے ہیں۔'' [7]

وفات:

۱۸۹ھ میں وفات پائی۔ ابن میر کا بیان ہے کہ وہ مع اپنی کتابوں کے دفن کئے گئے۔ [8]

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۱ص ۳۵۱۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۳۸۳۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۳۸۳۔
(۴) شذرات الذہب ج ۱ص ۳۲۵۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۲۶۸۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۳۸۴۔
(۷) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۲۶۷۔ (۸) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۳۸۳۔

ابو معشر السندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

نام نجیح، کنیت ابو معشر اصل کے اعتبار سے حمیری تھے، مدینہ میں رہتے تھے، اس لئے مدنی کہلاتے ہیں۔ والد کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ابو معشر بنو ہاشم کے غلام تھے۔ ان کی غلامی کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یزید بن مہلب اور یزید بن عبدالملک میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں وہ یمامہ میں گرفتار کر لئے گئے تھے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ بچپن میں ان کو کوئی چرا لایا اور مدینہ میں فروخت کر دیا۔ بعد میں ام موسیٰ بن المہدی نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔[1]

علم:

حافظ ذہبی انہیں "الفقیہ صاحب المغازی" لکھتے ہیں، اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں "وکان من اوعیۃ العلم" وہ علم کا ظرف تھے۔[2]

حدیث:

حدیث میں انہوں نے سعید بن المسیب، محمد بن کعب القرظی، ابو بردۃ بن ابی موسیٰ الاشعری، ہشام بن عروہ، موسیٰ بن یسار، نافع، ابن المکندر، اور محمد بن قیس وغیرہم سے روایت کی ہے۔ خود ان سے بہتیرے لوگوں نے روایت کی جن میں خود ان کے فرزند محمد، عبدالرزاق، ابو نعیم، محمد بن بکار، منصور بن ابی مزاحم شامل ہیں۔

اخیر عمر میں وہ چند در چند بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ بسا اوقات ریح خارج ہو جاتی تھی اور انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس بنا پر اں کا حافظہ بھی خراب ہو گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن معینؒ اور یحییٰ بن سعید القطان نے ان کو ضعیف الروایۃ اور ناقابل استناد قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی بھی ان کو ناقص الحافظہ بتاتے ہیں[3] پھر غالباً وہ اُمّی بھی تھے یعنی لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔[4]

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۱۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶۔ (۳) ایضاً۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۱۔

تاہم حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ذہبیؒ نے بعض اقوال ایسے نقل کیے ہیں جن سے ان کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "کان بصیرا بالمغازی صدوقا" یزید بن ہارون کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ ابو جزء نصر بن طریف سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ ابو معشر زمین و آسمان کی تمام مخلوق سے زیادہ جھوٹے ہیں۔ لیکن انجام کار ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یزید کو پست و خوار کر دیا۔ اور ابو معشر کو رفعت عطا فرمائی" ابو زرعۃ الدمشقی نعیم سے نقل کرتے ہیں کہ ابو معشر بڑے عاقل اور حافظ تھے، ہشیم کا بیان ہے کہ میں نے کوئی مدنی نہ ان کے مشابہ دیکھا اور نہ ان سے زیادہ عقلمند پایا۔"(1) حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں "امام نسائیؒ نے ان سے استشہاد کیا ہے۔" البتہ امام احمد بن حنبل اور دوسرے اکابر حدیث نے کہا ہے کہ وہ اسناد صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور اسی بنا پر لقب بالضد کے طور پر ان کو "السندی" کہا جاتا تھا۔

بہر حال ابو معشر احتجاج کے قابل ہوں یا نہ ہوں اور ان کا مرتبہ اسناد کے بارہ میں کچھ ہی ہو، اسلام نے غلاموں کو سماجی معاملات میں آزادوں کے ساتھ جو برابری دی ہے اس کے اثبات کے لئے یہی کیا کم ہے کہ ابو معشر ان تمام اور سخت تنقیدات کے باوجود دربار خلافت میں بڑے عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے، مہدی جب عراق گیا تو انہیں بھی ہمراہ لے گیا، اور ان کو ایک ہزار دینار دلوائے اور ان سے کہا کہ آپ یہیں ہمارے دربار میں رہئے تاکہ ہمارے اردگرد جو لوگ ہیں وہ آپ سے فقہ حاصل کر سکیں۔"(2)

لکنت:

زبان میں لکنت بھی تھی محمد بن کعب کو محمد بن قعب کہتے تھے۔

حلیہ:

سفید فام تھے۔ آنکھیں نیلگوں تھیں اور فربہ اندام تھے۔

وفات:

رمضان ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱۰ ص ۴۲۰۔ (۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۸۷۔

عبدالعزیز بن عبداللہ الماجشون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبدالعزیز نام، کنیت ابوعبداللہ یا ابوالاصبغ، والد کا نام میمون تھا، اور کنیت ابوسلمہ اصل میں فارس کے رہنے والے تھے ان کے رخسار شراب کی طرح سرخ تھے اس لئے انہیں ''میگوں'' کہا جاتا تھا جس کو اہل مدینہ نے بگاڑ کر ''ماجشون'' کر دیا[1] ابوسلمہ آل ہدیر کے غلام تھے۔

علم وفضل:

عبدالعزیز علم وفضل کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے حافظ ذہبی انہیں **الامام العلم** لکھتے ہیں اور آگے چل کر فرماتے ہیں ''وہ علماء ربانیین میں سے تھے۔''[2] ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ ''ماجشون علماء ربانیین اور فقہاء منصفین میں سے ہیں۔''[3]

حدیث:

انہوں نے حدیث میں امام زہری، محمد بن المنکدر، زید بن اسلم، عبداللہ بن دینار، صالح بن کیسان، یحییٰ بن سعید الانصاری، ہشام بن عروہ، وہب بن کیسان رحمہم اللہ اور بعض دوسرے ائمۂ حدیث سے استفادہ کیا تھا۔ خود ان سے جن لوگوں نے روایت کی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چند اسماء یہ ہیں۔ لیث بن سعد، ابن وہب، زبیر بن معاویہ، ابن مہدی، وکیع، ابوعامر العقدی، ابوداؤد الطیالسی، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں ''عبدالعزیز الماجشون ثقہ اور حدیث کی کثرت سے روایت کرنے والے تھے۔'' لیکن وہ شروع شروع میں حدیث کی روایت سے گریز کرتے تھے۔ جب بغداد میں لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے باقاعدہ حدیث کا درس شروع کر دیا۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ ''اہل بغداد نے مجھ کو محدث بنا دیا'' اور یہی وجہ ہے کہ ابن سعد لکھتے ہیں ''ان سے اہل عراق نے بہ نسبت اہل مدینہ کے زیادہ روایت کی ہے'' امام ابوداؤد، نسائی، ابوزرعہ اور ابوحاتم سب ان کو صدوق اور ثقہ بتاتے ہیں۔[4]

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶۔
(۳) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۵۹۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۴۴۔

فقہ:

انہیں فقہ میں بھی بڑا کمال تھا۔ حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، اور ابن عماد الحنبلی انہیں فقیہ لکھتے ہیں۔ اہل حرمین کے مسلک کی شدت کے ساتھ پیروی کرتے تھے اور اس کے بڑے زبردست حامی تھے۔ (1)

فتویٰ:

اس کمال تفقہ کے باعث افتاء میں وہ لوگوں کے مرجع تھے یہاں تک کہ ابن وہب بیان کرتے ہیں ''میں نے حج کے وقت ایک منادی کو سنا جو کہہ رہا تھا کہ امام مالک اور ابن الماجشون کے سوا کوئی شخص فتویٰ نہ دے۔'' (2)

فراست وفرزانگی:

معاملہ فہمی اور امور سیاست میں بھی نہایت زیرک اور عقلمند تھے۔ ابوالولید الطیالسی کہتے ہیں ''ابن الماجشون وزارت کی صلاحیت رکھتے تھے۔''

خلفاء میں وقعت:

ان کمالات کے باعث خلفاء ان کی بڑی توقیر اور تعظیم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابوجعفر المنصور حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو مہدی دور تک اس کی مشایعت کے لئے گیا۔ جب رخصت ہونے لگا تو ابوجعفر نے کہا'' بیٹے میرے لئے ایک ہادی تلاش کر کے بھیج دینا'' مہدی نے جواب دیا'' میں آپ کے پاس بطور ہادی کے ایک ایسے شخص کو بھیجوں گا جو بڑا عقلمند اور فرزانہ ہے۔'' اس کے بعد اس نے حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمۃ الماجشون کو بھیج دیا۔ (3)

شاعری:

معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے لیکن جب کہتے تھے نہایت خوب کہتے تھے۔ ایک دفعہ ابن الماجشونؒ مہدی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ مہدی نے پوچھا'' آپ نے اپنے ان مرحوم دوستوں کی یاد میں بھی کچھ کہا ہے جو فقیہ روزگار تھے اور اب وہ دنیا میں نہیں ہیں؟''

---

(1) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۴۴۔ (2) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶۔ (3) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۷۔

ابن الماجشون بولے ''ہاں'' اور یہ اشعار سنائے:

''ایا باک علیٰ احبابہ جزعًا
قد کنت احذر ذامن قبل ان یقعا
ان الزمان رای الف السرور بنا
فدت بالھجر فیما بیننا وسعیٰ
ماکان واللہ شؤم الدھر یترکنی
حتیٰ یجرعنی من غیظہٖ جرعًا
ولیضع الدھر بی ماشاء مجتھدًا
فلا زیادۃ شیٔ فوق ماصنعا''

ترجمہ: ''اے دوستوں کی موت پر بے تحاشا رونے والے، سن! میں بھی اسی حادثہ کے نازل ہونے سے قبل ڈرتا تھا۔ زمانہ نے جب یہ دیکھا کہ ہم سب احباب ایک جگہ ہونے کی وجہ سے باہم بہت مانوس ہیں تو اس نے ہجر کو ہمارے درمیان دوڑا دیا اور اس نے اس میں بڑی دوڑ دھوپ کی۔ بخدا زمانہ کی بدنصیبیاں میرا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑیں گی جب تک کہ وہ اپنے غیظ وغضب کو گھونٹ گھونٹ کر کے مجھ کو نہیں پلا دیں گی۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ اچھا! زمانہ میرے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ کر گزرے، اس نے اب تک میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر اب کسی چیز کی کیا زیادتی ہو سکتی ہے۔''

مہدی نے ان اشعار کو سن کر کہا ''بخدا میں آپ کو اب غنی بنادوں گا۔'' چنانچہ اس نے انہیں دس ہزار دینار دینے کا حکم دیا۔ ابن الماجشونؒ انہیں لے کر بغداد چلے آئے۔ (لیکن ان کے صاحبزادے نے اپنے والد کے اوصاف وخصائص دیکھ کر جود وعطا کی جو خو پیدا کر لی تھی اس کا) نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے وہ سب دینار تقسیم کر کے خرچ کر دیئے''(۱)

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۷، ۴۳۸۔

زہد وورع:

علم وفضل کے ساتھ ان کے عملی کمالات بھی قابل ذکر ہیں، وہ نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ احمد بن صالح کہتے ہیں "كان نزها صاحب سنة ثقة" علامہ ابن سعد انہیں "ورع" بتاتے ہیں۔[1]

حسن وجمال:

قدرت نے جس طرح ان کو معنوی اور باطنی محاسن عطا کرنے میں فیاضی سے کام لیا تھا ان کو حسن ظاہری کی دولت بھی بافراط عطا کی گئی تھی۔ زبیر کا بیان ہے "وكان مع نباهته بارع الجمال" وہ اپنی شرافت کے باوصف نہایت حسین وجمیل تھے۔"[2]

تصنیفات:

وہ صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے۔ علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "ان کی "احکام" میں چند کتابیں بھی ہیں"[3] حافظ ذہبی احمد بن کامل کا قول نقل کرتے ہیں "ان کی تصنیف کی ہوئی چند کتابیں بھی ہیں جن کو ان سے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔"[4]

وفات:

ان کی وفات کے سلسلہ میں ان کے صاحبزادہ نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہتے ہیں "میرے والد کی روح جسم سے پرواز کر گئی تو ہم سب نے ان کو غسل کے لئے ایک تخت پر لٹا دیا۔ اتفاق کی بات غسل دینے والا جب غسل دے رہا تو اس نے ان کے تلوے میں ایک رگ دیکھی جو پھڑک رہی تھی، اس نے یہ واقعہ لوگوں کے سامنے بیان کیا، سب کی رائے ہوئی کہ اس وقت غسل دینا ملتوی کر دیا جائے۔ دوسرے دن بھی جب غسل دینے کا اہتمام کیا گیا یہی صورت پیش آئی۔ غرض اسی طرح تین دن گزر گئے اس کے بعد ابن الماجشون یکا یک اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور لوگوں سے ستو طلب کیا، ان کے ارشاد کی فوراً تعمیل کی گئی۔ ستو پی چکے تو

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۴۴۔ (۲) ایضاً ص ۳۴۵۔

(۳) خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۹۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶۔

لوگوں نے کہا ''آپ پر ان تین دنوں میں جو کچھ واردات گزری ہے، اس کی تھوڑی بہت روئیداد ہم کو بھی سنائیے۔ انہوں نے بطیبِ خاطر اس درخواست کو منظور کرلیا اور یوں واقعہ بیان کیا ''میری روح کو فرشتہ لے کر روانہ ہوا تو اس نے آسمانِ دنیا کو عبور کیا، اور اسی طرح گزرتا ہوا ساتویں آسمان تک پہنچ گیا، وہاں اس فرشتہ سے پوچھا گیا ''تمہارے ساتھ کون ہے؟'' فرشتہ بولا ''الماجشون'' کہا گیا ''ابھی تو ان کی عمر میں اتنے برس، اتنے مہینے، اتنے دن اور اتنے گھنٹے باقی ہیں۔ تم ان کو ابھی سے کیوں لے آئے۔'' اس کے بعد فرشتہ نے مجھ کو لے کر نیچے اترنا شروع کردیا، یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ان کی دائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، اور بائیں جانب حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تشریف رکھتے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے فرشتہ سے دریافت کیا کہ یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھے ہیں کون ہیں؟ جواب ملا عمر بن عبدالعزیزؒ'' میں نے کہا ''یہ تو سرور کونین سے بہت زیادہ قریب ہیں'' فرشتہ نے کہا ''یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ظلم و جور کے زمانہ میں حق پر عمل کیا اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی حق کے زمانہ میں حق پر عمل کیا۔'' (۱)

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو حضرت ابن الماجشون کو اس کے بعد دنیا میں چند دنوں اور رہنے کی مہلت مل گئی آخرکار وہ وقت آ ہی گیا جو سب کے لئے مقدر ہے اور جس سے کائنات عالم کی کوئی ایک چیز بھی مستثنیٰ نہیں۔ ۱۶۴ھ میں جبکہ وہ مدینہ سے واپس آکر بغداد میں قیام پذیر تھے، وفات پائی۔ ان کے جنازہ میں خلیفۂ وقت مہدی خود شریک تھا اس نے ہی نماز میں امامت کی، قریش کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔ (۲)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۵۹۔ (۲) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۸۔

علی بن المدینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

علی نام، ابوالحسن کنیت، والد کا نام عبداللہ تھا جو خود بھی بڑے پایہ کے محدث تھے۔ قبیلۂ بنوسعد بن بکر کے ایک شخص عروہ بن عطیہ کے غلام تھے، مدینہ کے رہنے والے تھے مگر ایک روایت ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے۔ (۱)

پیدائش:

۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ (۲)

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار اکابرِ علم وکمال میں ہوتا ہے، علامہ نوویؒ لکھتے ہیں ''تمام لوگ ان کی جلالت شان، امامت، کمال اور دوسروں پر ان کی فوقیت پر متفق ہیں۔'' (۳)

حافظ ذہبی کا ارشاد ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حافظ اور ارباب علم وفضل کے پیشوا تھے۔ ان کی عظمت وبرتری کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ جیسے بلند پایہ امامِ وقت ان کا نام ازراہِ احترام نہ لیتے بلکہ انکی کنیت سے انہیں یاد کرتے تھے امام بخاریؒ آسمانِ علم کے مہر درخشاں ہیں لیکن وہ بھی فرماتے ہیں کہ ''میں نے اپنے آپ کو کبھی کسی سے کم نہیں سمجھا۔ البتہ علی بن المدینی اس سے مستثنیٰ ہیں۔'' (۴)

حدیث:

خاص حدیث میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ ابو حاتم الرازی کہتے ہیں ''ابن مدینی حدیث اور علل کی معلومات میں سب سے نمایاں تھے'' عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے کہ ''وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ خصوصاً حضرت سفیان بن عیینہؒ کی احادیث کے بڑے حافظ تھے۔'' (۵)

---

(۱) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۵۰۔ (۲) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۵۹۔ (۳) تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۵۰۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶۵۔ (۵) ایضاً۔

اس فن میں ان کی مہارت، وسعت نظر اور صحیح قوتِ فیصلہ کا یہ عالم تھا کہ حضرت سفیان بن عیینہؒ جو ان کے استاذ و شیخ اور خود بھی جلیل القدر محدث تھے، اپنے شاگرد حضرت علی بن المدینیؒ سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس معاملہ میں بعض لوگ ان پر معترض ہوتے تھے تو فرماتے تھے ''تم لوگ مجھ کو علی کی محبت پر ملامت کرتے ہو۔ بخدا انہوں نے مجھ سے جس قدر علمی فیض حاصل کیا ہے اس سے زیادہ میں نے ان سے فیض اٹھایا ہے۔''(۱) یحیٰ بن سعید القطانؒ بھی فرماتے تھے۔ ''انا اتعلم من علی اکثر مما یتعلم منی.'' امام نسائی کا مقولہ ہے کہ ''حضرت علیؒ پیدا ہی اس غرض کے لئے کئے گئے تھے۔''(۲)

مختلفاتِ حدیث کا علم بہت وسیع تھا، امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ حضرت علی بن المدینیؒ اس باب میں امام احمد سے بھی بڑے عالم تھے۔(۳)

شیوخ:

حضرت ابن مدینیؒ نے بے شمار حضرات سے سماع حدیث کیا تھا۔ ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں: ان کے والد ماجد عبداللہ بن جعفر، حماد بن زید، جعفر بن سلیمان، عبدالعزیز الدراوردی، معتمر بن سلیمان، سفیان بن عیینہ، ولید بن المسلم، بشر بن المفضل، یحیٰ بن سعید القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوداؤد الطیالسی، ہشام بن یوسف، یزید بن زریع رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تلامذہ:

جن اربابِ علم وشریعت نے ان سے روایت کی ان میں امام احمد بن حنبل، صالح ابن احمد، محمد بن یحیٰ الذہلی، فضل بن سہل الاعرج، محمد بن اسحاق الصاغانی، محمد بن اسماعیل البخاری، ابو حاتم الرازی شامل ہیں رحمہم اللہ تعالیٰ۔(۴)

ثقاہت:

ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام بخاریؒ ''جزء رفع یدین'' میں فرماتے ہیں ''کان اعلم عصرہ'' ابن حبان فرماتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے۔'' حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) خطیب بغدادی ج ۱۱ص ۴۵۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۱۵۔ (۳) ایضاً۔

(۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۱ص ۴۵۸۔

کے علل کے بڑے علماء میں سے تھے۔ انہوں نے سفر کیا، حدیثیں جمع کیں، ان کو لکھا، ان پر کتابیں تصنیف کیں، پھر ان سے متعلق مذاکرہ کیا، اور انہیں محفوظ رکھا۔'' ابو جعفر العقیلی کہتے ہیں ان کی حدیث درست ہے'' امام نسائی فرماتے ہیں'' وہ معتبر ہیں، مامون ہیں، اور حدیث کے اماموں میں سے ہیں'' ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ابوزرعہ فرماتے تھے'' ان کی سچائی میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا'' جعفر بن احمد کہتے ہیں'' میں نے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو روانگی سے قبل ابن معین سے پوچھا'' میں کس کس سے روایت کروں؟ اس کے ساتھ ہی میں نے چند بزرگوں کے نام لئے یحیٰی بن معین خاموش بیٹھے ہوئے سنتے رہے۔ جب میں نے حضرت علی بن المدینی کا نام لیا تو بولے '' اگر وہ تم سے کوئی حدیث بیان کریں تو تم اس کو لکھ لینا وہ سچے ہیں۔''(۱)

درس:

ان کی علمی شہرت و کمال کی وجہ سے دور دور کے لوگ ان کے درس میں شریک ہونے کے آرزومند رہتے تھے۔ امام نووی لکھتے ہیں'' علی بن المدینی بغداد میں تشریف لاتے تھے تو وہاں ان کے درس کا ایک وسیع حلقہ قائم ہوجاتا تھا۔ جس میں امام احمد بن حنبلؒ اور یحیٰی بن معینؒ ایسے فاضلِ امت شرکت کرتے تھے اس درس میں شریک ہوکر امام احمد، حضرت یحیٰی بن معین، خلف، اور معیطی، مختلف مسائل پر مذاکرہ بھی کرتے تھے جب اختلاف شدید ہوجاتا تو پھر حضرت ابن مدینیؒ کلام شروع کرتے تھے۔''(۲)

ایک شخص نے امام بخاریؒ سے دریافت کیا'' اس وقت آپ کی آرزو کیا ہے؟'' فرمایا میری تمنا یہ ہے کہ میں عراق جاؤں وہاں علی بن المدینی حیات ہوں اور ان کے ساتھ مجالست کروں۔''(۳)

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال تھا حضرت سفیان بن عیینہؒ سے کوئی شخص کسی مسئلہ پر فتویٰ پوچھتا تو انہیں فوراً حضرت ابن مدینیؒ یاد آجاتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ اکثر فرمایا کرتے تھے **''لو كان حية الوادى معنا''** عربی زبان میں حیۃ الوادی بہ طور استعارہ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی سلسلہ کے لوگوں کے لئے سب سے بڑا امید کا سہارا اور پناہ کی جگہ ہو۔''(۴)

---

(۱) یہ سب اقوال تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۵۶ و ۳۵۷ سے ماخوذ ہیں۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۵۱۔

(۳) خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۶۱۔ (۴) اساس البلاغۃ للزمخشری ج ۱ ص ۲۱۲۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقہ کی موشگافیوں میں زیادہ مشغول رہنا پسند نہیں کرتے تھے ان کے اصحاب میں سے کسی نے ان سے کہا کہ اگر آپ فقہ کی طرف متوجہ ہوں تو کتنی اچھی بات ہے؟'' جواب دیا ''اگر میں اس میں مشغول ہو گیا تو اب جو کام کر رہا ہوں وہ نہیں کر سکوں گا۔'' (۱)

جلالت شان:

قدرت کی نظرِ انتخاب کسی سعادت مند کے سر پر اقلیمِ علم کی کشور کشائی کا تاج زرفشاں رکھتی ہے تو اسے لوگوں میں اس درجہ ہردلعزیز اور محبوب بنا دیتی ہے کہ لوگ اس کی ایک ایک نقل و حرکت قلمبند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؒ کے ساتھ مسلمانوں کو جو عام گرویدگی اور شیفتگی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا، لباس، قول و فعل غرض یہ ہے کہ ہر چیز لکھی جاتی تھی۔ بڑے بڑے ائمۂ وقت ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتے تھے اعینؒ کا بیان ہے کہ ''میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن مدینی کو دیکھا کہ لیٹے ہوئے تھے اور ان کے دائیں جانب امام احمدؒ اور بائیں جانب یحییٰ بن معینؒ تشریف رکھتے تھے۔ اسی حالت میں علی بن مدینی کچھ املاء کراتے جاتے اور یہ دونوں بزرگ اسے لکھتے جاتے تھے۔'' (۲) حضرت سفیان بن عیینہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ تقریباً ساٹھ برس سے وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے اور اپنے تلامذہ کے لئے مجلس درس منعقد نہیں کرتے تھے۔ لیکن حضرت ابن مدینی کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی۔ وہ خود لوگوں کو خطاب کر کے فرماتے تھے ''اگر علی نہ ہوتے تو میں کبھی تمہارے لئے مجلس میں نہ آتا'' (۳) حفص بن محبوب الخزاعی کا بیان ہے کہ ''میں ایک مرتبہ حضرت سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ان کے پاس حضرت علی بن المدینی بھی تشریف رکھتے تھے۔ اور ابن شاذ کونی بھی اس مجلس میں شامل تھے۔ علی اٹھ کر جانے لگے تو سفیان بھی اٹھ گئے اور یہ فرمایا **"اذا قامت الخیل لم نجلس مع الرجالة"** جب سوار کھڑے ہو گئے تو اب ہم پا پیادہ لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھے رہیں گے۔'' (۴)

طلبِ علم میں سفر:

تحصیلِ علم کے شوق میں وہ کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں کرتے بلکہ شہر بشہر سفر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بصرہ سے یمن کے لئے روانہ ہوئے اور تقریباً تین سال تک

---

(۱) خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۶۱۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۵۱۔

(۳) خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۵۹۔ (۴) ایضاً ص ۴۵۹ و ۴۶۰۔

یہاں واپس نہ آئے۔ ان کی والدہ ماجدہ اس وقت حیات تھیں۔ واپس تشریف لائے تو انہوں نے کہا ”بیٹے! میں نے معلوم کرلیا ہے کہ فلاں تمہارا دوست ہے اور فلاں تمہارا دشمن“ حضرت علیؒ بولے ”اماں! آپ کو یہ کس طرح پتہ چلا“ کہنے لگیں ”تمہاری غیر موجودگی میں فلاں فلاں شخص جن میں یحییٰ بن سعیدؒ بھی شامل تھے، میرے پاس آتے تھے اور طرح طرح سے مجھ کو دلاسادے کر کہتے تھے ”آپ گھبرائیں نہیں علی واپس آئیں گے تو اس شان سے آئیں گے کہ آپ انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو جائیں گی“ ان لوگوں کی گفتگو سے میں نے محسوس کرلیا کہ یہ واقعی تمہارے محب اور مخلص دوست ہیں۔ ان کے برخلاف میرے پاس بعض شخص ایسے آتے تھے جو کہتے تھے ”آپ اپنے بیٹے کو بلانے کا تاکیدی خط کیوں نہیں لکھتیں کہ وہ جلد واپس آجائیں“ ان کی اس گفتگو سے میں سمجھتی تھی کہ یہ تمہارے دشمن ہیں۔“(۱)

علم میں انہماک:

انہیں دن رات علم میں انہماک رہتا تھا۔ یہاں تک کہ سوتے سوتے اگر کوئی حدیث یاد آجاتی تھی تو فوراً لونڈی کو چراغ جلانے کا حکم کرتے، اور چراغ روشن ہو جاتا تو اپنی کتاب میں اس حدیث کو تلاش کرتے تھے۔“(۲)

کتابت:

وہ جو کچھ سنتے تھے اس پر اچھی طرح سے تنقید کرتے تھے خود ان کا بیان ہے کہ میں نے تقریباً ایک لاکھ حدیثیں ترک کردیں جن میں سے تیس ہزار حدیثیں عباد بن صہیب کی روایت کی ہوئی تھیں۔“(۳) پھر معیارِ تنقید پر پرکھنے کے بعد جو حدیثیں انہیں صحیح اور کھری معلوم ہوتی تھیں قیدِ تحریر میں لے آتے تھے۔ لکھتے لکھتے ان کے پاس اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ ایک الماری بھر گئی، لیکن افسوس ہے یمن کے سفر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے اس الماری کو کھولا تو انہیں یہ دیکھ کر بے انتہا صدمہ ہوا کہ ان کی اب تک کی زندگی کا جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب خاک کے ذروں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس موقع پر خود حضرت ابن مدینی کا بیان یہ ہے کہ **”فلم انشط بعد لجمعه“** اس کے بعد مجھ کو ضائع شدہ سرمایہ کے جمع کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔“(۴)

---

(۱) خطیب بغدادی ج ۱۱ص ۴۵۹۔ (۲) بغدادی ج ۱ص ۴۶۳۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۳۵۲۔

(۴) تاریخ بغدادی ج ۱ص ۴۶۲۔

خلقِ قرآن کا فتنہ اور ابن مدینی کا ابتلاء:

جیسا کہ تصریحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے، حضرت ابن مدینی کے فضل و کمال اور مہارتِ علم و فن میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر صاحب علم و فضل ارباب عزیمت میں سے بھی ہو۔ اور ایک جزئی سے جزئی مسئلہ کے لئے بھی طوق و سلاسل کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، اور اگر ایسا ہوتا تو پھر امام احمد بن حنبلؒ اور وقت کے دوسرے ائمہ کے علم و فن میں فرق ہی کیا رہتا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر بو الہوس کے واسطے دار و رسن کہاں

چنانچہ خلیفۂ بغداد معتصم باللہ کے عہد میں خلق قرآن کی بحث کا جو فتنہ پیش آیا اس میں علی بن مدینیؒ اپنی علمی جلالت شان کے باوجود اپنے آپ کو حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی طرح میدانِ عزیمت و ہمت کا مردِ نبرد پیشہ ثابت نہ کر سکے۔ اس کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ معتصم باللہ نے امام احمد بن حنبل کو بلا کر پوچھا ''میں نے سنا ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، حالانکہ آنکھ تو کسی محدود چیز پر ہی واقع ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے، تو کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل موجود ہے؟'' امام نے فرمایا ''ہاں! اے امیر المومنین، میری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں ''تم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کا دیدار اسی طرح کرو گے جس طرح چودھویں رات میں ماہ شب چار دہم کو دیکھتے ہو'' یہ روایت سننے کے بعد خلیفہ نے احمد بن ابی داؤد کی طرف رخ کیا جس نے امام احمد بن حنبلؒ کی چغلی کھائی تھی۔ اور پوچھا ''احمد بن ابی داؤد! بتاؤ تمہیں اس روایت پر کوئی اعتراض ہے؟'' ابن ابی داؤد بولا ''مجھ کو ذرا مہلت دیجئے کہ میں اس روایت کی اسناد کو جانچ لوں'' چنانچہ وہ گھر واپس آیا اور یہاں اس نے فوراً علی بن مدینی کو بلا کر دریافت کیا کہ آپ کو اس روایت میں کوئی قابل اعتراض بات نظر آتی ہے؟'' ابن مدینی نے انکار کر دیا اور کہا ''کہ مجھ کو تو آپ اس سے معاف ہی رکھئے۔ ابن ابی داؤد بڑا شاطر تھا۔ بولا ''دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر علی بن مدینی کو بہت کچھ زرِ نقد، سواری اس کے تمام ساز و سامان کے، کپڑے اور عطریات وغیرہ بھی دیئے۔ اب علی بولے ''ہاں! اس روایت میں ایک نقص یہ ہے کہ اس کی اسناد میں ایک

راوی قیس بن ابی حازم ہے۔ یہ شخص کھڑا ہو کر پیشاب کرتا تھا جو علامت فسق ہے'' ابن ابی داؤد یہ سنتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ ابن مدینی کو بوسہ دیا، اور انہیں گلے سے لگا لیا۔ اور دوسرے دن بارگاہ خلافت میں جا کر کہہ دیا کہ امام احمد بن حنبل جس روایت سے استدلال کرتے ہیں وہ قیس بن ابی حازم ایسے غیر ثقہ راوی کی وجہ سے نا قابل استناد ہے۔ معتصم کو بہانہ ہاتھ آ گیا اس نے امام عالی مقام کو کوڑوں سے مارنے کا حکم دے دیا۔

علامہ خطیب بغدادی اس پورے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس کو نا قابل اعتبار قرار دیتے ہیں اور اس پر دو نقض وارد کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ جن لوگوں نے امام احمد بن حنبلؒ کے ابتلاء کا واقعہ بیان کیا ہے ان میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے خلقِ قرآن کی بحث کے ضمن میں یہ کہا ہو کہ معتصم کے سامنے امام سے رؤیت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں مناظرہ ہوا۔ دوسرا نقض یہ ہے کہ حضرت ابن مدینیؒ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ قیس بن ابی حازم کو کھڑے ہو کر پیشاب کرنے والا کہتے تھے، سراسر بہتان اور افترا ہے۔ کیونکہ انہوں نے خود ان سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں وہ ان کو معتبر تابعی سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قیسؒ نے حضرت ابوبکر عمر، عثمان، علی، سعد بن ابی وقاص، زبیر، طلحہ، مغیرہ بن شعبہ، ابو مسعود البدری اور خباب بن ارت رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے اجلہ صحابہؓ سے شرفِ سماع حاصل کیا ہے۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس اعتراف فضیلت کے باوجود وہ ان کی شان میں اس طرح کے گستاخانہ الفاظ کہیں۔ علامہ بغدادی ان دو نقطوں کے بعد اپنی رائے لکھتے ہیں کہ ''اگر مندرجۂ بالا صحیح ہے تو یہ کہنا چاہئے کہ ابن ابی داؤد نے از خود قیس بن ابی حازم پر یہ اعتراض کیا اور اس کو وقیع بنانے کے لئے خواہ مخواہ حضرت ابن مدینی کی طرف منسوب کر دیا۔ (۱)

ہماری رائے میں علامہ بغدادی کے خیال کے مطابق یہ واقعہ ہی سرے سے من گھڑت ہے لیکن اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ خلق قرآن کے فتنہ میں ابن مدینی کی جانب سے اس قسم کا کوئی تساہل ضرور سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے امام احمد بن حنبل میں اور ان میں تعلقات خوشگوار نہیں رہے۔ اور خود ابن مدینی کو بھی اس کا اقرار تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر ان سے کسی نے کہا کہ ''لوگ امام احمد بن حنبلؒ کے مقابلہ میں اب آپ کی بات قبول نہیں کرتے'' تو غایت شرمساری سے بولے ''ہاں! احمد بن حنبلؒ تو کوڑوں کی مار سہہ گئے اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا'' ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ''تم میری کمزوری جانتے ہو۔ اگر میرے ایک کوڑا بھی مارا جاتا تو میں مر جاتا۔''(۲)

---

(۱) اس کی پوری تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۳۶۶ و ۳۶۷۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۵۵۔

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ان سے عجلت میں جو خطا سرزد ہوگئی تھی اس نے بعض لوگوں کے دلوں میں ان کی وقعت کم کر دی۔ یہاں تک کہ کسی کسی نے اشعار میں اس کا اظہار بھی کیا اور خود ان کو بھی جیتے جی اس کا رنج و قلق رہا ورنہ جہاں تک ان کے عقیدہ اور رائے کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں بالکل امام احمد بن حنبلؒ کے ہمنوا تھے۔ جہمیہ کی تکفیر کرتے اور خلق قرآن کے قائلین کو گمراہ سمجھتے تھے۔ محمد بن عثمان ابی شیبہ کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت علی بن مدینیؒ سے برسر منبر سنا ہے فرماتے تھے کہ جو شخص قرآن مجید کو مخلوق سمجھتا ہے وہ کافر ہے، اور جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سچ مچ شرف ہمکلامی عطا نہیں فرمایا وہ بھی کافر ہے۔"(۱)

ایک دوسری چیز جس نے ان کی شہرت کو نقصان پہنچایا یہ تھی کہ وہ احمد بن ابی داؤد کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ یہ شخص بغداد کا قاضی تھا، اور امام احمد بن حنبلؒ کو جو مصائب اٹھانے پڑے ان میں اس کی ریشہ دوانیوں اور چغلخوریوں کو بڑا دخل تھا۔ اس لئے عوام و خواص اس کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو بھی مذموم خیال کرتے تھے۔ لیکن علی بن مدینیؒ نے آخر میں اس سے بھی تعلق منقطع کر لیا تھا۔ اور وہ سچے دل سے ان تمام قابلِ اعتراض باتوں سے توبہ کر چکے تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "اس امام کے مناقب بہت زیادہ ہیں۔ اے کاش وہ خلقِ قرآن کے فتنہ میں مبتلا نہ ہوتے، اور احمد بن ابی داؤد سے کوئی راہ و رسم نہ رکھتے۔ مگر خیر انہوں نے بعد میں اس پر ندامت کا اظہار کیا اور ان سب چیزوں سے الگ تھلگ ہو گئے۔ اور خلقِ قرآن کے قائلین کی تکفیر کرنے لگے تھے اللہ ان پر رحم کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔"(۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "ان مدینی کو جو ابتلاء پیش آیا تھا، اس کی وجہ سے امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین ان کی شان میں کلام کرتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ابن مدینی کو اپنے فعل پر بڑی ندامت تھی۔ وہ عذر خواہی کرتے تھے انہوں نے توبہ کر لی تھی اور خدا کے حضور میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔" (۳)

تصنیفات:

وہ جو کچھ سنتے تھے معیارِ تنقید پر پرکھ لینے کے بعد اس کو قلمبند کر لیتے تھے۔ اس بنا پر ان کی تصنیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے حافظ ابن حجر اس کی تعداد دو سو بتاتے ہیں۔"(۴) ابن العماد الحنبلی انہیں "صاحب التصانیف" لکھتے ہیں۔ (۵)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۵۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۲۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۵۶۔
(۴) ایضاً ص ۳۵۷۔ (۵) شذرات الذہب ج ۲ ص ۸۱۔

وفات:

ان کے مقام وسنۂ وفات دونوں میں اختلاف ہے۔علامہ بغدادی بغوی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''صحیح یہ ہے کہ ان کی وفات بصرہ میں نہیں۔ سامراہ میں ماہ ذی القعدہ ۲۳۴ھ میں ہوئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سامرا میں متوکل باللہ عباسی کے بلائے ہوئے تھے یہاں کی زمین نے اپنی کشش کا وہ اثر دکھایا کہ وہ یہیں پیوندخاک ہوکر رہ گئے۔'' (۱)

محمد بن یحیٰ الذہلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، والد کا نام یحیٰ تھا، بنی ذہل کے غلام تھے اس لئے ذہلی کہلاتے ہیں۔وطن نیشاپور تھا۔

ولادت:

۱۹۰ھ کے بعد پیدا ہوئے۔ (۲)

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار امت کے ائمۂ کبار میں ہوتا ہے۔حافظ ذہبی انہیں ''الامام اور شیخ الاسلام حافظ نیشاپور'' لکھتے ہیں، علامہ بغدادی فرماتے ہیں'' ذہلی عراق کے ائمۂ اسلام میں سے تھے، حافظ متقن تھے اور مامون ومعتبر ثقہ تھے انہوں نے تن تنہا امام زہری کی حدیثیں مدون کیں۔بغداد میں تشریف لائے۔وہاں کے شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور ان کا درس دیا۔''(۳) ابن عماد الحنبلی انہیں ''**احد الائمة الاعلام الثقات**'' لکھتے ہیں۔ (۴)

طلبِ علم میں سفر:

انہوں نے علم کی جستجو میں حرمین شریفین، شام، مصر، عراق، رے، خراسان، یمن، جزیرہ، ان سب کی خاک چھانی، اور بعض جگہ تو کئی کئی بار تشریف لے گئے۔ چنانچہ انہوں نے اس

---

(۱) بغدادی ج ۱۱ص ۴۷۲ و ۴۷۳۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۱۰۱۔

(۳) بغدادی ج ۳ص ۴۱۵۔ (۴) شذرات الذہب ج ۲ص ۱۳۸۔

سلسلہ میں بصرہ کا اٹھارہ مرتبہ، اور یمن کا دو دفعہ سفر کیا۔ (۱) ان کے بہت طویل اور مسلسل سفر تین تھے، خود ان کا بیان ہے کہ ''میں نے ان علمی سفروں میں ڈیڑھ لاکھ درہم خرچ کئے۔'' پہلی مرتبہ بصرہ میں داخل ہو رہے تھے کہ اسی وقت حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ کا جنازہ اپنے مقام سے روانہ ہو کر شہر پناہ کے دروازہ تک آ چکا تھا۔ (۲)

شغف بالحدیث:

انہیں حدیث میں اس درجہ انہماک تھا کہ عشق کے درجہ تک پہنچ گئے تھے ان کے صاحبزادہ ابوزکریا کہتے ہیں ''ایک مرتبہ گرمی کا موسم تھا۔ آفتاب کی تمازت نے ہوش وحواس پراگندہ کر رکھے تھے۔ میں اسی عالم میں دوپہر کے وقت مکان میں داخل ہوا تو دیکھا ابا (محمد بن یحییٰ ذہلی) اپنے کتب خانہ میں بیٹھے ہوئے تصنیف میں مصروف ہیں اور ان کے سامنے چراغ جل رہا ہے۔ میں نے عرض کی ''بہتر ہوتا کہ آپ اس وقت کچھ آرام فرما لیتے'' ارشاد ہوا ''بیٹا! تم یہ کس طرح کہتے ہو جبکہ میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی معیت میں ہوں۔'' (۳)

امام فی الحدیث:

ان کی شب و روز کی محنتوں، پیہم سفروں، اور راہ طلب میں طرح طرح کی مشقت انگیزیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے عہد کے ائمۂ کبار میں سے ہو گئے۔ لوگ انہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کہتے تھے۔ (۴) امام احمد بن حنبل کی جلالت مرتبت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے وہ خود امام ذہلی کی بڑی توقیر و تعظیم کرتے تھے۔ محمد بن سہل کا بیان ہے کہ ''ایک مرتبہ ہم چند اصحاب امام احمد بن حنبلؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں امام ذہلی تشریف لے آئے امام احمد انہیں دیکھتے ہی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ لوگوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ کہ آپ نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا، اس کے بعد اپنے صاحبزادوں اور شاگردوں سے فرمایا ''تم ابوعبداللہ کے پاس جاؤ، اور ان سے احادیث لکھو۔'' جس زمانہ میں امام ذہلی بصرہ میں قیام پذیر تھے، اگر کوئی شخص بصرہ جاتا تو

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲۔ (۴) بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹

امام احمد بن حنبل اسے تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا وہاں پہنچ کر محمد بن یحیٰ الذہلی کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا۔ اور ان سے احادیث کا سماع کرنا، میں نے کسی خراسانی کو، یا (راوی کا شبہ ہے) کسی شخص کو بھی امام زہری کی حدیث کے باب میں ان سے بڑا عالم نہیں پایا، اور نہ کسی کی کتاب ان کی کتاب سے زیادہ صحیح ہے۔'' (۱)

امام احمد کو امام ذہلی کی جلالت شان کا اس درجہ پاس تھا کہ وہ ان کی شان سے ادنیٰ کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ امام ذہلی نے امام احمد بن حنبل کی مجلس میں ایک حدیث روایت کی جس میں کچھ ضعف وسقم پایا جاتا تھا، امام عالی مقام نے اس کو سن کر فوراً ارشاد فرمایا ''حضرت! آپ اس طرح کی چیز کا ذکر نہ کیجئے'' امام ذہلی کو ندامت محسوس ہوئی تو آپ نے کہا ''اے ابوعبداللہ! یہ جو کچھ میں نے کہا ہے، آپ کی بلندیِ شان کی وجہ سے کہا ہے۔'' (۲)

حافظ ذہبی انہیں خراج عقیدت وتحسین اس طرح پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں'' ان پر خراسان میں علم کی مشیخت، ثقاہت، تقوی وطہارتِ دین اور اتباع سنت کا خاتمہ ہوگیا'' ابوحاتم فرماتے ہیں'' امام ذہلی اپنے زمانہ کے امام تھے'' ابن خزیمہ امام ذہلی کو کوئی روایت بیان کرتے تھے تو ان کا نام لینے کے بعد ''امام عصرہ'' کہا کرتے تھے۔ (۳)

شیوخ:

امام ذہلی نے حدیث کا سماع جن شیوخ وقت سے کیا ان میں چند کے اسماء گرامی یہ ہیں عبدالرحمٰن بن مہدی، محمد بن بکر البرسانی، عبیداللہ بن موسیٰ، یعلیٰ بن عبید، محمد بن عبید، روح بن عبادہ، ابوالنضر ہاشم بن القاسم، اسود بن عامر، سلیمان بن داؤد الہاشمی، محمد ابن عمر الواقدی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تلامذہ:

خود ان کے دامانِ فیض سے وابستہ ہوکر جنہوں نے فائدہ اٹھایا ان کی فہرست طویل ہے چند نام یہ ہیں۔ سعید بن ابی مریم، ابوصالح کاتب، اللیث بن سعد، عبداللہ بن محمد، سعید ابن منصور، محمود بن غیلان، محمد بن المثنیٰ، محمد بن اسماعیل الصغانی، ابوداؤد السجستانی۔ (۴)

علامہ بغدادی عنوان میں امام ذہلی کے نام سے ساتھ ''شیخ البخاری'' لکھتے ہیں۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۲ و ۵۱۳۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۳۔ (۴) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۴۱۶۔

حافظ ابن حجرؒ نے بھی "مقدمہ فتح الباری" میں امام بخاری کے جو شیوخ شمار کرائے ہیں ان کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں سے چوتھے طبقہ میں امام ذہلی کا نام لیا ہے۔ (۱)

امام زہریؒ کی احادیث:

امام ذہلیؒ کو یوں تو احادیث کے تمام ذخیرہ پر ہی عبور تھا۔ لیکن ان کو امام زہریؒ کی احادیث خصوصیت سے بہت یاد تھیں اور وہ ان کے علل سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں "ذہلی نے امام زہری کی احادیث اور ان کی کتابوں کے ساتھ بڑا اعتنا کیا تھا۔ اور اس میں ان کو بہت کچھ صعوبتوں سے بھی دو چار ہونا پڑا تھا۔" (۲) علی بن مدینیؒ ان کو "وارث زہری" کہتے تھے۔ دار قطنی کہتے ہیں "جو شخص یہ پسند کرے کہ وہ امام ذہلی کے علم کے محلات کا مشاہدہ کرے اس کو امام زہری کی احادیث کے ان علل میں غور و فکر کرنا چاہئے جو محمد بن یحییٰ نے معلوم کی تھیں۔" (۳) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے "ماقدم علینا رجل اعلم بحدیث الزھری من محمد بن یحییٰ" (۴) یحییٰ بن معینؒ سے کسی نے پوچھا "آپ امام زہریؒ کی حدیثیں کیوں جمع نہیں کرتے" فرمایا "ہم سب کو محمد بن یحییٰ الذہلیؒ نے اس سے مستغنی کر دیا ہے۔" (۵)

حافظہ:

ان کا حفظ مسلم تھا امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا "آپ کے نزدیک محمد بن یحییٰؒ اور محمد بن رافعؒ ان دونوں میں کون قابلِ ترجیح ہے" فرمایا محمد بن یحییٰ احفظ، اور محمد بن رافع زیادہ پرہیزگار ہیں۔" (۶)

بعض مواقع پر علماءِ حدیث ان کا طرح طرح سے امتحان لیتے تھے۔ لیکن آخر کار امام ذہلیؒ کی جلالت شان اور امامت وثقاہت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ صالح کا بیان ہے کہ میں رے جانے لگا تو فصلک کے پاس آیا اور پوچھا "میں نیشاپور پہنچ کر کس سے احادیث کی کتابت کروں؟" وہ بولے تم نیشاپور میں ایک شیخ کی تلاش کرنا جو پُر رونق اور خوبصورت ہوں ان کا لباس بھی عمدہ ہوگا اور وہ گدھے پر سوار ہونگے ان کا نام محمد بن یحییٰ الذہلی ہوگا۔ بس تم ان کی احادیث قلمبند کرنا۔ وہ زفرق تا بقدم فائدہ ہی فائدہ ہیں" صالح کہتے ہیں "میں نے نیشاپور پہنچ کر جستجو کی تو

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹ مطبع منیری۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲۔ (۳) ایضاً۔
(۴) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۳۔ (۵) ایضاً ص ۵۱۴۔ (۶) ایضاً ص ۵۱۳۔

وہ واقعی ان تمام صفات کے جامع نکلے ہیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے فضل بن العباس الرازی سے آپ کی ایک حدیث سنی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اسے خود آپ سے بھی سن لوں" محمد بن یحییٰ بولے "لاؤ، سناؤ میں نے وہ حدیث مع اسناد کے پڑھ دی۔ اسناد میں ایک راوی کا نام سعید بن عامر تھا۔ امام ذہلی نے اس کو سننے کے بعد ارشاد فرمایا کہ "جو شخص ایسا انتخاب اور اس طرح کی قرأت کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ سعید بن عامر اس طرح کی حدیث روایت نہیں کر سکتے۔ صالح نے کہا" درست ارشاد ہوا، سعید بن عامر نہیں بلکہ اس روایت کا راوی سعید بن واصل ہے" علامہ بغدادی یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ دراصل صالح نے یہ حدیث پیش کر کے امام ذہلی کا امتحان لینا چاہا تھا کہ دیکھیں وہ اس روایت کو قبول کرتے ہیں یا نہیں پس امتحان سے ان کو ثابت ہو گیا کہ امام ذہلیؒ کو اپنی روایتیں خوب محفوظ تھیں۔ وہ وہم سے احتراز کرتے، اور علمی بصیرت رکھتے تھے۔"(۱)

ابو علی الحسین بن علی الحافظ سے کسی نے امام ذہلی اور عباس بن العظیم العنبری کی نسبت سوال کیا تو فرمایا "عباس حافظ ہیں مگر محمد بن یحییٰ بہت زیادہ جلیل المرتبت ہیں۔"(۲) فضل الرازی ان سے روایت کرتے تھے تو کہا کرتے تھے "مجھ سے ایک ایسے شخص نے روایت کی ہے جس نے کبھی حدیث میں خطا نہیں کی یعنی محمد بن یحییٰ الذہلی النیشاپوری۔(۳)

محدثین کا اعتماد:

ان کی مہارتِ فن، وسعتِ نظر اور حفظ و ثقاہت کی وجہ سے محدثین ان پر اس درجہ اعتماد کرتے تھے کہ زنجویہ بن محمد کا بیان ہے "میں نے مشائخ علماء سے سنا ہے کہتے تھے جس حدیث کو امام ذہلی کی نظر میں پایۂ اعتبار حاصل نہ ہو وہ لاشے محض ہے۔"(۴) ابو احمد الفراء کہتے ہیں "محمد بن یحی عندنا امام ثقة مبرز"(۵) ابراہیم بن موسیٰ الرازیؒ کا بیان ہے کہ جو شخص امام زہری کی روایت معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ محمد بن یحییٰ سے مستغنی نہیں ہو سکتا" ابن احزم کہتے ہیں "خراسان نے ان جیسا کوئی آدمی پیدا نہیں کیا۔ امام بخاری نے ان سے چونتیس حدیثیں روایت کی ہیں۔"(۶)

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۳ ص ۴۱۷ و ۴۱۸۔ (۲) بغدادی ج ۳ ص ۴۱۸۔ (۳) ایضاً۔

(۴) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۴۔ (۵) ایضاً ص ۵۱۵۔ (۶) ایضاً ص ۵۱۶۔

امام بخاریؒ اور امام ذہلیؒ کی شکر رنجی:

امام بخاری اور امام ذہلی کی شکر رنجی تاریخِ حدیث کا مشہور واقعہ ہے جس نے بعض گمراہ کن غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ یہ شکر رنجی کسی ذاتی خصومت و مخالفت پر نہیں بلکہ ایک مسئلہ کے متعلق غلط فہمی کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے تھی، حافظ ابن حجرؒ نے حاکم ابو عبداللہ کی تاریخ کے حوالہ سے اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، ہم ذیل میں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

''امام بخاری ۲۵۰ھ میں نیشا پور تشریف لائے۔ اور یہاں مدت تک قیام کیا۔ اس اثناء میں وہ روزانہ درس دیتے تھے، امام محمد بن یحییٰ الذہلیؒ کو جب امام بخاریؒ کے نیشا پور تشریف لانے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں سے کہا ''تم لوگ اس عالم مرد صالح کے پاس جاؤ اور ان سے احادیث کا سماع کرو'' لوگ ان کے ارشاد کے مطابق امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے امام کے درس حدیث میں شرکت شروع کر دی، لیکن بعد میں ان کی مجلس میں خلل پیدا ہو گیا۔ حاتم بن احمد بن محمود نے امام مسلم کے حوالہ سے جو روایت کی ہے وہ اس سے زیادہ تفصیلی ہے، فرماتے ہیں امام بخاری نیشا پور آئے، تو ان کا استقبال اس قدر شاندار ہوا کہ ایسا استقبال نہ میں نے کسی گورنر کا دیکھا اور نہ کسی اور حاکم کا۔ اہل نیشا پور شہر سے نکل کر دو تین منزل تک گئے امام ذہلیؒ نے اپنی مجلس میں فرمایا ''جو شخص امام بخاریؒ کے استقبال کا ارادہ رکھتا ہو اسے ضرور جانا چاہئے اور میں خود بھی ان کے استقبال کے لئے جاؤں گا''۔ چنانچہ نیشا پور میں چھوٹا بڑا کوئی عالم ایسا نہیں تھا جو امام بخاریؒ کے استقبال میں شریک نہ ہوا ہو۔ ان لوگوں کے علاوہ امام بخاریؒ کے مشتاقان زیارت کا اتنا ہجوم تھا کہ مکانوں کی دیواریں اور چھتیں آدمیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ آپ نے یہاں آ کر ''دارالبخاری'' میں قیام فرمایا۔ امام ذہلیؒ نے لوگوں کو امام بخاریؒ کے استقبال میں شرکت کی دعوت دینے اور اس میں خود شریک ہونے کے باوجود اپنے تلامذہ کو اس بات کی تاکید

کر دی تھی کہ وہ امام ہمام سے کسی مسئلہ میں استفسار نہ کریں کیونکہ اگر انہوں نے اس کا جواب ان کے مسلک کے خلاف دیا تو فرقِ باطلہ کو شماتت کا بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ لیکن لوگ کب باز آنے والے تھے امام بخاریؒ نے دوسرے دن درس شروع کیا تو وہیں ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا ''حضرت الفاظ قرآن کی نسبت آپ کیا فرماتے ہیں؟'' آپ نے جواب دیا ''ہمارے، تمام افعال مخلوق (حادث) ہیں اور ہمارے الفاظ ہمارے افعال ہی ہیں'' امام کا یہ فرمانا تھا کہ مجلس میں سخت اضطراب اور شور و غل پیدا ہو گیا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، نوبت بانیجار سید کہ گھر والوں کو مجبور ہو کر ان غل مچانے والوں کو گھر سے باہر نکالنا پڑا۔''(۱)

ہماری رائے میں وجہِ مخالفت اس قدر ہی ہے جس کو دشمنوں نے رائی کا پہاڑ بنا دیا ہے۔ امام ذہلیؒ الفاظ قرآن مجید کو غیر مخلوق مانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے امام بخاریؒ کی نسبت جب یہ سنا کہ وہ انہیں مخلوق بتاتے ہیں تو انہوں نے اپنی مجلس میں اس کی تردید کی۔ ورنہ نہ امام ذہلی کو امام بخاریؒ کی عام ہر دلعزیزی اور مقبولیت پر رشک و حسد تھا۔ اور نہ امام بخاری اپنی کسی ذاتی غرض اور خودنمائی کی بناء پر امام ذہلی سے روگردانی کرتے تھے، ان سے جب لوگوں نے عرض کی کہ آپ امام ذہلی کے مسلک کے خلاف یہاں کسی بات کا چرچا نہ کریں وہ یہاں کے مسلم امام ہیں، تو انہوں نے بالکل صفائی کے ساتھ فرمایا ''میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔ اے خدا! تو جانتا ہے کہ میں نیشاپور میں کسی اکڑ، خودنمائی، یا کسی ذاتی وجاہت کے حاصل کرنے کے لئے قیام نہیں کیا ہے اور اب میرا نفس مجھ کو اس سے منع کرتا ہے کہ میں مخالفین کی کثرت سے ڈر کر اپنے وطن کو واپس چلا جاؤں۔''

علاوہ ازیں مزید تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخالفت میں چند شریر النفس لوگوں کی دخل اندازی کو زیادہ دخل تھا۔ جنہوں نے خواہ مخواہ امام بخاریؒ کی نسبت ایک غلط خبر مشہور کر دی۔ ورنہ حق یہ ہے کہ امام بخاری قرآن مجید کے مخلوق ہونے کے قائل نہیں تھے۔ محمد بن نصر المروزی اور ابو عمرو نے ان سے اس مسئلہ کی نسبت استفسار کیا تو انہوں نے پوری وضاحت کے ساتھ فرمایا ''میں نے قرآن مجید کو مخلوق نہیں کہا ہے اور جو شخص میری طرف اس قسم کا قول منسوب کرتا ہے وہ کذاب ہے۔''(۲)

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۳۔ (۲) مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۴۔

شرم وحیا:

امام ذہلیؒ جس طرح ایک جلیل القدر محدث وقت تھے طبعاً نہایت شرمیلے اور باحیا بھی تھے۔ وفات کے بعد جب ان کو غسل دیا جارہا تھا ان کی خادمہ قریب ہی کھڑی ہوئی تھی کہنے لگے ''میں نے ابو عبداللہ کی خدمت تیس برس تک کی اور ان کے غسل و وضو کے لئے میں ہی پانی رکھتی تھی۔ لیکن میں نے ان کی مملوکہ ہونے کے باوجود کبھی ایک مرتبہ بھی ان کی پنڈلی نہیں دیکھی۔''(۱)

وفات:

ان کی تاریخ وفات میں شدید اختلاف ہے، علامۂ بغدادی نے کئی روایتیں نقل کی ہیں، لیکن حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ماہ ربیع الاول ۲۵۸ھ میں ہوئی ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال کئی نامور محدثین احمد بن سیار القطان، احمد بن حفص بن عبداللہ السلمی، حمید بن الربیع الخزار الکوفی، اور شیخ صوفیہ یحیٰی بن معاذ نے وفات پائی۔ (۲)

ابو محمد یحیٰی بن یحیٰی اللیثی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یحیٰی نام، ابو محمد کنیت، والد کا نام بھی یحیٰی تھا۔ بربریوں کے ایک قبیلہ مصمودہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بنولیث کے غلام تھے۔ اس بنا پر ان کی طرف منسوب ہو کر لیثی کہلاتے ہیں۔ ان کے دادا ابو عیسیٰ اندلس میں آکر قرطبہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے یحیٰی یہیں پیدا ہوئے اور یحیٰی بن مضر القیسی الاندلسی سے احادیث کا سماع کیا۔ اس کے بعد ابھی اٹھارہ برس کے ہی تھے کہ طلب علم میں مشرق کی طرف چلے گئے اور وہاں کتاب الاعتکاف کے چند ابواب کے سوا تمام مؤطا امام مالک خود امام مالک سے سنا، مکہ میں انہوں نے حضرت سفیان بن عیینہ سے، مصر میں لیث بن سعد، عبداللہ بن وہب، اور عبدالرحمٰن بن القاسم سے درس حدیث لیا۔ (۳) ان بزرگوں کے علاوہ ان کے اساتذہ کی فہرست میں حسب ذیل حضرات بھی داخل ہیں۔

یحیٰی بن مضر، ابن القاسم، القاسم بن عبداللہ العمری، ابو ضمرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۳۔ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۶۔

تلامذہ:

ان سے جن لوگوں نے روایت کی ان میں خود ان کے فرزند عبید اللہ، بقی بن مخلد، محمد ابن وضاح، محمد بن العباس، صباح بن عبدالرحمٰن، العتقی وغیرہم (رحمہم اللہ تعالیٰ) داخل ہیں۔[1]

علم کا شوق:

وہ علم حاصل کرنے کے اتنے دھنی تھے کہ کسی چیز کی طرف وہ خواہ کتنی ہی دلچسپ ہو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ امام مالک نے ان کا لقب ''عاقل اہل اندلس'' رکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ امام مالک حدیث کا درس دے رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک شخص نے کہا ''ہاتھی آ گیا'' جتنے لوگ اس وقت درس میں شریک تھے۔ سب ہاتھی دیکھنے چلے گئے لیکن یحییٰ اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔ امام مالک نے پوچھا ''اندلس میں تو ہاتھی ہوتا نہیں ہے پھر تم ہاتھی دیکھنے کیوں نہیں گئے؟'' حضرت یحییٰ بولے ''حضرت! میں یہاں آپ کا فیض صحبت اٹھانے اور آپ کے علم اور اُسوہ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہوں اس لئے نہیں آیا کہ ہاتھیوں کو دیکھتا پھروں'' امام مالک کو ان کا یہ جواب بے حد پسند آیا، اور اس دن سے آپ نے ''ان کو عاقل اہل اندلس'' کہنا شروع کر دیا۔[2]

حضرت یحییٰ کو امام مالک کے ساتھ بڑی خصوصیت تھی ان کے مؤطا کا اندلس میں چرچا انہی کی وجہ سے ہوا۔

فقہ:

انہوں نے فقہ کی تحصیل بھی امام مالکؒ سے اور دوسرے علماء مدینہ سے کی تھی۔ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں ''اندلس میں امام مالک کے فقہ کی اشاعت حضرت یحییٰ کی بدولت ہی ہوئی۔[3] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''وکان فقیھا حسن الرای''.

فتویٰ:

وہ فتویٰ بھی دیتے تھے اور اس معاملہ میں وہ اندلس کے سب سے بڑے امام سمجھے جاتے تھے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں ''یحییٰ بن یحییٰ اندلس واپس آئے تو یہاں علم کی ریاست انہی پر ختم تھی۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱۔ (۲) ابن خلکان ج ۳۲ ص ۲۱۶۔ (۳) شذرات الذہب ج ۲ ص ۸۲۔

انہی کی وجہ سے اس ملک میں ''مالکی'' مسلک کی اشاعت ہوئی اور ان سے اتنی کثیر جماعت نے فقہ حاصل کیا کہ ان کا شمار بھی نہیں ہوسکتا'' ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ عیسیٰ بن دینار کے بعد اندلس کے سب سے بڑے مفتی یحییٰ بن یحییٰ ہی تھے۔ یہاں کے عوام اور خواص آپ کی ہی رائے کی طرف رجوع کرتے تھے۔ (۱)

ان کے تفقہ کا ایک دلچسپ واقعہ:

ان کو اپنے تفقہ سے جو بات حق معلوم ہوتی تھی اس کے اظہار میں رعب و ہیبت سلطانی بھی مانع نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اندلس کا حاکم امیر عبدالرحمٰن بن الحکم الاموی ماہ رمضان میں اپنی ایک محبوب لونڈی سے مجامعت کر بیٹھا تھا۔ اس وقت تو حالت اضطرار میں اس سے یہ حرکت سرزد ہوگئی۔ لیکن بعد میں اس کو اپنے فعل پر بہت ندامت ہوئی فتویٰ طلب کرنے کے لئے فقہاء شہر کو جمع کیا۔ ان میں حضرت یحییٰ بن یحییٰ بھی شامل تھے ان سے کفارہ کی نسبت پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا امیر کو پے بہ پے دو مہینوں کے روزے رکھنے چاہئیں حضرت یحییٰ کی جلالتِ شان مسلم تھی۔ ان کے اس فتویٰ کو سن کر دوسرے فقہاء خاموش رہے لیکن امیر کے پاس سے چلے آنے کے بعد انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ امام مالک تو اس نوع کے مسائل میں خیار کے قائل ہیں۔ یعنی وہ یہ فرماتے ہیں کہ کفارۂ صوم میں روزہ دار کو اختیار ہے، کوئی غلام آزاد کرے۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ پھر آپ نے اس سے انحراف کر کے صرف دو ماہ کے روزوں پر ہی کیوں اصرار کیا؟ آپ نے جواب دیا ''اگر ہم نے امیر کے لئے یہ دروازہ کھول دیا تو اس کے لئے بہت آسان ہوگا کہ روز مجامعت کرے اور کفارہ میں کوئی غلام آزاد کردے۔ یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلادے۔ اس بنا پر میں نے صرف ایسی چیز بتائی ہے جو امیر کے لئے بہت مشکل ہے، تاکہ وہ ایک مرتبہ ایسی حرکت کرنے کے بعد دوسری مرتبہ ایسا کرنے کی جسارت نہ کرے۔'' (۲)

---

(۱) بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱۔ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۷۔

جامعیت:

حضرت یحییٰ کی ذات مختلف علمی، عملی، اخلاقی اور روحانی ونفسانی کمالات کا مجموعہ تھی۔ ابن عماد الحنبلی کا ارشاد ہے "وہ کثیر العلم، عظیم المرتبت، اور نہایت ہی محترم وموقر امام تھے ان کی عقل کامل تھی، نفس بہت نیک اور اچھا تھا۔ فضل وافر رکھتے تھے۔ عبادت بہت کرتے تھے۔"(۱) احمد بن خالد کا بیان ہے "جب سے اندلس میں اسلام داخل ہوا ہے۔ یہاں کے علماء میں سے کسی کو وہ جاہ وجلال، عظمت وبرتری نصیب نہیں ہوئی جو حضرت یحییٰ بن یحییٰ کو حاصل ہوئی وہ اپنی وضع قطع اور نشست وبرخاست کے طور طریق میں بالکل امام مالک معلوم ہوتے تھے۔ ابو الولید بن الفرضی کہتے ہیں "حضرت یحییٰ امام وقت اور اپنے ملک کے تنہا امام تھے۔"(۲)

جلالتِ شان

ان گوناگوں کمالات کے باعث وہ جس طرح پبلک میں انتہائی عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے، اسی طرح شاہی دربار میں بھی اُن کی بڑی توقیر کی جاتی تھی۔ سلطنت کی جانب سے ان کو عہدۂ قضا پیش کیا گیا۔ لیکن انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ اس انکار سے ان کی وقعت و عزت دوچند ہوگئی۔ اور وہ سلطان کی نگاہ میں اس درجہ موقر ہوگئے کہ ان کے مشورہ کے بغیر ملک کا کوئی اہم معاملہ سرانجام نہیں پاتا تھا۔ یہاں تک کہ گورنروں کے عزل ونصب میں بھی انہی کی رائے کو مقدم رکھا جاتا تھا۔ اسی بناء پر علامہ ابن حزم اندلسی فرماتے ہیں کہ "جس طرح امام ابوحنیفہؒ کے فقہ کی اشاعت حضرت قاضی ابو یوسف کے چیف جسٹس ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ کیونکہ اس بلند عہدہ اور مخصوص علمی وقار کی وجہ سے ان کو خلافت عباسی کے دربار میں اتنا رسوخ حاصل تھا کہ اقصیٰ مشرق سے لے کر اقصیٰ افریقہ تک صرف وہی لوگ گورنر ایسے بڑے مناصب پر سرفراز کئے جاتے تھے جو فقہی مسائل میں قاضی ابو یوسف کے ہم خیال وہم رائے ہوتے تھے۔ اسی طرح بلاد اندلس میں مالکی فقہ کی اشاعت حضرت یحییٰ بن یحییٰ کے ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے ہوئی۔ سلطان حکام کے عزل ونصب میں انہی سے مشورہ کرتا تھا۔ اور وہ عہدوں کی تقرری کے لئے انہی علماء کو ترجیح دیتے تھے جو امام مالک کے مسلک کے پابند ہوتے تھے۔"(۳) لیکن حضرت یحییٰ امام مالک

(۱) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۱۷۔ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۷۔ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۶ اگرچہ ہمارے خیال میں ابن حزم کی یہ رائے قابل غور ہے۔

کے مقلد محض نہ تھے بلکہ ان کے مسائل میں آزادانہ رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ کئی مسئلوں میں انہوں نے امام سے خلاف بھی کیا ہے۔

تقویٰ وطہارت:

عملی اعتبار سے وہ نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ یہاں تک کہ ابن بشکوال کہتے ہیں کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ (۱)

وفات:

ماہ رجب ۲۳۴ھ یا ۲۳۶ھ میں وفات پائی۔ (۲)

محمد بن عمر الواقدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، ان کے دادا کا نام واقد تھا، انہی کی نسبت سے واقدی کہلاتے ہیں۔ بنو ہاشم، اور بعض کے نزدیک بنو سہم بن اسلم کے غلام تھے۔ (۳)

ولادت:

۱۳۰ھ میں غالباً مدینہ میں پیدا ہوئے۔ (۴)

علم وتحقیق کا شوق:

واقدی کی زیادہ تر شہرت ایک عالم مغازی وسیر کی حیثیت سے ہے، انہیں واقعاتِ غزوات کی تحقیق کا شوق اس درجہ تھا کہ مقاماتِ غزوہ کا مشاہدہ خود وہاں جاکر کرتے تھے خود ان کا بیان ہے کہ ''میں صحابۂ کرام کی اولاد اور ان کے موالی میں سے جس کسی سے ملتا اس سے دریافت کرتا تھا'' کیا آپ نے فلاں واقعہ کی نسبت اپنے بزرگ سے کچھ سنا ہے کہ وہ کہاں پیش آیا۔ اور وہ کہاں قتل کئے گئے؟'' جواب اثبات میں ملتا تو پھر میں خود اس جگہ جاکر اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مریسیع گیا، اور اس کو خوب اچھی طرح دیکھا۔''

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱۔ (۲) ایضاً ص ۳۰۲۔

(۳) ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۶۔ (۴) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۶۔

ہارون القروی نے ایک مرتبہ انہیں اس حالت میں دیکھا کہ پانی کا چھوٹا سا مشکیزہ ساتھ لئے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا ''آپ کہاں جا رہے ہیں'' بولے ''میں حنین جا رہا ہوں تا کہ غزوۂ حنین کے مقام وقوع کا بچشم خود معائنہ کروں۔''(۱)

ان کا ذوق جستجو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی تھی اسے بے تکلف اربابِ خبر سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ وہ اس وصف خاص میں اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ ایک مرتبہ ابراہیم الحربی سے پوچھا گیا کہ امام مالک کے مسائل کس سے معلوم کئے جائیں، تو انہوں نے علامہ واقدیؒ ہی کا نام لیا، اور کہا ''آج دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو یوں کہے کہ میں نے امام مالک، سفیان ثوری، ابن ابی ذہب اور یعقوب وغیرہم سے سوال کیا، البتہ ہاں واقدی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (۲)

علم وفضل:

ان کی اس جستجو اور تحقیق وتلاش کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم وفضل کے اعتبار سے دور دور مشہور ہو گئے۔ علامہ بغدادی لکھتے ہیں ''واقدی ان لوگوں میں سے تھے جن کے آوازۂ شہرت سے مشرق ومغرب معمور تھے۔ اخبار وروایات کا علم رکھنے والوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ان سے واقف نہ ہو۔ ان کی کتابیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک اور اس کے بعد کے سوانح وواقعات درج ہیں اور ان میں فقہ کے مسائل اور حدیث کے اختلافات بھی ہیں۔''(۳) ابن العماد الحنبلی انہیں علم کا ظرف'' بتاتے ہیں۔ (۴) علامہ ابن خلکانؒ لکھتے ہیں کہ ''وہ امام عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔''(۵) علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں ''واقدی مغازی، سیرت، فتوحات، احکام اور حدیثوں میں علماء کے اختلافات اور ان کے متفقہ مسائل ان سب کے عالم تھے۔'' ان کے علم وفضل کی دلیل یہی کیا کم ہے کہ محمد بن سعد صاحب طبقات ایسا علامۂ یگانہ ان کا کاتب اور تلمیذ تھا۔ البتہ انہیں عہد جاہلیت (عرب قبل اسلام) سے واقفیت بالکل نہیں تھی۔ حدیث میں درخور وافر رکھتے تھے۔ اور اپنے زمانہ کے اکابر محدثین سے حدیث کا سماع کیا تھا۔ ''بعض لوگوں نے ان کو امیر المومنین فی الحدیث کہا ہے۔'' لیکن اس پر تفصیلی گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۶۔ (۲) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۲۶۷۔ (۳) ایضاً ص ۱۔

(۴) شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۸۔ (۵) ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۲۔

تصنیفات:

جو کچھ سنتے تھے لکھتے جاتے تھے جس سے ان کے پاس کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ 'جب وہ بغداد کی جانب شرقی سے جانب غربی کی طرف منتقل ہوئے تو ان کی کتابوں کے ایک سو بیس بنڈل باندھے گئے۔'' ابو خدافہ کی روایت ہے کہ ان کے پاس کتابوں کی چھ سو الماریاں تھیں۔''(۱)

معلوم ہوتا ہے واقدی کو اپنے حافظہ پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہا کرتے تھے ''دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی کتابیں اس کے محفوظات سے زیادہ نہ ہوں۔ لیکن میرا حال اس کے برعکس ہے۔''(۲) ان کی تصنیفات سیر مغازی تو مشہور ہیں ہی۔ ان کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب ان بدنصیب انسانوں کے حالات میں لکھی تھی جو عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو کر نعمت ایمان وسعادت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں ان لوگوں اور صحابہؓ کرام کی جنگ کا تفصیلی تذکرہ بھی کیا ہے اس کتاب کا نام ''کتاب الردَّۃ'' تھا۔

قضا اور دربار خلافت کی قدر افزائی:

علمی شہرت وکمال کے باعث خراسان سے اپنی واپسی پر مامون نے ان کو بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی بنا دیا تھا، اور یوں بھی مامون ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مامون کے پاس ایک عریضہ لکھا جس میں اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا تھا، اور لکھا تھا کہ ''مقروض ہو گیا ہوں' آپ مجھے اتنی رقم بھیج دیجئے'' مامون نے جواب میں لکھا کہ ''آپ میں دو خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک سخاوت اور دوسری حیا، آپ کی سخاوت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا سب خرچ کر بیٹھے اب رہی حیا، اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کل رقم قرض کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کا صرف ایک حصہ بتایا ہے اس بنا پر میں نے حکم دے دیا ہے کہ آپ کی معینہ مطلوبہ رقم سے دو چند رقم آپ کو دے دی جائے۔ اب معلوم نہیں یہ رقم بھی آپ کے ادائے قرض کے لئے کافی ہو گی یا نہیں؟ اگر کافی نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری خود آپ پر عائد ہوتی ہے۔ اور اگر قرض ادا کرنے کے بعد بھی یہ مرسلہ رقم کچھ بچ رہے، تو آپ حسب عادت اس کو فراخ دلی سے

---

(۱) کتاب الانساب للسمعانی ص ۵۷۷۔ (۲) بغدادی ج ۳ ص ۶۔

خرچ کیجئے کیونکہ اللہ کے خزانے کھلے ہوئے ہیں اور اس کے فیضان کرم کے لئے کوئی مانع نہیں ہے۔''

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مامون نے اپنے اس خط کے اخیر میں لکھا ہے ''اور ہاں! ایک مرتبہ آپ ہی نے تو یہ روایت نقل کی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا ''اے زبیر! رزق کی کنجیاں عرش کے سامنے لٹکی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالی اپنے بندوں کے اخراجات کے مطابق ان کے رزق اُتارتا رہتا ہے، جس کا خرچ زیادہ ہوتا ہے اسے زیادہ اور جس کا خرچ کم ہوتا ہے اسے کم ملتا ہے'' واقدی نے یہ روایت پڑھ کر کہا کہ ''میں اس کو بھول گیا تھا۔ اب مامون کے یاد دلانے سے یاد آئی ہے تو مجھ کو اس کی اس قدر مسرت ہوئی کہ اس کے عطیہ سے بھی نہیں ہوئی۔'' (۱)

دربار خلافت کے علاوہ یحییٰ بن خالد البرمکی بھی واقدی کی بہت تعظیم و توقیر کرتا، ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھتا تھا۔ خود ان کا بیان ہے ''ایک مرتبہ عید قریب تھی اور میرے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ میں اپنے بچوں کے لئے کپڑوں کا انتظام کرسکوں۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو اپنے ایک تجارت پیشہ دوست کے پاس آیا اور اپنی ضرورت ظاہر کر کے اس سے کچھ روپیہ قرض طلب کیا اس نے کئی سربمہر تھیلیاں میرے سامنے رکھ دیں جن میں ایک لاکھ دو سو درہم تھے۔ میں انہیں لے کر گھر چلا آیا، لیکن ابھی یہاں آئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرا ایک ہاشمی دوست آیا۔ اور میری طرح اس نے اپنی پریشانی اور ضرورت کا اظہار کر کے مجھ سے کچھ روپیہ بطور قرض طلب کیا میں نے گھر میں آ کر اپنی بیوی سے مشورہ کیا'' تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ میں تو یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ ہم دونوں اس رقم کو آپس میں تقسیم کرلیں'' میری بیوی بولیں ''سبحان اللہ! یہ آپ نے کیا سوچا ہے؟ ذرا یہ تو سوچئے کہ آپ ایک معمولی سے آدمی کے پاس گئے اور اس نے آپ کی ضرورت کا حال معلوم کر کے فوراً ایک لاکھ دو سو درہم کی تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کردی، لیکن یہاں آپ کے پاس ایک ایسا دوست آیا ہے جو ہاشمی ہونے کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف نسبت رکھتا ہے آپ اس کو نصف پر ہی ٹالنا چاہتے ہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کل رقم ہی اس کے حوالہ کردیجئے'' میں نے بیوی کے مشورہ کے

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۶ علامہ بغدادی نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون کا یہ عطیہ ایک لاکھ درہم کا تھا۔

مطابق ایسا ہی کیا کہ جو کچھ قرض لایا تھا سب کا سب ہاشمی دوست کے نذر کردیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میرے تاجر دوست کو بھی قرض کی ضرورت پیش آ گئی۔ کیونکہ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ مجھے دے چکا تھا، تو وہ میرے دوست ہاشمی کے ہی پاس آیا جو خود اس کا بھی دوست تھا۔ ہاشمی نے اس کی پریشانی کا حال سن کر وہ سر بمہر تھیلیاں جوں کی توں اس کے حوالہ کردیں۔ اب اس نے تھیلیوں پر اپنی مہر دیکھی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی فوراً میرے (واقدی پاس آیا میں نے اسے سارا قصہ ازاول تا آخر سنا دیا، اب رائے یہ قرار پائی کہ چونکہ ہم تینوں حاجت مند ہیں اور ہمارے پاس ان تھیلیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لئے ہم کو چاہئے کہ انہیں ہی آپس میں تقسیم کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کرلیا گیا۔ شدہ شدہ اس واقعہ کی خبر یحییٰ بن خالد برمکی کو پہنچ گئی۔ اس نے اپنا قاصد بھیج کر مجھ کو طلب کیا میں نے حاضر ہو کر جو واقعہ پیش آیا تھا بتمام وکمال سنا دیا تو اس نے اپنے خادم سے کہا 'میاں! ذرا وہ تھیلی اٹھا لانا'' خادم نے فوراً حکم کی تعمیل کی، اسے کھولا گیا تو معلوم ہوا اس میں دس ہزار دینار تھے جن کو یحییٰ نے اس طرح تقسیم کردیا کہ دو دو ہزار دینار ہم تینوں دوستوں کو، اب بچے چار ہزار وہ سب کے سب اس نے میری بیوی کو یہ کہہ کر بطور عطیہ دے دیئے کہ یہ نیک دل خاتون تم سب سے زیادہ کریمۃ النفس ہے۔'' (۱)

علامہ مسعودی نے بھی ''مروج الذہب'' میں اس واقعہ کا اسی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ علامہ بغدادی یحییٰ بن خالد کا نام لیتے ہیں، اور مسعودی اس کو مامون کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں میں سے کوئی ہو اسلامی تعلیم نے سوسائٹی میں جو اخلاق فاضلہ پیدا کردیئے تھے اس واقعہ سے ان کی ایک جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے۔ اور یہ معلوم کرنا دشوار نہیں رہتا کہ اسلام کے ابرِ کرم وفیض نے مرد، عورت امیر غریب، غلام اور آزاد غرضیکہ انسانی جماعت کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کو کس درجہ بلند اخلاق اور شمائل سے آراستہ وپیراستہ بنا دیا تھا، کیا دنیا کی کوئی قوم اپنی تاریخ میں انسانی جماعتوں کے اجتماعی تہذیب نفس وتربیت اخلاق کی زیادہ نہیں ایسی دو چار روشن نظائر بھی دکھا سکتی ہے؟

آزاد ذریعہ معاش:

علم وفضل میں یگانہ روزگار ہونے کے باوجود علامہ واقدی کی غیرت نفس نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے علم کو ذریعۂ معاش بنا کر امراء ورؤسا کے عطیوں پر گزر بسر کریں۔

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۹ و ۲۰۔

بلکہ وہ اپنی معاش اپنی قوت بازو سے پیدا کرتے تھے۔ وہ مدینہ میں لوگوں سے مضاربت کرکے گیہوں بیچتے تھے یعنی سرمایہ دوسروں کا ہوتا تھا اور کام خود کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ ان کے پاس ایک لاکھ درہم تھے۔ سوء اتفاق سے وہ کہیں تلف ہو گئے۔ روپیہ والوں نے ان کو پریشان کیا، یہ بالکل خالی ہاتھ تھے، قرض کا معاملہ، جب سخت تنگ آ گئے تو مجبوراً یحییٰ بن خالد برمکی سے ملنے بغداد آئے۔ یحییٰ کے مکان پر پہنچ کر دہلیز میں ہی بیٹھ گئے۔ یحییٰ کے نوکروں اور دربانوں نے کہا کہ آپ ذرا توقف کیجئے، کھانے کا وقت آ جائے تو آپ ملاقات کر سکیں گے۔ کیونکہ یحییٰ کی یہ عادت ہے کہ جو کوئی ان سے ملنے آتا ہے اس سے وہ دسترخوان پر ملاقات کرتے اور اپنے ساتھ اسے بھی شریک طعام کرتے ہیں، صرف کھانے کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت کسی شخص کے لئے روک ٹوک نہیں ہوتی۔'' علامہ واقدی بیان کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ یحییٰ کے کھانے کا وقت آیا، تو ایک طویل دسترخوان بچھایا گیا اور دربانوں نے مجھ کو بھی وہیں لے جا کر بٹھا دیا۔ اثناء طعام میں یحییٰ کے استفسار پر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ کھانے سے فراغت اور ہاتھ منہ دھو لینے کے بعد میں آگے بڑھا اور (عربی تہذیب وتمدن کے مطابق) میں نے چاہا کہ یحییٰ کے سر کو بوسہ دوں، لیکن یحییٰ نے اپنا سر ہٹا لیا اور مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔ پھر میں رخصت ہو کر مکان کے باہر چبوترہ تک پہنچا ہی تھا، اور سوار ہو کر واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک خادم ایک ہزار دینار کی تھیلی لئے ہوئے آیا۔ مجھے دے کر کہنے لگا، ''وزیر معظم آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آج ان کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کیجئے اور کل پھر تشریف لایئے۔'' حسب طلب میں دوسرے دن پہنچا تو یہی واقعہ پیش آیا۔ میں نے یحییٰ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور جب چلنے لگا تو ایک خادم نے ایک ہزار دینار کی تھیلی لا کر دی اور وہی پیغام سنایا کہ ''وزیر مکرم آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کل پھر تشریف لایئے گا۔'' میں نے اس پیغام کے مطابق ایسا ہی کیا تو پھر وہی صورت حال پیش آئی، یعنی میں نے گزشتہ دو دنوں کی طرح یحییٰ کے ساتھ ہمطعامی کی اور روانگی کے وقت وہی ایک ہزار دینار کی تھیلی پیش کی گئی اور دوسرے روز آنے کی وہی دعوت بھی دی، چوتھے دن پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ لیکن اس دفعہ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ میں یحییٰ کے بوسۂ سر کے لئے آگے بڑھا تو انہوں نے حسب سابق مزاحمت نہیں کی، اور مجھ کو بوسہ سے منع نہیں کیا۔ پھر اس کے بعد خود ہی فرمایا ''میں نے اس سے قبل آپ کو اپنے سر کا بوسہ نہیں لینے دیا۔ لیکن آج میں نے اس سے منع نہیں کیا۔ آپ کو اس پر تعجب ہوگا۔ سنئے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آج سے قبل تک آپ کے

ساتھ کوئی ایسا احسان نہیں کیا تھا جس کے باعث آپ میرے سر کا بوسہ لے کر مجھے ممنونِ کرم کرتے۔ البتہ ہاں! آج آپ کو میری طرف سے کچھ نفع پہنچ چکا ہے تو اب آپ کا حق ہے کہ میرے ساتھ یہ تعظیم وتکریم کا معاملہ کریں۔ یہ کہہ کر اپنے ملازم سے خطاب کیا اور کہا ''اے میاں! دیکھنا ان کو دو لاکھ درہم کی ایک تھیلی دے دیدو۔'' پھر روئے سخن میری جانب کر کے فرمایا ''آپ ان میں سے ایک لاکھ درہم اپنے قرض میں دے دیجئے، اور بقیہ ایک لاکھ اپنی ضرورتوں پر خرچ کر لیجئے۔'' اس کے بعد مجھ سے باصرار کہا کہ اب آپ یہیں میرے پاس میرے مکان میں قیام فرمایئے۔'' میں نے عرض کی ''اگر آپ بالفعل مجھ کو مدینہ واپس جانے کی اجازت دے دیں تو بہتر ہو میں وہاں جا کر جن لوگوں کا روپیہ میرے ذمہ واجب الادا ہے اسے ادا کر دوں پھر ایسا ہی ہے تو آپ کے پاس واپس چلا آؤں گا۔ یحییٰ نے میری یہ درخواست منظور کر لی۔ اور حکم دیا کہ میرے لئے سفرِ مدینہ کا انتظام مکمل کر دیا جائے۔ چنانچہ میں مدینہ پہنچا۔ وہاں کے قرض خواہوں کا روپیہ ان کو ادا کیا، اور پھر حسبِ وعدہ بغداد میں واپس آ کر یحییٰ بن خالد کے زیر سایۂ عاطفت زندگی بسر کرنے لگا۔ (۱)

جود وسخا اور کشادہ دلی:

علامہ واقدی جیسا کہ مذکورۂ بالا واقعہ احباب سے ثابت ہوتا ہے، نہایت فراخ دل اور کشادہ دست تھے۔ وہ روپیہ کو تکمیل حاجات وضروریات زندگی کا ذریعہ سمجھتے تھے بخیلوں اور زر پرست لوگوں کی طرح اسے جوڑ جوڑ کر رکھنا اور اصل مقصد بنالینا ان کے نزدیک نہایت معیوب ومذموم تھا، علامہ بغدادی لکھتے ہیں ''وکان جواذا کریما مشھورا بالسخاء'' خود مامون بھی ان کی اس خصلت کا اعتراف کرتا تھا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انہیں سلطان کی طرف سے چھ لاکھ درہم ملے، مگر کبھی ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ ان کا انتقال ہوا تو بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کفن تک کا انتظام کرنے کے لئے گھر میں روپیہ نہیں تھا۔ مامون کو خبر ہوئی تو اس نے کفن بھجوایا، اور طرفہ یہ ہے کہ انہوں نے عہدۂ قضا کی خدمات انجام دینے کے زمانہ میں وفات پائی تھی۔ (۲)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۴ و ۵۔ (۲) ایضاً ص ۲۰۔

واقدی پر جرح:

یہ عجیب بات ہے کہ علامہ واقدی ایک طرف تاریخ ومغازی کے مسلمہ عالم تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن دوسری جانب علماء حدیث نے ان پر نہایت سخت جرح کی ہے۔امام احمد بن حنبلؒ، علی بن المدینیؒ، امام شافعیؒ، اور امام نسائیؒ ان سب میں پیش پیش ہیں انہوں نے ان کو صرف ضعیف کہنے پر ہی بس نہیں کی بلکہ انہیں متروک الحدیث، کذاب لیس بشئی اور وضاع ایسے الفاظ جو عموماً رواۃ کی جرح میں استعمال ہوئے ہیں، سب ہی کہہ دیئے گئے ہیں۔ان حضرات کے برخلاف بعض علماءِ حدیث ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان کی ثقاہت کو تسلیم کیا ہے۔ابراہیم بن جابر الفقیہ کا بیان ہے کہ ''میں نے صغانی سے سنا ہے فرماتے تھے۔اگر واقدی ثقہ نہ ہوتے تو میں ان سے کس طرح روایت کرتا؟'' مصعب زبیری کہتے ہیں ''وہ ثقہ اور مامون ہیں'' ابن نمیر سے ان کی نسبت دریافت کیا گیا تو بولے ''یہاں تو ان کی احادیث صحیح ہی ہیں۔رہے اہل مدینہ وہ ان سے زیادہ واقف ہیں۔ابوعبیدؒ بھی ان کو ثقہ مانتے تھے۔ (۱) مجاہد بن موسیٰ سے ان کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "ما کتب عن احد احفظه منه' دراوردی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ واقدی حدیث میں امیر المومنین تھے، ابراہیم الحربی انہیں "امین الناس علی الاسلام" بتاتے ہیں۔ (۲)

جرح وتعدیل پر تبصرہ:

اصل یہ ہے کہ علامہ واقدی کی وسعت معلومات۔اور ان کے علم وفضل میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا البتہ سوال صرف یہ ہے کہ روایات میں وہ قابل استناد بھی ہیں یا نہیں؟ اہل علم جانتے ہیں کہ علماء جرح وتعدیل نے روایت ودرایت کے جو اصول قائم کئے ہیں وہ اس قدر سخت ہیں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا عالم وفاضل ہو۔اگر وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا ہے تو علماء حدیث کی نگاہ نکتہ چین ودقیقہ رس میں اسے پایۂ اعتبار حاصل نہیں ہوسکتا۔مشہور محدث اسحاق بن راہویہ نے کسی جگہ فرمایا ہے کہ بعض وہ لوگ جن کو ہم کسی خامی کی وجہ سے ساقط الاعتبار قرار دے دیتے ہیں نیکی اور زہد واتقاء کی وجہ سے ان کی روحیں جنت میں سبز پرندوں کی شکل میں اڑتی پھرتی ہوں گی، اور حق یہ ہے کہ جرح وتعدیل میں علماء حدیث کی یہ سختی، اور تنقید رواۃ میں ان کی یہ غیر معمولی سختی اور درشتی ہی اس بات کی ضامن ہے کہ جن رواۃ کو ان بزرگوں نے ثقہ، اور جن روایاتِ حدیث کو

---

(۱) ان اقوال کے لئے دیکھو تہذیب التہذیب ج۹ ص ۳۶۶۔ (۲) تہذیب التہذیب ج۹ ص ۳۶۵۔

انہوں نے صحیح ومعتبر مانا ہے وہ یقیناً صحیح ہی ہوں گی۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اب اگر علامہ واقدی کے معاملہ پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو خود واقدی میں ایسی کمزوریاں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے علم وفضل کے باوجود اکابر محدثین کے نزدیک ثقہ راویوں کی صف میں شمار نہیں کئے گئے۔ اور کچھ انفرادی طور پر بعض ائمہ فن کو ان کے متعلق کسی خاص حدیث میں کوئی غلط فہمی ہوگئی اور اس بنا پر وہ ان کی توثیق نہیں کر سکے۔

پہلی شق کی تفصیل یہ ہے کہ راوی کی ثقاہت کے لئے جو شرطیں مقرر ہیں ان میں قوت حفظ کو بہت اہمیت حاصل ہے لیکن واقدی کے حالات کے تتبع سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگر چہ اپنے حافظہ پر ناز کرتے تھے، لیکن ان کا حافظہ شروع سے کمزور تھا، یا عمر کے تقاضے اور عوارض وامراض کی وجہ سے آخر میں کمزور ہوگیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ علامہ بغدادی نے یہ لکھا ہے کہ ''ایک مرتبہ مامون نے واقدی سے کہا کہ آج جمعہ کی نماز آپ پڑھایئے انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ ''اے امیر المومنین مجھ کو سورۂ جمعہ یاد نہیں ہے۔'' مامون نے کہا ''اچھا سورۂ جمعہ میں آپ کو یاد کرادوں گا۔ چنانچہ مامون نے سورۃ ٹکڑے کر کر کے پڑھنی شروع کی، اور واقدی سے کہا کہ آپ بھی پڑھیئے۔ اس طرح انہوں نے نصف سورۃ حفظ کرلی لیکن اس کے بعد پھر بقیہ نصف سورۃ یاد کی تو سورۃ کا نصفِ اول بھول گئے۔ اب نصفِ اول پھر یاد کیا تو نصفِ ثانی بھول گئے۔ کئی مرتبہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ آخر کار مامون اکتا گیا، اس پر غنودگی طاری تھی، سو گیا۔ اب واقدی نے ایک اور شخص جو اس وقت وہاں موجود تھے، اور جن کا نام علی بن صالح تھا ان سے کہا کہ آپ مجھ کو سورۂ جمعہ یاد کرادیجئے۔ انہوں نے سورۃ یاد کرانی چاہی تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اتنے میں مامون کی آنکھ کھل گئی اسے یہ واقعہ معلوم ہوا تو کہا ''واقدی ایک ایسے شخص ہیں جو تاویل تو یاد رکھتے ہیں لیکن تنزیل یاد نہیں رکھتے۔''(۱)

اس کے علاوہ ان کے ضعف حافظہ کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہو چکا۔ اور جس میں مامون نے اپنے عطیہ کے ساتھ انہیں کی روایت کی ہوئی انہیں ایک حدیث یاد دلائی۔ یاد ہوگا علامہ واقدی نے اسے سن کر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا کہ میں تو اسے فراموش ہی کر چکا تھا۔''

ضعف حافظہ کے علاوہ وہ عام طور پر اپنی روایت کو ایسے راویوں کی طرف منسوب کردیتے تھے جن سے خود ان کو سماع حاصل نہیں تھا اصولِ حدیث کی اصطلاح میں اس کو تدلیس کہتے ہیں اور جو شخص ایسا کرتا ہو اسے محدثین کی نگاہ میں کچھ زیادہ پایہ اعتبار حاصل نہیں ہوتا۔

---

(۱) بغدادی ج ۳ ص ۷۔

چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "واقدی تو اسانید گھڑتے ہیں" حضرت یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں "واقدی کو دیکھو وہ عاتکہ بنت عبدالمطلب سے روایت کرتے ہیں اور حمزہ بن عبدالمطلب سے بھی۔"(۱)

ان کی ان ذاتی کمزوریوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں محدثین کو ان کی طرف سے مغالطہ پیدا ہو گیا تھا۔ مثلاً امام احمد بن حنبلؒ کی واقدی کی طرف سے بدگمانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ والی مشہور حدیث حجاب ان کے نزدیک صرف یونس سے مروی تھی اور واقدی اس کو معمر سے روایت کرتے تھے۔ امام احمدؒ کی رائے میں واقدی کا یہ جرم اتنا شدید تھا کہ محض اس کی بنا پر اگر کوئی شخص ان سے روایت کرنی بھی چاہتا تھا تو وہ اسے سختی سے منع کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن المدینی نے ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ پر واقدی سے سماع کرنے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے بالکل صفائی کے ساتھ فرمایا "ایک ایسے شخص سے روایت کرنا کس طرح حلال ہو سکتا ہے جو معمر سے نبہان مکاتب ام سلمہ کی حدیث روایت کرتا ہے، حالانکہ اس میں یونس متفرد ہیں لیکن رمادی بیان کرتے ہیں" میں علی بن مدینی کی زبان سے امام احمد بن حنبل کا یہ قول سننے کے بعد مصر آیا تو وہاں معلوم ہوا کہ ابن ابی مریم بھی نافع سے اس روایت کو نقل کرتے ہیں میں نے خود ابن ابی مریم کی زبان سے یہ روایت سنی تو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ابن ابی مریم بولے "ہمارے شیوخ مصر کو امام زہری کی روایت کی طرف بڑی توجہ ہے۔"(۲)

(یہ حدیث نبہان سے امام زہری نے روایت کی ہے اور ان کی مرویات میں شامل ہے) رمادی اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد آخر میں کہتے ہیں:

"هذا مما ظلم فيه الواقدی."

"اس واقعہ میں واقدی پر ظلم کیا گیا ہے۔"

ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ واقدی کی روایتوں کو مطلقاً مردود نہ قرار دیا جائے۔ البتہ الرحمٰن کی بیان کردہ روایت کسی ایسی روایت سے متعارض ہو جو ان سے زیادہ ثقہ اور معتمد راوی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، تو اس وقت ان کی روایت ترک کر دینی چاہئے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے سامنے ایک مرتبہ واقدی کی ایک روایت نقل کی گئی تو انہوں نے اس کو سن کر اپنا سر جھکا لیا اور زبان سے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔(۳)

وفات: ۱۱ ذی الحجہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔(۴)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۳۔ (۲) یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۴ اور تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۸ میں مذکور ہے۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۳ ص ۱۲۔ (۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۷۔

محمد بن سعد الزہری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

محمد نام۔ ابوعبداللہ کنیت۔ والد کا نام سعد تھا حسین بن عبداللہ بن عبیداللہ بن عبیداللہ بن العباس بن عبدالمطلب کے آزاد کردہ غلام تھے۔ (۱)

ولادت ودیگر حالات:

۱۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔ (۲) اصل وطن بصرہ تھا لیکن بغداد میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہشیم، ولید بن مسلم، ابن عیینہ، ابن علیہ، ابوضمرہ، معن بن عیسیٰ ابوالولید الطیالسی، اور دوسرے کثیر علماء سے روایت کی ہے اور خود ان سے جن حضرات نے روایت کی ان میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں: احمد بن عبید، ابن ابی الدنیا، احمد بن یحییٰ، حارث بن ابی اسامہ، حسین بن محمد بن الفہم (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔ (۳)

علم وفضل:

لیکن ان کو سب سے زیادہ خصوصیت واقدی سے رہی ہے۔ وہ ان کے کاتب تھے۔ اوراس سلسلہ میں انہوں نے عرصہ تک ان کی مصاحبت کی عجیب بات یہ ہے کہ شاگرد ہونے کے باوجود علامہ ابن سعدؒ استناد واعتماد کے لحاظ سے اپنے استاد سے کہیں زیادہ فائق وبرتر ہیں علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں ''وہ اربابِ علم وفضل اور اصحابِ فہم وعدالت میں سے تھے انہوں نے صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے طبقات میں ایک بڑی کتاب لکھی ہے، اور حق یہ ہے کہ خوب اور بہت خوب لکھی ہے'' پھر ایک موقع پر فرماتے ہیں ''محمد بن سعد ہمارے نزدیک اہل عدالت میں سے تھے ان کی بیان کردہ حدیثیں ان کی سچائی کی دلیل ہیں کیونکہ وہ ان میں بہت چھان بین سے کام لیتے تھے۔ (۴)''۔ ابن عماد حنبلی انہیں **''الامام الحبر''** (۵) اور ابن خلکان انہیں **''احد الفضلاء النبلاء الاجلاء''** لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں **''ابن سعد کثیر العلم اور کثیر الحدیث والروایہ تھے۔''** انہوں نے غرائب حدیث اور فقہ پر بھی کتاب لکھی ہے۔ (۶)'' حافظ ذہبی انہیں **الحافظ العلامہ** لکھتے ہیں۔'' (۷)

---

(۱) ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۷۔ (۲) معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۱۶۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۸۲۔ (۴) خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۲۱۔ (۵) شذرات الذہب ج ۹ ص ۶۹۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۸۳۔ (۷) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۔

جلالت علم:

ان کی جلالت علم کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ امام احمد بن حنبلؒ ایسا جلیل المرتبہ محدث ہر جمعہ کو ابن سعد کے پاس اپنا آدمی بھیج کر ان کے ذخیرۂ حدیث میں سے دو جزو منگواتا اور ایک ہفتہ تک ان کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں واپس کر دیتا تھا ابراہیم الحربی کہتے ہیں کہ اگر منگوا کر مطالعہ کرنے کے بجائے امام احمدؒ خود علامہ ابن سعد کے پاس جا کر احادیث کا سماع کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔ (۱)

تصنیفات:

علامہ ابن سعد کثیر التصانیف تھے۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور اور اہم کتاب "کتاب الطبقات" ہے جو عموماً طبقاتِ ابن سعد کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ ابنِ خلکان اور صاحبِ کشف الظنون نے اس کی پندرہ جلدیں بتائی ہیں۔ لیکن مولانا شبلی نعمانی سیرۃ النبی کے مقدمہ میں اس کی بارہ جلدیں ہی بتاتے ہیں۔ صاحب کشف الظنون کہتے ہیں "علامہ ابن سعد نے یہ کتاب پندرہ جلدوں میں تصنیف کی تھی۔ مگر بعد میں خود ہی اس کا انتخاب کیا تھا" اس کے علاوہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی طبقات کا انتخاب کیا جس کا نام "انجاز الوعد المتقی من طبقات ابن سعد" رکھا۔" (۲)

اس کتاب میں سیرۃ نبوی، مغازی، بدریین، مہاجرین، اہل مدینہ، کوفیین، خواتین، انصار، صحابۂ کرام، تابعین عظام وغیرہم سب کا ہی ذکر ہے۔ یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا مکمل نسخہ موجود نہیں تھا۔ سب سے پہلے شہنشاہ جرمن کو اس کی طباعت و اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے ایک لاکھ روپے جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو (Elsachav) کو اس کام پر مامور کیا کہ جہاں کہیں اس کے اجزا ملیں وہ ان کو فراہم کریں۔ چنانچہ پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر مختلف مقامات سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، اس کی طباعت و تصحیح میں جن مستشرقین نے پروفیسر ساخو کی رفاقت کی ان کے نام یہ ہیں۔ جزوف ہوروٹز (joseph Horovitz) جولیس لپرٹ (Julivs Lippert) کے وی زترسٹین (K.V . Zetterstein) اور بروکلمین (Carl Brockelmann) (۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۔ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۹۴۔ (۳) معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۱۶۔

حاجی خلیفہ نے ''الطبقات الکبریٰ'' کے جس انتخاب کا ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ وہی ہے جس کو ''ابن الندیم الطبقات الصغریٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔''

•علامہ ابن الندیم نے ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کا نام کتاب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' بتاتے ہیں۔ (۱) لیکن ''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کا فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے اور غالباً یہ صحیح بھی ہے کہ ''حافظ ابن سعد نے اس نام سے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ جس کو ''کتاب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کہا جاتا ہے وہ دراصل ''کتاب الطبقات'' کا ہی جزء اول ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا تذکرہ ہے۔ (۲)

وفات:

اتوار کے دن ۴ جمادی الثانیہ ۲۳۰ھ میں جبکہ آپ کی عمر ۶۲ سال تھی بغداد میں وفات پائی اور باب الشام کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ (۳)

قتیبہ بن سعید الثقفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

بعض کے نزدیک ان کا نام یحییٰ اور بعض کے نزدیک علی تھا، اور قتیبہ لقب، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ قتیبہ نام تھا اور ابو رجاء کنیت تھی۔ ان کے دادا جمیل بن طریف مشہور اموی گورنر حجاج بن یوسف الثقفی کے غلام تھے حجاج انتہائی ظالم و جابر اور تند مزاج ہونے کے باوجود جمیل کی بڑی تکریم کرتا تھا، انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتا تھا تو حضرت قتیبہ کے دادا کو اپنے دائیں جانب ایک الگ کرسی پر بٹھایا کرتا تھا۔ (۴) بنو ثقیف کے ساتھ اس علاقہ غلامی کے باعث حضرت قتیبہ ثقفی کہلاتے ہیں۔

وطن اور ولادت:

ان کا وطن بلخ کا ایک گاؤں بغلان تھا لیکن عراق میں آ کر آباد ہو گئے تھے کبھی اپنے وطن جاتے بھی تھے تو مہمان داخل، ایک دو دن رہے اور چلے آئے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

---

(۱) الفہرست ص ۱۴۵۔ (۲) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ ''ابن سعد''۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۵ ص ۳۲۲۔

(۴) تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۸۔

"ماکان مثلی فی بغلان مسکنه
ولا یمر بها الا علی سفر"

ترجمہ:" میری طرح بغلان میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کا وطن ہو تو بغلان مگر وہ وہاں جائے مسافر کی طرح۔"

خود اپنے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۱۵۰ھ میں ہوئی تھی لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

تعلیم وتربیت:

حضرت قتیبہ کے والد سعید بن جمیل نہایت نیک تھے ایک مرتبہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک رجسٹر (صحیفہ) ہے۔ سعید نے پوچھا "یارسول اللہ کیا ہے؟" ارشاد ہوا "اس میں علماء کے نام درج ہیں انہوں نے عرض کی "حضرت! ذرا یہ رجسٹر مجھ کو مرحمت فرمادیجئے۔ تاکہ میں یہ دیکھ لوں کہ اس میں میرے فرزند کا بھی نام درج ہے یا نہیں، اس درخواست کے بموجب ان کو رجسٹر دے دیا گیا۔ انہوں نے کھول کر دیکھا تو اس میں ان کے فرزند قتیبہ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ ایک ایسے نیک نیت اور حوصلہ مند باپ کے فرزند ہونے کے باعث ان کو اسلامی علوم وفنون کے ساتھ قلبی لگاؤ تھا، چنانچہ انہوں نے اس ذوق وشوق میں وطن سے نکل کر عراق، مدینہ، مکہ، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا اور ان مقامات کے ائمۂ کبار سے حدیث کے سماع کا شرف حاصل کیا جن میں سے چند نام یہ ہیں۔ امام مالک بن انس، لیث بن سعد، عبداللہ بن لہیعہ، بکر بن مضر، حماد بن زید، ابوعوانہ، اسماعیل بن جعفر، سفیان بن عیینہ وغیرہم۔ انہوں نے یہ سفر نوعمری میں ہی شروع کردیا تھا، خود ان کا بیان ہے کہ میں سب سے پہلے ۱۷۲ھ میں عراق آیا تو میری عمر ۲۳ سال تھی۔"[1]

علم وفضل:

طلب علم میں ان کے شہر بشہر پھرنے اور اکابرِ امت کے فیض التفات نے انہیں علم و فضل کا دریا بنادیا۔ حافظ ذہبی انہیں "الشیخ الحافظ محدث خراسان" لکھتے ہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں "وہ ثقہ عالم، صاحب حدیث، اور کثرت سے سفر کرنے والے تھے"[2] ابن عماد الحنبلی فرماتے ہیں "الیہ المنتهی فی الثقة" ثقاہت ان پر ختم ہے۔[3]

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۷۰۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۰۔ (۳) شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۵۔

تلامذہ:

ان کی عظمت و بزرگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں اس عہد کے بڑے بڑے ائمۂ حدیث داخل ہیں، مثلاً امام احمد بن حنبل، ابوخثیمہ، زہیر بن حرب ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوداؤد السجستانی، ابراہیم الحربی، ابوحاتم الرازی، ان کے علاوہ امام بخاری نے ان کی روایت کی ہوئی تین سو آٹھ اور امام مسلم نے چھ سو اڑسٹھ احادیث ''صحیحین'' میں درج کی ہیں۔ (۱)

حضرت قتیبہؒ نے امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت یحییٰ بن معینؒ کی روایتوں کے لئے اپنے صحیفہ میں الگ الگ علامتیں مقرر کر رکھی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے احمد بن محمد ابن زیاد الکرمینی سے ایک دفعہ فرمایا ''تم کو میری جن روایتوں پر سرخ نشان ملے سمجھنا کہ میں نے وہ روایتیں امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے روایت کی ہیں، اور جن روایتوں پر سبز نشان ہے وہ یحییٰ بن معینؒ سے روایت کی ہوئی ہیں۔'' (۲) لیکن ابوالعباس السراج کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں دو قسم کی نہیں بلکہ سات قسم کی تھیں۔ ان سات میں سے دو تو امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ کے لئے مخصوص تھیں۔ باقی پانچ نشانیاں ابوخثیمہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، یحییٰ الحمانی، ابوزرعہ، عبیداللہ بن عبدالکریم الرازی اور ابوالحسین مسلم بن الحجاج النیشاپوریؒ کے لئے مخصوص تھیں۔ (۳) عبداللہ بن محمد بن یسار بیان کرتے ہیں ''عراق میں کوئی بڑا امام ایسا نہیں ہے جس نے قتیبہ بن سعید سے روایت نہ کی ہو، اور وہ بڑے سچے تھے۔'' (۴)

درس حدیث:

حضرت قتیبہؒ جہاں کہیں تشریف لے جاتے تھے علم و فضل کا دفتر کھل جاتا تھا۔ چنانچہ بغداد میں تشریف فرما ہوئے تو امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ایسے ائمۂ روزگار نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کا درس لیا اور جو لوگ ان سے استفادہ کے موقع کو ضائع کر دیتے تھے وہ موقع نکل جانے پر کفِ افسوس ملتے تھے عمرو بن علی الفلاس بیان کرتے ہیں ''میں ایک مرتبہ منیٰ میں حضرت قتیبہؒ کے پاس سے گزرا تو دیکھا عباس العنبری ان کے پاس بیٹھے ہوئے حدیث لکھ رہے ہیں میں اس وقت گزرا ہوا چلا گیا اور ان سے احادیث کا سماع نہیں کیا۔ لیکن بعد میں مجھ کو اپنے تساہل پر بڑی ندامت ہوئی۔'' (۵)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۶۱۔

(۲) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۶۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً ص ۴۶۸۔ (۵) ایضاً۔

کثرتِ حدیث:

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے حضرت قتیبہ بن سعیدؒ نے حدیث کی جستجو میں ان تمام ملکوں کا سفر کیا تھا جہاں سے انہیں ان جواہر ریزوں کے ملنے کی امید ہو سکتی تھی ان پیہم سفروں میں انہوں نے احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر لیا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا "تم اس موسم سرما میں میرے پاس قیام کرو تو میں تم کو پانچ شخصوں کی روایت کی ہوئی ایک لاکھ حدیثیں سناؤں گا۔ شاگرد نے کہا" غالباً ان میں سے ایک بزرگ تو عمر بن ہارون ہوں گے۔" فرمایا نہیں۔ صرف عمر بن ہارون سے تو میں نے تیس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ یہ ایک لاکھ احادیث تو وکیع بن الجراح، عبدالوہاب الثقفی، جریر الرازی محمد بن بکر البرسانی سے منقول ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ قتیبہ بن سعید نے پانچویں بزرگ کا بھی نام لیا تھا لیکن میں اس کو بھول گیا۔" (۱)

ایک عجیب واقعہ

حضرت قتیبہؒ کی علمی زندگی کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ وہ شروع شروع میں قیاسی مسائل کی جستجو میں زیادہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک توشہ دان لٹک رہا ہے لوگ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس تک پہنچنے سے عاجز ہیں۔ پھر اس کو میں نے لینا چاہا تو میں اپنی سعی میں کامیاب ہو گیا۔ اب میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو مجھے مشرق و مغرب کے درمیان کی کل کائنات نظر آ گئی صبح کے وقت میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا جو خواب کی تعبیر بتانے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا خواب بیان کیا، انہوں نے سن کر فرمایا" بیٹے! اب تم روایات و آثار کی طلب میں مشغول ہو جاؤ۔ کیونکہ صرف روایات و آثار ہی مشرق و مغرب تک پہنچ سکتی ہیں قیاسی مسائل میں اس درجہ وسعت پیمائی کہاں؟" (۲)

تمول:

عام اہل علم کے برخلاف حضرت قتیبہؒ بڑے مالدار بھی تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں" و کان غنیا متمولاً" (۳) ان کے پاس اونٹ، بکریاں، گائیں اور گھوڑے وغیرہ بڑی کثرت سے تھے۔

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۰۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۸۔

حلیہ:

ان کا حلیہ یہ تھا میانہ قد وقامت، سر کے بال آگے سے غائب، پر رونق چہرہ، خوش وضع داڑھی، اخلاق وعادت کے لحاظ سے بھی بڑے مہمان نواز اور خوش خلق تھے۔ [1]

وفات:

شعبان ۲۴۰ھ میں اپنے وطن بغلان میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۱ سال تھی۔ [2]

ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

عبیداللہ نام، ابوزرعہ کنیت، والد کا نام عبدالکریم تھا، عیاش بن مطرف القرشی کے غلام تھے۔ اس لئے قرشی کہلاتے ہیں۔ رے کے باشندے تھے اس نسبت سے انہیں رازی کہا جاتا ہے۔ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار اپنے عہد کے ائمہ کبار میں ہوتا تھا۔ علامہ خطیب بغدادی فرماتے ہیں "وکان اماما ربانیا متقنا حافظا مکثرا صادقاً" [3] حافظ ذہبی انہیں "الامام حافظ العصر" لکھتے ہیں۔ [4] ابن عماد الحنبلی کا ارشاد ہے وہ حافظ تھے اور بلند رتبہ امام تھے۔" [5]

علمِ حدیث:

ان کا خاص فن علم حدیث تھا انہوں نے جن محدثین سے سماع کیا ان کی فہرست طویل ہے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ ابونعیم، قبیصہ، خلاد بن یحییٰ، مسلم بن ابراہیم، قعنبی، محمد بن سابق،

---

(۱) ایضاً۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۱۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۲۶۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴۔ (۵) شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۴۸۔

ابوالولید الطیالسی، یحییٰ بن بکیر المصری، ان بزرگوں کے علاوہ انہوں نے امام احمد بن حنبل کیساتھ بھی مجالست کی تھی۔ان سے حدیث پر مذاکرہ رہتا تھا اور ان سے حدیث کی روایت بھی کی ہے۔"(۱)

طلبِ علم میں سفر:

وہ اپنے شوق وذوق کی تشنگی بجھانے کے لئے شہر شہر اور ملک ملک پھر کر علوم وفنون کے چشموں سے سیراب ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حرمین شریفین، عراق شام جزیرہ خراسان اور مصر کا سفر کیا۔(۲)

قوت حافظہ اور ذکاوت:

کسی علم وفن میں کمال پیدا کرنے کے لئے ذکاوت اور قوتِ حافظہ کی مضبوطی شرطِ اولین کا مرتبہ رکھتی ہے۔قدرت نے ان کو یہ دونوں نعمتیں عطا فرمانے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں "ابوزرعہ قوت حافظہ اور ذکاوت کے لحاظ سے زمانہ کے نمایاں ترین افراد میں سے تھے۔" وہ اپنے حافظہ میں ایسے ضرب المثل تھے کہ لوگ بے خوف وتردد اس کی قسم کھالیتے تھے۔ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "میں نے قسم کھا کر یہ کہا ہے کہ اگر ابوزرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو میری بیوی پر طلاق" آپ نے یہ سن کر فرمایا "تو تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو"(۳) (یعنی واقعی مجھ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں) بہ ظاہر ایک لاکھ حدیث کا یاد کرنا عادتاً دشوار معلوم ہوتا ہے۔اس لئے اس موقع پر یہ بھی معلوم کر لینا چاہئے کہ حضرت ابوزرعہ اس سے کیا مراد لیتے تھے، اس کی توضیح روایت ذیل سے ہوتی ہے۔ایک مرتبہ ابوزرعہ نے کسی شخص سے بیان کیا کہ مجھ کو ایک لاکھ حدیثیں ابوبکر بن ابی شیبہ سے سنی ہوئی یاد ہیں، اس شخص نے پوچھا "تو آپ انہیں مجھے املا کرا سکتے ہیں" آپ نے فرمایا "نہیں لیکن ہاں میں ان کو سنوں گا تو پہچان جاؤں گا۔"(۴)

ابوبکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں "میں نے ابوزرعہ سے بڑا حافظ کوئی نہیں دیکھا۔"(۵)

صغانی کا بیان ہے "(قوت حافظہ کے لحاظ سے) حضرت ابوزرعہ ہمارے نزدیک امام احمد بن حنبل سے مشابہ تھے۔" (۶)

---

(۱) بغدادی ج ۱۰ ص ۳۲۶۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ص ۱۲۴۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴۔
(۴) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۲۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴۔ (۶) ایضاً۔

ان کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو سنتے تھے دماغ میں مرتسم ہو جاتا تھا، خود ان کا بیان ہے ''علم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کو میں نے اپنے کانوں سے سنا ہو اور میرے دل نے اس کو محفوظ نہ کر لیا ہو۔ میں بغداد کے بازاروں سے گزرتا تھا اور بالا خانوں سے گانے والی عورتوں کے سرود کی آواز آتی تھی تو میں اپنی انگلیوں سے کان بند کر لیتا تھا کہ کہیں میرا قلب اس گانے کو محفوظ نہ کر لے۔''(۱)

ابوبکر الموصلی کا بیان ہے ''ہم نے جس کسی شخص کی قوت حافظہ کی شہرت سنی ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے متعلق جیسی کچھ شہرت تھی وہ خود ایسا نہیں تھا۔ لیکن حضرت ابوزرعہ کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے ان کو ہم نے دیکھا تو وہ اپنی شہرت سے کہیں زیادہ ثابت ہوئے۔'' (۲)

کتابت حدیث:

اس غیر معمولی قوت حفظ کے باوجود محض اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ جو کچھ سنتے تھے اسے لکھ لیتے تھے۔ اور پھر ضرورت کے وقت اس سے کام لیتے تھے ان کے سامنے اگر کوئی غلط روایت بھی کرتا تو وہ اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے اس کی تغلیط کی جرأت نہ کرتے۔ بلکہ کتابوں کی مراجعت کرتے تھے۔

احتیاط:

ایک طرف حافظہ کا یہ عالم کہ پچاس پچاس سال کی لکھی ہوئی حدیثیں ان کی یاد داشتوں میں موجود تھیں۔ اور ان کو اس مدت میں انہیں دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا لیکن اس کے باوجود ان کو خوب یاد تھا کہ کونسی حدیث کس یادداشت (کتاب) میں کس صفحہ میں اور کس سطر میں ہے۔ (۳) اور پھر احتیاط کا یہ حال کہ کتاب دیکھے بغیر کسی راوی کی تغلیط نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد بن مسلم اور فضل بن العباس جو صائغ کے لقب سے مشہور ہیں دونوں اپنے ایک نزاع کا فیصلہ کرانے ابوزرعہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک دوسرے کی روایت کو منکر اور ایک روایت کو صحیح قرار دیتا تھا۔ محمد بن مسلم نے حضرت ابوزرعہ سے دریافت کیا ''فرمایئے! ہم میں کون خطا پر ہے اور کون صواب پر؟'' آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش بیٹھے رہے محمد بن مسلم نے

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۳۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۲۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۲۔

پھر دوبارہ کہا ''حضرت! آپ کلام کیوں نہیں فرماتے؟ کچھ تو ارشاد ہو!'' حضرت ابوزرعہ نے اس دفعہ بھی بات ٹالنے کے انداز سے تغافل برتا، لیکن محمد بن مسلم نے بے حد اصرار کیا اور کہنے لگے آپ کے سکوت کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بات بالکل صاف ہونی چاہئے۔ اگر میں خطا پر ہوں تو مجھ کو میری خطا بتا دیجئے، اور اگر یہ (فضل بن العباس) خطا پر ہیں تو ان سے فرما دیجئے کہ تم مخطی ہو۔''

یہ سن کر آپ نے فرمایا 'اچھا میرے بھتیجے ابوالقاسم کو بلاؤ'' فوراً حکم کی تعمیل کی گئی، آپ نے ابوالقاسم سے فرمایا ''تم میرے کتب خانہ میں جاؤ اور پہلی، دوسری اور تیسری الماری کو چھوڑ کر چوتھی الماری دیکھو، اس میں سے سترہواں جزء نکال کر لے آؤ۔'' ارشاد کے مطابق مطلوبہ جزء حاضر خدمت کیا گیا تو آپ نے جھٹ جھٹ اوراق گردانی کر کے حدیث متنازع فیہ نکالی اور محمد بن مسلم کے سامنے رکھ دی۔ محمد بن مسلم نے اس کی قرأت کی تو انہیں معلوم ہوا کہ دونوں غلطی پر تھے۔'' (۱)

محفوظات ابوزرعہ کی تعداد:

غیر معمولی قوت حافظہ، اور پھر شب و روز کی سرگرم جستجو اور طلب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی محفوظات کی تعداد حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ ہوگی۔ اس معاملہ میں امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ اور کس امام کا اندازہ درست ہوسکتا ہے، وہ فرماتے ہیں 'کل صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے بھی کچھ زائد ہے۔ ان میں سے چھ لاکھ حدیثیں اس نوجوان یعنی ابوزرعہ کو یاد ہیں'' امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ''امام احمدؒ کی مراد یہ ہے کہ چھ لاکھ میں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور صحابۂ کرام کے اقوال اور تابعین کے فتاویٰ یہ سب شامل ہیں۔'' (۲)

علماء کا اعتراف:

ان کی جلالتِ شان پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں ''وہ ثقہ تھے، حدیث کے علم، تدین، ورع، علمی مذاکرہ، اور علمی مصروفیت وانہماک اور ترک دنیا و مافیہا کے اعتبار سے حضرت ابوزرعہؒ دنیا کے اماموں میں سے تھے'' (۳) ابوحاتم کا بیان ہے ''حضرت ابوزرعہ کی

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۲۳۰ و ۲۳۱۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۔ (۳) ایضاً۔

وفات ہوگئی اور انہوں نے علم، فقہ سچائی اور طہارت و پاکیزگی کے لحاظ سے اپنا کوئی قائم مقام نہیں چھوڑا، ان کی یہ صفات ایسی ہیں کہ ان میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا اور مجھے نہیں معلوم کہ مشرق ومغرب میں کوئی ان کا ہمسر ہو۔''(۱) اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے ''جو حدیث ابوزرعہ کو محفوظ نہ ہو اس کی کوئی اصل ہی نہیں ہے۔''(۲)

محمد بن یحییٰ فرماتے تھے جب تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ابوزرعہ ایسے ائمہ کبار زندہ رکھے گا وہ خیر و برکت کے ساتھ رہیں گے۔(۳)

امام ابوزرعہ اپنی جلالتِ شان کی وجہ سے دور دراز کے طلبۂ علوم کے لئے مرکز کا حکم رکھتے تھے۔ ان کے بعض شاگرد کسی بڑے امام کے پاس استفادہ کے لئے جاتے تھے وہ حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے اور پھر ان کو حضرت ابوزرعہؒ کی خدمت میں ہی رہنے کا مشورہ دیتے تھے چنانچہ فضلک الرازی بیان کرتے ہیں ''میں مدینہ گیا تو وہاں حضرت ابومصعب کے دولتکدہ پر حاضر ہوا دروازہ سے ایک شیخ نکلے جن کی داڑھی اور سر کے بالوں پر خضاب لگا ہوا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا ''تم کہاں سے آئے ہو؟'' میں نے عرض کیا میں رے سے آرہا ہوں اور ابوزرعہ کا تلمیذ ہوں'' یہ سن کر ابومصعب بولے ''اللہ تمہاری اصلاح کرے۔ کیا تم ابوزرعہ کو چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو؟'' پھر فرمایا ''میں امام مالک بن انسؒ اور دوسرے شیوخ وقت سے بھی ملا ہوں لیکن میری آنکھوں نے ابوزرعہ کا مثل نہیں دیکھا۔''

فضلک الرازی اسی طرح کا ایک اور اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''میں مصر میں حضرت ربیعؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ ان سے سماع حدیث کروں انہوں نے پوچھا ''کہاں سے آرہے ہو؟'' میں نے کہا ''رے سے'' یہ سن کر فرمایا ''اللہ تمہاری اصلاح کرے بھلا تم ابوزرعہؒ کو چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو؟'' ابوزرعہ تو اللہ کی ایک نشانی ہیں اور اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو آیۃ (نشانی) بناتا ہے تو اس کی شکل سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی ثانی نہیں ہے'' اسی طرح کا ایک مقولہ یونس بن عبدالاعلیٰ کا ہے، ان کے سامنے ایک مرتبہ حضرت ابوزرعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے فرمایا ''ابوزرعہ اللہ کی ایک آیۃ ہیں اور اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کسی انسان کو اپنی آیۃ بنا کر بھیج دیتا ہے۔''(۴) عبدالواحد بن غیاث کہتے تھے ''ابوزرعہ نے اپنا جیسا کوئی نہیں دیکھا۔''(۵)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۴۸۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۲۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۲۔

(۴) یہ تینوں واقعات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۳۴۰ سے ماخوذ ہیں۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵۔

درس حدیث:

حضرت ابوزرعہ کی مقبولیت اوران کے باکمال ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ابھی وہ صرف ستائیس برس کے ہی تھے کہ انہوں نے حدیث کا درس شروع کر دیا تھا جس میں بڑے بڑے افاضل روزگار شوق وذوق سے شریک ہوتے تھے ابوحفص عمر بن مقلاص بیان کرتے ہیں ''حضرت ابوزرعہ مصر میں ۲۲۹ھ میں تشریف لائے یہاں جب وہ ابن بکیر، عمرو بن خالد اور دوسرے شیوخ سے سماع حدیث کر چکے تو ان کے پاس اصحاب حدیث جمع ہو گئے ابوزرعہ نے ان سب کو حدیث کی املاء کرائی۔ اس وقت انکی عمر ستائیس برس تھی۔'' یزید بن عبدالصمد کہتے ہیں ''حضرت ابوزرعہ ہمارے شہر میں تشریف لائے تو ان کے اردگرد مستفیدین کا ایک وسیع حلقہ قائم ہو گیا جب آپ یہاں سے تشریف لے جانے لگے تو میں نے کہا حضرت! اب یہاں کے حلقہ کے لئے آپ مجھے اپنا قائم مقام بنا دیجئے۔'' آپ نے اس کو منظور فرما لیا اور مجھ کو اپنا جانشین بنا دیا۔''(۱)

حضرت ابوزرعہ کی وسعتِ علم، ثقاہت، اور شہرت و مرکزیت کا یہ عالم تھا کہ اکابرِ امت بھی ان کے ہوتے ہوئے کسی اور محدث سے احادیث کا سماع کرنے میں پہلوتہی کرتے تھے۔ حضرت قتیبہ بن سعید مشہور محدث ہیں۔ ایک دفعہ یہ رے میں تشریف لائے تو لوگوں نے درخواست کی کہ حدیث کا درس دیجئے۔'' انہوں نے فرمایا ''میں تم لوگوں کے سامنے اس وقت احادیث کی روایت کروں گا جب کہ میری مجلسوں میں احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین علی بن المدینی، اور ابوبکر بن ابی شیبہ شریک ہوں گے۔'' ان حضرات کو قتیبہ کے اس قول کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا ''(ہمیں قتیبہ کی روایتوں کی کوئی ضرورت نہیں) ہمارے پاس ایک ایسا نوجوان ہے جو ان تمام روایتوں کو نقل کرتا ہے جنہیں قتیبہ نے مختلف مجالس میں روایت کیا ہے۔'' (۲)

ہر دلعزیزی:

ان کمالات نے ان کو عوام وخواص کے ہر ایک طبقہ میں اتنا محبوب و ہر دلعزیز بنا دیا تھا کہ اگر کوئی شخص ان کی شان میں گستاخانہ کلمہ کہتا تو لوگ اسے نہایت برا سمجھتے تھے۔ ابوحاتم کہتے ہیں ''میں رازی سے امام ابوزرعہؒ کی شان میں تنقیص کے کلمات سنتا تھا تو میں یقین کر لیتا تھا کہ

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۲۸۔ (۲) ایضاً ص ۳۳۲۔

رازی بدعتی ہے۔"(۱) حضرت اسحاق بن راہویہ نے ایک دفعہ انہیں خط لکھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا "انی ازدادبک کل یوم مسرورا" میں ہر روز آپ کی یاد سے اپنے آپ کو بیش از بیش مسرت پہنچاتا ہوں۔"(۲)

تقویٰ وطہارت:

وہ علم وفضل میں جس طرح یگانۂ روزگار تھے، تقویٰ اور طہارت میں بھی ان کو امتیازِ خاص حاصل تھا۔ ایک مرتبہ ابوبکر المقریؒ نے حضرت ابوزرعہؒ کا تذکرہ کیا۔ کسی شخص نے جو اس وقت مجلس میں حاضر تھا دریافت کیا "ابوبکر! کیا ابوزرعہ ان حفاظ حدیث میں سے تھے جن کو آپ نے دیکھا ہے؟" سائل نے یہ کہہ کر ان حفاظ کا نام بھی لیا، ابوبکر نے جواب دیا "ابوزرعہ تو ان سب حفاظ سے اعلیٰ تھے۔ کیونکہ وہ حفظ حدیث کے ساتھ تقویٰ اور طہارت کے بھی جامع تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ امام احمد بن حنبلؒ کے مشابہ تھے۔" (۳)

اس سلسلہ میں ایک یہ عجیب واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک دفعہ حمدون البرزعی حضرت ابوزرعہؒ کے پاس حدیث لکھنے کے لئے آئے لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں عمدہ عمدہ قیمتی برتن اور فرش فروش دیکھے۔ یہ سب چیزیں دراصل حضرت ابوزرعہؒ کے بھائی کی ملکیت تھیں۔ لیکن حمدون نے غلطی سے ان کو خود انہی کی ملک سمجھا اور اس سے اس درجہ اثر پذیر ہوئے کہ حدیث کا سماع کئے بغیر ہی گھر سے واپس لوٹ آئے اور وطن کی مراجعت کا ارادہ کرلیا۔ رات کو انہیں خواب میں نظر آیا کہ گویا وہ ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہیں اور پانی میں کسی انسان کا عکس پڑ رہا ہے۔ اس عکس سے آواز آئی "اے حمدون! تم ابوزرعہ سے کنارہ کشی کرتے ہو؟ کیا تم کو معلوم نہیں کہ امام احمد بن حنبل ابدال میں سے تھے۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب ومقام پر ابوزرعہؒ کو فائز کردیا۔" (۴)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں "ابوزرعہؒ حفظ، ذکاء، دین، اخلاص اور علم وعمل کے اعتبار سے زمانہ کے یکتا بزرگوں میں سے تھے۔" (۵)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۷ص ۳۲۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۰ص ۳۳۳

(۴) تاریخ بغدادی ج ۱۰ص ۳۳۳۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۱۲۴

عبادت:

حضرت ابوزرعہ پر خشیت ربانی کا جو علماء ربانیین کا خاص شعار ہے، بڑا غلبہ تھا۔ اور اس لئے وہ عبادت بھی بہت کرتے تھے۔ اور اس میں ان کو اس درجہ انہماک ہوتا تھا کہ گردوپیش کی تمام چیزوں سے بے خبر رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے وطن رے کی ایک مسجد میں بیس سال تک نماز پڑھی تھی۔ اس مسجد کے محراب میں کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی لیکن انہوں نے بیس سال تک اس مسجد میں نماز پڑھنے کے باوجود کبھی آنکھ اٹھا کر اس عبارت کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ ایک دفعہ علماء حدیث کی ایک جماعت مسجد میں آپ سے ملنے آئی۔ اور اس نے محراب میں یہ عبارت لکھی دیکھی تو آپ سے سوال کیا ''محرابوں میں کچھ لکھنے کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا'' ہمارے اسلاف کی ایک جماعت اس کو مکروہ سمجھتی تھی، یہ لوگ بولے'' تو پھر آپ کی مسجد میں یہ عبارت کیوں لکھی ہوئی ہے کیا آپ کو اس کی خبر نہیں؟ فرمایا'' سبحان اللہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسجد میں اللہ کے حضور میں حاضر ہو اور پھر وہ اپنے سامنے کی چیزوں کو بھی جانے۔''(۱)

مرجوعۂ خلائق:

دن بھر ان کے پاس مستفسرین اور طلبہ کا ہجوم رہتا تھا چنانچہ انہیں اگر کسی کے ساتھ مذاکرہ کرنا ہوتا تھا تو وہ اسے علی الصباح بلاتے تھے۔ ابن خراش خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ مجھ میں اور حضرت ابوزرعہؒ میں طے ہوا کہ میں علی الصباح ان کی خدمت میں مذاکرہ کے لئے حاضر ہوں گا۔ اس قرارداد کے مطابق میں بہت سویرے بیدار ہو کر اپنے گھر سے روانہ ہوگیا۔ راستہ میں ابوحاتم کا مکان پڑتا تھا۔ وہ اس وقت گھر میں تنہا تھے۔ انہوں نے مجھ کو بلالیا، باتیں ہونے لگیں اس میں کچھ دیر ہوگئی پھر مجھ کو حضرت ابوزرعہؒ کے ساتھ عہد و پیمان کا خیال آیا تو میں لپکا، لیکن ابوزرعہؒ کے مکان پر پہنچ کر دیکھا کہ لوگوں کا زبردست ہجوم ہے اور وہ سب ان پر فرط اشتیاق و عقیدت سے گرے پڑ رہے ہیں۔'' (۲)

حضرت ابوزرعہ کی محبوبیت اور فضیلت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہوگی کہ ایک مرتبہ حضرت ابوزرعہؒ امام احمد بن حنبلؒ کے مکان پر قیام پذیر ہوئے تو امام عالی مقام نے

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج۴ص۷۰۔ (۲) تاریخ بغدادی ج۱۰ص۳۳۳۔

اپنے صاحبزادہ عبداللہ سے فرمایا ''بیٹے! میں صرف فرض نماز پر اکتفا کرتا ہوں اور نوافل کے عوض میں نے اس شیخ (ابوزرعہ) کے ساتھ مذاکرہ کو قبول کرلیا ہے۔''(۱) کمال محبت کی وجہ سے محدثین ان کی درازی عمر کے لئے غائبانہ دعائیں کرتے تھے۔''(۲)

علم وخطاپوشی:

وہ اپنی ذاتی سیرت واخلاق کے اعتبار سے بے انتہا حلیم اور بردبار تھے۔ انہیں اگر کسی شخص کا کوئی عیب معلوم ہوتا تھا تو درپردہ اس کی اصلاح کی کوشش کرتے اور لوگوں میں اس کو بدنام کرنے سے اجتناب فرماتے تھے، خود انہوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا ''میں نے بعض مشائخ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں اور ان کو ایک کتاب میں لکھ لیا تھا۔ چند روز کے بعد اصحاب حدیث میں سے ایک شخص نے مجھ سے اس کتاب کو طلب کیا، میں نے وہ اسے دے دی۔ چھ ماہ کے بعد اس نے کتاب مجھ کو واپس کردی۔ لیکن میں نے اب اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو یہ دریافت کرکے بے حد افسوس ہوا کہ اس شخص نے کتاب میں سات جگہ تغیر وتبدل کردیا تھا۔ میں اس کتاب کو لے کر اس شخص کے مکان پر آیا اور اس سے کہا ''کیا ایسا تغیر وتبدل کرتے ہوئے تجھ کو خدا کا خوف نہیں آیا؟'' اس کے بعد میں نے اس کو وہ ساتوں مقامات دکھائے جہاں اس نے شدید تغیرات کئے تھے اور اس سلسلہ میں بتایا کہ دیکھو یہ روایت ابوضمرہ سے مشہور ہے لیکن تم نے اس کو ابن ابی فدیک کی طرف منسوب کردیا ہے اسی طرح اس روایت میں فلاں راوی تھا، اور تم نے اس کی جگہ فلاں کا نام درج کردیا ہے۔ "کذا و کذا." "وہ تو خیر یہ ہوئی کہ میں نے اپنے شیوخ سے یہ روایتیں جس طرح سنی تھیں مجھ کو یاد تھیں ورنہ میں سخت التباس میں مبتلا ہوجاتا۔'' پس اے شخص تو توبہ کر اور خدا سے ڈر'' اس واقعہ کو سن کر آپ کے بعض تلامذہ نے بیجا اصرار کیا کہ اس شخص کا نام بتادیجئے لیکن آپؒ نے نام لینے سے انکار کردیا۔'' (۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۲۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۱۔

وفات:

ان کی وفات بھی ایسے اچھے طریقہ پر ہوئی کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ ابو جعفر التستری بیان کرتے ہیں ”حضرت ابوزرعہؒ قریب کے ایک مقام اشہران میں فروکش تھے کہ وہاں مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ ہم چند آدمی جن میں ابو حاتم، محمد بن مسلمؒ، منذر بن شاذان اور چند اور علماء عہد شامل تھے ان کے مکان پر عیادت کے لئے حاضر ہوئے۔ مکان پر پہنچ کر دیکھا تو حضرت ابوزرعہ پر عالم نزع طاری تھا ہم سب ان کے قریب بیٹھ گئے، اور ہم نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ”تم اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو“ کے مطابق اس وقت حضرت ابوزرعہ کو کلمۂ شہادت کی تلقین کرنی چاہیئے ہم آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے لیکن ”مرنے والے“ کی جلالتِ شان وعظمت مرتبت کے باعث تلقین کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ آخر کار تدبیر یہ سوجھی کہ اسی حدیث کا مذاکرہ کریں۔ اس طرح خود بخود انہیں تلقین ہو جائے گی۔ چنانچہ ان علماء نے حدیث کی اسناد پڑھنی شروع کی لیکن کوئی اسے تمام نہ کر سکا، کوئی کسی راوی تک پہنچ کر رہ گیا اور کسی نے کسی راوی کے نام پر ہی اسناد کو ختم کر دیا۔ اس پر حضرت ابوزرعہ نے اسی عالم نزع میں پوری اسناد پڑھ کر سنائی اور اس کے بعد حدیث پڑھی ”عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان اخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنة“ سبحان آپ نے اس حدیث کو ختم ہی کیا تھا کہ آخری ہچکی آئی اور مرغ روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر مقام علیین کی طرف پرواز کر گیا۔ یہ واقعۂ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۲۶۴ھ کو پیش آیا دوسرے دن تدفین کی گئی۔ وفات کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا تو نہایت عمدہ حالت میں نظر آئے۔ حفص بن عبداللہ نے دیکھا کہ آسمان پر فرشتوں کو نماز پڑھا رہے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (۱)

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۱۰ص ۳۳۵، ۳۳۶۔

شعبۃ بن الحجاج بن الورد (۱) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

شعبہ نام' ابو بسطام' کنیت' والد کا نام حجاج تھا قبیلہ، ازد کے ایک شخص جہضم بن العتیک کے غلام تھے۔۲ اسی نسبت سے ازدی اور عتکی کہلاتے تھے۔

وطن اور سکونت:

اصل وطن شہر واسط تھا یہیں ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ پھر بصرہ میں آباد ہو گئے تھے، ان کے دو بھائی تھے ایک کا نام بشار اور دوسرے کا نام حماد تھا یہ صرافہ کا کام کرتے تھے' اور حضرت شعبہ کے تمام اخراجات انہی کے ذمہ تھے۔

طلب حدیث:

حضرت شعبہ کو شروع سے ہی شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں ''میں (مشہور عربی شاعر) طرماح کے پاس بیٹھا رہتا' اور اس سے شعر و شاعری سے متعلق سوالات کرتا رہتا تھا۔ ایک روز میرا گزر حکم بن عیتبہ کے پاس سے ہوا' وہ حدثنا کہہ کر ایک اسناد بیان کر رہے تھے اسے سن کر میں نے دل میں کہا یہ اس چیز سے بدر جہا بہتر ہے جس کو میں طلب کرتا ہوں یعنی شعر و شاعری۔ میرا یہ خیال پختہ ہو گیا اور اس روز سے میں نے شعر ترک کر کے حدیث شروع کر دی۔

---

(۱) ترتیب کے لحاظ سے حضرت شعبہ کا ذکر اب سے پہلے ہونا چاہیے تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ مصنف کو اپنی کوتاہ خیالی کی وجہ سے حضرت شعبہ کا تذکرہ لکھنے کا خیال اس وقت آیا جبکہ اس سے پہلے تک کے تمام اجز اطباعت کے مرحلہ ہی بھی گزر چکے تھے۔ مصنف کو اس بے ترتیبی پر شدید ندامت ہے۔ تاہم عدم ذکر سے ذکر بہتر ہے اگرچہ بے ترتیبی کے ساتھ ہی سہی۔

(۲) علامہ نووی انہیں عبدۃ بن الاغر کا غلام بتاتے ہیں جو خود یزید بن المہلب کا غلام تھا۔

(۳) تاریخ بغدادی ج ۹۔

علم وفضل:

اس زمانہ میں کبار تابعین حیات تھے۔ حضرت شعبہؒ کو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سماعِ حدیث کا موقع ملا۔ حصولِ علم کی استعداد فطری اور وہبی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم وحدیث اور اسماء الرجال کے آسمان پر مہر جہاں تاب بن کر نمودار ہوئے۔ حافظ ذہبی انہیں (الحجة الحافظ شیخ الاسلام) لکھتے ہیں۔ علامہ نووی فرماتے ہیں ''وہ اتباع تابعین اور بزرگ ترین محدثین اور عظیم المرتبت محققین میں سے تھے'' ان کی امامت فی الحدیث جلالتِ شان' احتیاط اور اتقان پر سب کا اتفاق ہے۔[1]

حدیث:

حضرت شعبہ نے جن شیوخ حدیث سے سماع کیا ان میں سے چند بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ قتادہ' یونس بن عبید' ایوب' خالد الحذاء' عبدالملک بن عمیر' ابواسحاق السبیعی' طلحہ بن مُصَرِّف' عمرو بن مرة' منصور بن القمر' سلمة بن کُہیل' اسماعیل بن ابی خالد' سلیمان الاعمش' حبیب بن ابی ثابت' حکم بن عتیبہ' عمرو بن دینار' سعد بن ابراہیم رحمہم اللہ' ان کے علاوہ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین کو ان کا دیکھنا ثابت ہے (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔

حاکم کا بیان ہے کہ حضرت شعبہ نے حضرت انس بن مالک اور عمرو بن سلمہ کو بھی دیکھا تھا اور انہوں نے چار سو تابعین سے سماعِ حدیث کیا' پھر خود ان سے روایت کرنے والوں میں بھی متعدد تابعین شامل ہیں۔ مثلاً سعد بن ابراہیم' منصور بن المعتمر' اعمش' ایوب اور داؤد بن ابی ہند۔[2]

تلامذہ:

خود حضرت شعبہ سے جن حضرات نے استفادہ کیا' ان کی فہرست طویل ہے اور اس میں بڑے بڑے اکابر اُمت شامل ہیں۔ مثلاً ایوب السختیانی' الاعمش' محمد بن اسحاق' ابراہیم بن سعد' سفیان الثوری' شریک بن عبداللہ' سفیان بن عیینہ یحییٰ بن سعید' عبدالرحمان بن مہدی' عبداللہ بن مبارک' اسماعیل بن علیة' وکیع' ابوداؤد الطیالسی رحمہم اللہ۔

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۴۵۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۲۔

علماء کا اعتراف:

حضرت شعبہ کے تجر اور امامت فی الحدیث پر سب کا اتفاق ہے۔ حضرت سفیان ثوری انہیں ''امیر المومنین فی الحدیث'' کہتے ہیں۔ عراق میں حدیث کا چرچا انہی کے دم سے ہوا۔ امام شافعی فرماتے ہیں ''اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا جاننے والا کوئی نہ ہوتا۔ (۱) ابولولید الطیالسی بیان کرتے ہیں ''میں حضرت حماد بن سلمۃ کے پاس آتا جاتا تھا' وہ فرماتے تھے کہ اگر تم حدیث کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو حضرت شعبہ کے پاس جاؤ (۲) '' یزید بن ذریع کہتے ہیں ''شعبہ حدیث کے باب میں سب لوگوں سے زیادہ سچے تھے۔ (۳)''

حفظ:

وہ حدیثوں کی کتابت کم کرتے تھے' زیادہ تر انہیں محفوظ رکھتے اور اپنے حفظ سے روایت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ علی بن المدینی نے حضرت یحیٰ القطان سے دریافت کیا'' آپ کے نزدیک طویل حدیثوں کو سب سے زیادہ یاد رکھنے والا کون ہے' سفیان یا شبعہ؟'' انہوں نے جواب دیا'' شعبہ تو اس معاملہ میں بہت بڑھے ہوئے ہیں (۴) ''

علمِ حدیث میں سب سے زیادہ دشوار مرحلہ رجال و رُواۃ کا ہے۔ حضرت شعبہ کو اس میں خاص کمال حاصل تھا۔ چنانچہ حضرت یحیٰ اپنے ایک بیان میں سفیان اور شعبہ دونوں کا فرق و امتیاز یہ بتاتے ہیں کہ سفیان ابواب کے بڑے عالم تھے اور شعبہ رجال کی معرفت میں یکتا تھے خود تو خود انہیں رجال کے معاملہ میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی شخص کی نسبت انہیں معلوم ہو جاتی کہ وہ حدیث کا اہل نہ ہونے کے باوجود روایت کرتا ہے تو اس سے جا کر فرماتے تھے'' تم حدیثیں بیان مت کرو ورنہ میں بادشاہ سے تمہاری شکایت کروں گا (۵) '' امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں'' شعبہ کے زمانہ میں کوئی شخص اُن سے بڑھ کر اور ان سے زیادہ اچھا عالم بالحدیث نہیں تھا۔ (۶) ''

جامعیت:

علم حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے جو شرائط ہیں' حضرت شعبہ ان سب پر حاوی تھے۔ امام احمد بن حنبل ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں'' شعبہ اس معاملہ میں ایک پوری قوم کے برابر تھے۔ یعنی رجال کی معرفت میں' حدیث کی بصیرت میں' تثبت اور اتقان میں اور راویوں کی تنقیح و تحقیق میں (۷)''

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۸۲۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج اص ۲۴۵۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۹ص ۲۶۰۔ (۴) ایضاً ص ۲۶۴۔ (۵) تہذیب الاسماء واللغات ج اص ۲۴۵۔ (۶) تہذیب التہذیب ج ۴ص ۳۴۳۔ (۷) ایضاً ص ۲۴۴۔

جلالتِ شان:

ان کے اس غیر معمولی تجربہ اور کمال کی وجہ سے اس عہد کے تمام علماء اعیان ان کا نام بڑی عزت واحترام سے لیتے تھے' اور دوسروں کو ان کے احترام کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ حماد بن زید بیان کرتے ہیں ''ہم سے حضرت ایوب نے فرمایا تم لوگوں کے پاس واسطہ سے ایک شخص آئے گا جو حدیث کا شہسوار ہے تم اس سے حدیثیں قبول کرو' ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری سے مسلم بن قیتبہ ملے تو انہوں نے مسلم سے پوچھا'' کہیئے! ہمارے استاد حضرت شعبہ کا کیا حال ہے؟(۱) '' ان کی مہارت وامارت فی الحدیث کی وجہ سے محدثین ان کی مخالفت سے ڈرتے تھے۔ حماد بن زید بیان کرتے ہیں ''جو شخص چاہے میری مخالفت کرے۔ مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے بشرطیکہ شعبہ میرے موافق ہوں' لیکن اگر شعبہ ہی کسی چیز میں میرے مخالف ہو جائیں تو پھر میں اس کو ترک کر دوں گا۔ (۲) ''

ابو بکر بن منجویہ کہتے ہیں ''حضرت شعبہ حفظ' اتقان' ورع اور فضل میں اپنے عہد کے سرداروں میں سے تھے اور یہ عراق کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے محدثین کے معاملات کی تحقیق کی۔ ضعیف زاویوں کو ترک کیا اور وہ قابل اقتدار سردار بن گئے بعد میں اہل عراق انہی کے نقش قدم پر چلے'' حافظ ابن حجر اس کلام کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''ابن منجویہ نے یہ جو کچھ کہا ہے بعینہ یہی ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے ابن منجویہ نے یہ الفاظ وہیں سے اڑائے ہیں لیکن انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔''

احتیاط:

حضرت شعبہ کو کثرتِ مزاولت اور فطری استعداد وصلاحیت کی وجہ سے حدیث کے باب میں ایک ایسا ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ جن روایتوں کو انہوں نے نہیں سنا تھا وہ ان کے بھی عالم سمجھے جاتے تھے علی بن مدینی بیان کرتے ہیں ''قتادہ کے شاگرد تین ہیں۔ سعید' ہشام اور شعبہ۔ سعید تو ان سب سے زیادہ متقن تھے' ہشام کا علم کثیر تھا رہے شعبہ' تو وہ سُنی اور بغیر سُنی دونوں قسم کی حدیثوں کے علم میں ان سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ (۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۴۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۶۵۔

لیکن اس فطری ملکہ کے باوصف ان کا احتیاط کا عالم یہ تھا کہ ایک روایت کو کئی بار سنتے تھے۔ایک محدث کا بیان ہے ''حضرت شعبہ جب تک ایک روایت کو دو مرتبہ نہیں سن لیتے تھے وہ اس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے' اور ایسا کرنا ان کے ضبط اور اتقان کی دلیل ہے۔ (۱)'' پھر خواہ کوئی حدیث کیسی ہی جید ہو لیکن اگر اس میں بھی کوئی شک پیدا ہو جاتا تھا تو وہ اسے ترک کر دیتے تھے۔ (۲) ''سَمِعْتُ'' (میں نے سنا) اس وقت تک نہیں کہتے تھے جب تک ان کو واقعی طور پر سماع حاصل نہ ہو۔ (۳)

حضرت سفیان ثوریؒ ان کے اس ورع و اتقاء کی داد اس طرح دیتے ہیں فرماتے ہیں ''میں نے شعبہ سے زیادہ حدیث میں تقویٰ اور ورع اختیار کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ (۴)''
ابونوح کہتے ہیں ''میں عبداللہ بن عثمان کے پاس آ کر جو حضرت شعبہ کے شاگرد تھے'' اور ان کی حدیثیں لکھتے تھے حضرت شعبہ کی احادیث کا مطالعہ کرتا تھا اور ان کو لکھ لیتا تھا' اس کے بعد میں حضرت شعبہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ مجھ سے انہی روایتوں کو بیان کرتے' لیکن املاء کی ہوئی روایتوں میں اور ان میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں ہوتا تھا۔ (۵)''

حماد بن زید جلیل القدر محدث ہیں' وہ فرماتے ہیں ''شعبہؒ اگر کسی روایت میں میرے مخالف ہو جاتے ہیں تو میں ان کا اتباع کر لیتا ہوں کیونکہ وہ ایک حدیث کو بیس بیس مرتبہ سُن کر بھی بس نہیں کرتے اور میں تو صرف ایک مرتبہ سن لینے پر ہی قناعت کر لیتا ہوں۔'' ابوزید الردی فرما رہے تھے ''میں آسمان سے گر پڑوں' یہ مجھ کو زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں روایت میں کسی قسم کی تدلیس کروں۔ (۶)''

محدثین کی نسبت رائے:

وہ محدثین ورُواۃ کی نسبت جو رائے ظاہر کرتے تھے اس کیلئے نہایت بلیغ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ایک مرتبہ کسی نے ابن عون کی نسبت ان سے دریافت کیا تو فرمایا ''وہ تو گھی اور شہد'' ہیں پھر اس شخص نے ابوبکر الہندلی کے بارہ میں ان کی رائے معلوم کی تو آپ نے فرمایا ''رہنے بھی دو! کہیں مجھ کو قے نہ ہو جائے۔ (۷)''

---

(۱) تاریخ بغدادی ج۹ص ۶۵۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تہذیب التہذیب ج۴ص ۳۴۴۔ (۴) بغدادی ج۹ص ۲۶۵۔
(۵) بغدادی ج۹ص ۲۶۵۔ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۸۳۔ (۷) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۸۳۔

حدیث میں غیر معمولی احتیاط اور رواۃ کی تحقیق وتنقیح کے باب میں ان کی اس بلیغ جدوجہد کا ثمرہ یہ ہوا کہ احادیثِ صحیحہ وغیر صحیحہ کے درمیان امتیاز ہوگیا۔ جو روایتیں بالکل غلط طریقہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہو چکی تھیں ان کے قابل اعتبار ہونے کا پردہ چاک ہوگیا چنانچہ حضرت وکیعؒ فرماتے ہیں ''میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جنت میں حضرت شعبہ کے مراتب ودرجات بلند کرے گا کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدافعت کی ہے۔(۱)''

حضرت شعبہ کے لئے دلیلِ افتخار اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ صالح بن محمد سے بیان کے مطابق رجال میں جس شخص نے سب سے پہلے کلام کیا ہے وہ شعبہ ہیں پھر ان کی پیروی یحییٰ القطان نے کی ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت یحییٰ بن معین ان کے نقشِ قدم پر چلے۔(۲)

عربیت:

وہ جس طرح علم حدیث میں امامت کا مرتبہ رکھتے تھے انہیں عربیت میں بھی بڑا کمال حاصل تھا خود ان کا مقولہ ہے ''تم عربیت سیکھو کہ اس سے عقل میں زیادتی ہوتی ہے۔(۳)''

علم شعر:

عربیت میں کمال پیدا کرنے کیلئے عربی شعر وشاعری سے پورے طور پر واقف ہونا نہایت ضروری ہے چنانچہ حضرت شعبہؒ کو بھی عربی کے اشعار کثرت سے یاد تھے اور وہ اس کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اصمعی عربی لغت کا مشہور امام ہے خود اس کا بیان ہے۔ ایک مرتبہ ابوعمرو بن العلاء نے مجھ کو یہ شعر سنایا:

فما جنبوا انا نشد علیهم
ولکن راوا ناراً تحس وتلفع

میں نے یہ شعر حضرت شعبہ کو سنایا تو فرمانے لگے ''افسوس شعر اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ ہے

فما جنبوا انا نشد علیهم
ولکن راوا ناراً تحش وتلفع

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۲۶۳۔ (۲) تہذیب الاسماء واللغات ج ا ص ۲۴۶ (۳) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۶۔

اصمعی اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد کہتا ہے ''شعبہ نے بالکل صحیح فرمایا اور ابو عمرو بن العلاء نے خطا کی'' پھر اصمعی کا بیان ہے ''میں نے شعر کا عالم حضرت شعبہ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا[1]''

ابو زید الہروی کہتے ہیں ''حضرت شعبہؒ عربیت میں اور شعر میں امامت کا درجہ رکھتے تھے[2]''

عبادت:

ان علمی خوبیوں کے ساتھ ان میں عملی کمالات بھی کم نہیں تھے وہ بے حد عبادت گزار اور تقویٰ وطہارت کی زندگی بسر کرنے والے تھے۔ عبادت کرتے کرتے ان کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا اور ہڈیاں نکل آئی تھیں اور رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ رکوع وسجود میں اتنی طوالت کرتے تھے کہ ان پر بھول جانے کا شبہ ہوتا تھا[3] ''ابو بکر البکر اوی بیان کرتے ہیں ''میں نے حضرت شعبہ سے بڑا کوئی عبادت گزار نہیں دیکھا۔[4]''

تقویٰ:

ان کے تقویٰ وطہارت کا یہ عالم تھا کہ حضرت یحییٰ بن معینؒ ان کو امام المتقین فرماتے تھے۔ عبدالرحمان بن مہدی کا بیان ہے ''میں نے دینی تصلّب میں کوئی شخص شبہ سے افضل و برتر نہیں پایا۔[5]''

رحم وکرم:

ان کا دل نہایت رقیق تھا۔ ایک معمولی سے ستم زدہ انسان کی داستانِ مصیبت سن کر تڑپ اٹھتے تھے۔ اگرچہ زندگی تمول اور رفاہیت سے بسر نہیں کرتے تھے تاہم کوئی سائل ان کے بابِ کرم سے محروم نہ لوٹتا۔ نضر بن شمیل بیان کرتے ہیں۔ میں نے حضرت شعبہؒ سے بڑھ کر مسکینوں پر رحم کھانے والا کوئی نہیں دیکھا۔ ان کے سامنے کوئی مسکین آتا تو وہ ازراہِ بے التفاتی اس کی طرف سے اپنا رخ پھیرتے نہیں تھے بلکہ جب تک وہ نظروں سے غائب ہوتا اپنی نگاہوں سے

---

(۱) شذرات الذہب ج اص ۲۴۷۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۸۴۔ (۳) ایضاً۔

(۴) تہذیب الاسماء واللغات ج اص ۲۴۵۔ (۵) خطیب بغدادی ج ۹ص ۲۶۳ ۲۶۲۔

برابر اس کا تعاقب کرتے رہتے تھے۔ (۱) ان کی یہ عادت تھی کہ اثناء درس میں اگر کوئی سائل آ جاتا تو وہ اس کے سوال کو پورا کرنے کیلئے درس بند کر دیتے تھے۔ ان کے تلامذہ کو یہ عادت معلوم تھی اس لئے درس میں خلل پیدا ہونے کے ڈر سے وہ اس کا اہتمام کرتے تھے کہ سائل کے آتے ہی اس کا سوال پورا کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک گداگر آیا حضرت شعبہ درس دے رہے تھے سائل آ کر ذرا کھڑا ہوا ہی تھا کہ پھر بیٹھ گیا۔ آپ نے پوچھا ''کیا حال ہے؟ شاگردوں نے کہا عبدالرحمان بن مہدی نے اس کو ایک درہم دینے کا ذمہ لے لیا ہے۔ (۲)''

حضرت شعبہؒ کے پڑوس میں ایک غریب بڈھا رہتا تھا ایک دن وہ آیا اور کسی چیز کا سوال کیا۔ حضرت شعبہ نے فرمایا ''تم نے مجھ سے کیوں سوال کیا ہے؟ کیا میرے پاس کوئی چیز موجود ہے؟'' بڈھا یہ سن کر جانے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا ''لو! تم میرا یہ گدھا لے جاؤ۔ یہ اب تمہارا ہے'' بڈھا بولا ''مجھ کو اس گدھے کی ضرورت نہیں'' آپ نے فرمایا تم اسے لے جاؤ اسی سے اپنا کام نکالو''۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بڈھا اس گدھے کو لئے ہوئے حضرت شعبہؒ کے تلامذہ کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا یہ لوگ معاملہ کی نوعیت کو سمجھ گئے۔ انہوں نے فوراً اس گدھے کو بڈھے سے پانچ درہم میں خرید کر لیا اور پھر اسے بطور تحفہ حضرت شعبہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت شعبہؒ اپنے گدھے پر کہیں تشریف لے جا رہے تھے راہ میں سلیمان بن المغیرہ مل گئے اور شعبہ سے فقر و فاقہ کی شکایت کرنے لگے حضرت شعبہ نے فرمایا ''خدا کی قسم! اس وقت اس گدھے کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے'' یہ کہہ کر آپ گدھے سے اترے اور اسے سلیمان بن المغیرہؒ کے حوالہ کر دیا (۳) انہیں فقراء کی صحبت طبعاً نہایت مرغوب تھی وہ بسا اوقات فرماتے تھے ''اگر یہ فقراء نہ ہوتے تو میں تمہاری صحبت میں نہ بیٹھتا (۴)''، مسلم بن ابراہیم نے حضرت شعبہ کی اس صفت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں ''حضرت شعبہ فقیروں کے ماں باپ تھے (۵)'' حضرت یحییٰ بن سعید کا بیان ہے ''میں نے حضرت شعبہ سے زیادہ کسی کو غریبوں اور مسکینوں سے محبت کرنے والا نہیں دیکھا'' وہ خود فرماتے تھے ''اگر میرے گھر میں آٹا اور ایک بانس ہو تب بھی میں اسے مسکینوں کو دے دینے میں پس و پیش نہیں کروں گا۔ (۶)''

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۰۔ (۲) ایضاً ص ۲۶۱۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۱۔
(۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔

لباس میں سادگی:

اس قدر سیر چشم اور کشادہ دست ہونے کے باوجود اپنے ذاتی اخراجات میں وہ بے حد سادگی پسند کرتے تھے، سلیمان بن حربؒ بیان کرتے ہیں ''حضرت شعبہؒ جو کپڑے پہنتے تھے ان کا تہہ بند چادر اور کرتہ سب ملا کر بھی دس درہم کی قیمت کے نہیں ہوتے تھے[1] وہ صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی لباس کی سادگی کو پسند کرتے تھے ایک مرتبہ انہوں نے ابونوح کے بدن پر ایک قیمتی کرتہ دیکھا تو پوچھا ''تم نے یہ کرتہ کتنے میں بنوایا ہے۔ ابونوح نے کہا '' آٹھ درہم میں۔ حضرت شعبہ بولے'' تیرے لئے ہلاکت ہو کیا تو خدا سے نہیں ڈرتا۔ تو نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ چار درہم میں کرتہ بناتا اور باقی چار درہم کا صدقہ کر دیتا؟'' ابونوح نے جواب دیا'' میں ایک ایسی جماعت کے ساتھ رہتا ہوں جس کے ہاں شان و شوکت سے رہنا پڑتا ہے'' آپ نے فرمایا '' آخر یہ زیب و زینت کس لئے ہے؟[2] ''

حضرت شعبہؒ کی وفات کے بعد ان کا اثاثہ بیت جس میں ایک گدھا۔ اس کی لگام، زین ان کے بدن کے کپڑے موزہ اور جوتا کل یہ چیزیں تھیں، فروخت کی گئیں تو ان کی مجموعی قیمت سولہ درہم ہوئی۔[3]

دنیوی ساز و سامان سے نفرت:

حضرت شعبہ کو دنیوی جاہ و جلال اور مال و متاع سے دلی بے رغبتی تھی ان کے نزدیک علم کا ذائقہ دنیا کی تمام لذتوں سے بے پرواہ کر دینے کیلئے کافی تھا۔ ان کا قول تھا جو شخص حدیث طلب کرتا ہے وہ مفلس ہو جاتا ہے میں نے اپنی ماں کا ایک طشت سات دینار میں فروخت کیا تھا۔[4] خلیفہ مہدی کو ان کی ذات سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ اس نے تیس ہزار درہم حضرت شعبہؒ کو نذر کئے لیکن آپ نے ان سب کو تقسیم کر دیا۔ اسی طرح بصرہ میں ایک ہزار جریب زمین آپ کو دی تو آپ نے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس جائیداد سے دست بردار ہو گئے۔[5]

---

(۱) تاریخ بغدادی ج۹ص ۲۶۱۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ص ۳۴۴۔
(۳) تاریخ بغدادی ج۹ص ۲۶۲۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۸۳۔ (۵) ایضاً ص ۱۸۴۔

خلفاء میں ان کی عزت واحترام:

حضرت شعبہؒ اپنے ان علمی وعملی کمالات کی وجہ سے دربارِ خلافت میں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کسی شخص کے حق میں ان کی سفارش بے چون وچرا منظور کرلی جاتی ایک مرتبہ آپ کے بھائی کسی معاملہ میں گرفتار ہوکر قید خانہ میں بند کردیئے گئے حضرت شعبہؒ کو اس کی خبر ہوئی تو بھائی کی سفارش کے لئے بغداد تشریف لائے اور یہاں خلیفہ مہدی کے پاس جاکر یہ اشعار پڑھے:

اأذكر حاجتي ام قد كفاني — حياء ک ان شيمتک الحياء
كريم لا يعطله صباح — عن الخلق الكريم ولا مساء
فارضک ارض مكرمة بنتها — بنوتيم وانت لهم سماء

ترجمہ: میں اپنی حاجت بیان کروں یا آپ کی حیاء ہی کافی ہے۔ بے شبہ حیاء آپ کی عادت خاص ہے۔ آپ ایسے کریم ہیں جس کو نہ تو صبح اور نہ شام کریمانہ اخلاق سے باز نہیں رکھ سکتے۔ آپ کی زمین بزرگی کی زمین ہے جس کو بنوتمیم نے بنایا ہے اور آپ ان کے لئے آسمان ہیں۔

خلیفہ نے یہ اشعار سن کر کہا "نہیں اے ابولسبنام! آپ اپنی اس حاجت کا ذکر نہ کیجئے ہم اسے پہچان گئے ہیں اور وہ ہم نے پوری بھی کردی ہے" یہ کہہ کر خلیفہ نے حضرت شعبہؒ کے بھائی کو رہا کردینے کا حکم صادر کردیا۔ (۱)

مکمل تصویر:

ابوزید الہروی نے حضرت شعبہؒ کی مکمل تصویر اس طرح کھینچی ہے جس میں ان کے چہرہ فضل وکمال کا ایک ایک خط وخال نمایاں نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں "میں نے حضرت شعبہؒ کو دیکھا ہے وہ نماز پڑھتے تھے تو اس میں اتنی طوالت کردیتے تھے کہ ان کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا وہ علم، زہد، قناعت، رحم دلی اور خیر کی صفات سے متصف تھے۔ عربیت اور شعر میں سردار کا حکم رکھتے تھے" امام نسائی نے ان کی شان میں ایک اور عظیم الشان جملہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں "اللہ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے امین تین بزرگ ہیں۔ شعبۃ بن الحجاجؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ اور امام مالک بن انسؒ۔ (۲)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۲۵۱۔ (۲) شذرات الذہب ج ا ص ۲۴۷۔

مقولے:

ان کے مقولے نہایت حکیمانہ اور پُر اثر و نصیحت ہوتے تھے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا ''لوگ بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی عقل ان کے ساتھ رہتی ہے اور بعض کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کی عقل گھر کے صحن میں رہتی ہے ان کے علاوہ بعض بدنصیب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس عقل ہی نہیں ہوتی۔'' ان میں پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو بات کرتے ہیں تو بولنے سے پہلے غور کر لیتے ہیں کہ انہیں کیا کہنا چاہیے[1]'' آپ علم حدیث کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کس درجہ مشکل سمجھتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا ''اے کاش! میں حمام گرم کرنے والا ہوتا اور حدیث کی معرفت مجھ کو حاصل نہ ہوتی'' ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا ''مجھ کو دخولِ نار سے ڈرانے والی کوئی چیز حدیث سے بڑھ کر نہیں۔''[2]

وفات:

۷۷ برس کی عمر میں ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت سفیان کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا ''آج حدیث کا علم مردہ ہو گیا[3]''

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۸۳۔ (۲) ایضاً ص ۱۸۵۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ص ۱۸۵۔

اسماعیل بن علیۃ الہروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسبت:

اسماعیل نام ابو بشر کنیت، والد ماجد کا نام ابراہیم تھا' مگر یہ بجائے باپ کی ماں کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ابراہیم بن مقسم عبدالرحمان بن قطبہ الاسد کے غلام تھے۔ ان کے والد مقسم خراسان اور زابلستان کے درمیان ایک جنگ میں پکڑے گئے اور غلام بنا لئے گئے تھے خود ابراہیم کوفہ میں تجارت کرتے تھے لیکن حضرت اسماعیل کی والدہ علیہ جو بنو شیبان کی باندی تھیں نہایت شریف طبع، عقلمند اور فاضلہ تھیں صالح المری اور بصرہ کے دوسرے بڑے علماء اور فقہاء ان کے مکان پر آکر ان سے علمی اور فقہی مسائل میں گفتگو کرتے تھے۔ [1] والدہ کے اس فضل و کمال کی وجہ سے حضرت اسماعیل انہی کی طرف منسوب ہو کر ابن علیہ کی کینت سے مشہور ہو گئے لیکن خود حضرت اسماعیل فرطِ غیرت وحیا سے اپنے لئے اس کنیت کو ناپسند کرتے تھے وہ کہتے تھے۔

"من قال ابن علية فقد اغتابني."

"جو کوئی مجھ کو ابن علیہ کہتا ہے وہ گویا میری غیبت کرتا ہے۔" [2]

ولادت:

حضرت اسماعیلؒ کے والد ابراہیم بن المقسم کوفہ میں تجارت کرتے تھے اور اسی سلسلہ میں ان کی آمد ورفت بصرہ میں بھی رہتی تھی یہیں انہوں نے علّیہ سے نکاح کیا۔ ۱۱۰ھ میں حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ ماں کی وجہ سے ان کا قیام بصرہ میں رہا۔ ان کے ایک بھائی ربعی بن ابراہیم تھے۔

علم وفضل:

ان کے علم وفضل پر سب کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی انہیں "العلامۃ اور الاحد العلام" لکھتے ہیں۔ [3]

ان کی تعلیم کا اہتمام ان کی والدہ ماجدہ نے ہی کیا تھا۔

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۰۔ (۲) بغدادی ج ۶ ص ۲۳۱۔ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۹۶۔

عبدالوارث جوادی جواس زمانہ کے مشہور محدث تھے' بیان کرتے ہیں کہ ایک دن علّیہ اپنے بچے اسماعیل کو لے کر میرے پاس آئیں اور کہا "یہ میرا بیٹا ہے اس کو اپنے ساتھ رکھا کیجئے۔ تا کہ یہ آپ کی سی خو بو پیدا کرلے" عبدالوارث کہتے ہیں "اسماعیل بصرہ کے خوبصورت بچوں میں سے تھے' میں ان کو لئے ہوئے جب چند بیٹھے ہوئے آدمیوں کے پاس سے گزرتا تھا تو ان سے کہہ دیتا تھا "آگے ہو جاؤ" پھر میں ان کو کسی محدث کی خدمت میں حاضر کردیتا تھا' ابراہیم الحربیؒ جو اس روایت کے ناقل ہیں بیان کرتے ہیں ابن علیہ بڑے ہوئے تو اہل بصرہ کو اس میں شک نہیں تھا کہ وہ عبدالوارثؒ سے زیادہ ثبت اور رفقہ فی الحدیث ہیں۔"(۱)

علم حدیث:

ان کو علمِ حدیث میں خاص کمال حاصل تھا۔ غندر جو مشہور امام حدیث ہیں بیان کرتے ہیں "میری نشو ونما علمِ حدیث کی فضا میں ہوئی ہے' اس علم میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کو ابن علیہ پر فضیلت حاصل ہو' امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں "کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس نے خطاء نہ کی ہو البتہ ابن علیہ اور بشر بن المفضل اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔(۲)

ابن المدینی فرماتے ہیں "میں نہیں کہتا کہ کوئی شخص حدیث میں ابن علیہ سے زیادہ ثبت ہے۔(۳)

ہشیم بن خالد کا بیان ہے "ایک مرتبہ بصرہ کے چند حفاظِ حدیث جمع ہوئے تو ان سے کوفہ کے محدثین نے کہا تم اسماعیل کو ہمارے سامنے سے ہٹا دو پھر جس کسی کو تم لانا چاہو لے آؤ(۴) "

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "بصرہ میں ان پر تثبت کی نہایت ہے" حضرت شعبہ انہیں سید المحدثین کہتے تھے(۵) ابن ناصر الدین کہتے ہیں وہ مثبت اور متقن تھے۔ ان کی روایات میں کوئی خطا نہیں پائی گئی۔(۶)

یزید بن ہارون فرماتے ہیں "میں بصرہ گیا تو مجھ کو وہاں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس کو حدیث کے باب میں ابن علیہؒ سے افضل سمجھا جاتا ہو۔"(۷)

حضرت قتیبہ بیان کرتے ہیں "عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ حفاظِ حدیث چار ہیں

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۱۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶۔ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۷۔

(۴) ایضاً ص ۲۷۶۔ (۵) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۳۳۔ (۶) ایضاً۔ (۷) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶

''اسماعیل بن علیہ، عبدالوارث، یزید بن زریع اور وہیب'' حضرت یحییٰ بن معینؒ جو مشہور امام جرح وتعدیل ہیں فرماتے ہیں:

''کان ثقه مامونا صدوقاً مسلماً ورعاً تقیاً.'' (۱)

جلالتِ شان:

ان کی جلالتِ شان کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے محدثین ان کی مخالفت سے خائف رہتے تھے۔ عفان بیان کرتے ہیں ''ایک مرتبہ ہم حماد بن سلمۃ کے پاس بیٹے ہوئے تھے کہ انہوں نے کوئی حدیث پڑھی اور اس میں ان سے ایک خطا ہوگئی۔ کسی شخص نے ان سے کہا ''اس حدیث میں تو آپ کی مخالفت کی گئی ہے'' انہوں نے پوچھا کس نے مخالفت کی ہے'' جواب ملا ''حماد بن زید'' نے آپ نے یہ سن کر اس قول کی طرف کچھ التفات نہیں کیا اور یوں بھی ان کی عادت تھی کہ کسی کے قول کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک شخص نے کہا ''حضرت ابن علیہ بھی تو اس حدیث میں آپ کے مخالف ہیں'' یہ سنتے ہی حضرت حماد کھڑے ہو گئے اور گھر میں تشریف لے گئے پھر باہر آئے اور فرمانے لگے ''تو بس' قول تو اس حدیث میں حضرت اسماعیل بن علیہ کا ہی معتبر ہے'' امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے ''حضرت مالک کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ان کا قائم مقام میرے لئے ابن علیہ کو کر دیا۔ (۲)

ایک مرتبہ یزید بن ہارون نے اپنے حلقہ میں ایک حدیث نقل کی اور سلسلۂ اسناد نقل کرنے کے بعد کہا کہ اس روایت کی تخریج علی نے کی ہے۔ ایک شخص نے کہا ''ابن علیہ تو اس کو مجاہد سے مروی مانتے تھے یزید بن ہارون نے یہ سن کر کچھ التفات نہیں کیا اور انہوں نے پھر وہی خَرَّجَهُ عَلِیٌّ کہا یزید بن ہارون کو غلط فہمی یہ ہوئی تھی کہ وہ ابن علیہ کو ابن عیینہ سمجھتے تھے۔ اس لئے اس شخص نے پھر ذرا زور سے کہا ''ابن علیہ'' اب یزید بن ہارون نے ابن علیہ کا نام سنا تو سخت پریشان ہوئے اور دو مرتبہ ابن علیہ' ابن علیہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ (۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۴

حفظ اور فہم حدیث:

حضرت اسماعیلؒ طلب علم کے زمانہ سے ہی اپنے ساتھیوں میں فہم حدیث کے لحاظ سے ممتاز تھے حاتم بن وردان کا بیان ہے کہ یحییٰ' اسماعیل' وہیب اور عبدالوہاب یہ چاروں ایک ساتھ حضرت ایوب کی مجلس درس میں شریک ہوتے تھے درس سے فارغ ہو کر جب یہ اٹھتے تھے تو سب حضرت اسماعیل کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے اور ان سے سوال کرتے تھے "ایوب نے کہا کہ اور اس سے ان کی مراد کیا تھی؟" اسماعیل ان سب کو جواب دیتے تھے۔ (۱)

حفظ:

حضرت اسماعیلؒ کا تمام ذخیرۂ احادیث ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ وہ لکھتے نہیں تھے وہیب کا قول ہے کہ اسماعیل بن ابراہیم کا حفظ اور عبدالوہاب کی کتاب دونوں برابر ہیں۔ زیاد بن ایوب کہتے ہیں "میں نے ابن علیہ کی کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ لیکن اس کے باوجود تثبت اور ثقاہت کا یہ عالم تھا کہ ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی ہوتی تھی۔ علی بن المدینی جو مشہور امام حدیث ہیں' فرماتے ہیں "محدثین سے تصحیف بھی ہوئی ہے اور خطائیں بھی' لیکن چار محدثین ایسے ہیں جن سے کوئی خطا یا تصحیف نہیں ہوئی' انہیں چار میں ایک ابن علیہ بھی ہیں۔ (۲)

شیوخ:

انہوں نے جن شیوخ سے حدیث کا سماع کیا ان میں چند بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ ایوب السختیانی' علی بن جدعان' محمد بن المنکدر' عبداللہ بن ابی نجیح' حریری' عطاء بن السائب (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔

تلامذہ:

اور خود ان سے جن حضرات نے احادیث کا سماع کیا ان میں بڑے بڑے محدثین شامل ہیں مثلاً شعبہ' عبدالرحمان بن مہدی' علی بن المدینی' احمد اسحاق' بندار وغیرہم (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۲۔ (۲) ایضاً ص ۲۳۲' ۲۳۳۔

فقہ:

حدیث کی طرح انہیں فقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ حضرت شعبہؒ انہیں "ریحانۃ الفقھا" یعنی "فقہاء کے گل تر" کہتے تھے۔ (۱)

قضا:

اس فقہی مہارت وتبحر کی وجہ سے ان کو پہلے پہل بصرہ کے صدقات کا انتظام سپرد کیا گیا پھر بغداد میں فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ ان سے کرایا جانے لگا اور اخیر میں انہیں بغداد کا جج بنا دیا گیا لیکن ایک عجیب واقعہ ایسا پیش آیا کہ انہیں اس عہدہ سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تجارت کرتے تھے اور اس میں انہیں بہت کافی نفع تھا۔ لیکن یہ تجارت خود سرمایہ دار بننے کے لئے نہ تھی بلکہ علماء اور طلبہ کی خدمات اور ان کی دنیوی ضرورتوں سے بے پروا کر دینے کے لئے تھی، چنانچہ وہ خود فرماتے تھے "اگر سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، فضیل، ابن السماک اور ابن علیہ یہ پانچ حضرات نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔" حضرت ابن علیہ کے عہد قضا میں پہلی آزردہ خاطر ہوئے یہاں تک کہ دستور کے مطابق حضرت ابن علیہ گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت عبداللہ بن مبارک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے گفتگو کرنے کے لئے سر بھی نہیں اٹھایا۔ ابن علیہ تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس چلے آئے۔ اور دوسرے دن ایک خط لکھا جس کا مضمون تھا "میں آپ کے احسان وکرم کا منتظر تھا اور آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا لیکن آپ نے مجھ سے کلام نہیں کیا۔ معلوم نہیں جناب کو میری کون سی حرکت ایسی ناگوار ہوئی ہے؟" حضرت عبداللہ بن مبارک نے اس خط کو پڑھنے کے بعد فرمایا "یہ شخص (ابن علیہ) بال کی کھال ہی نکالنا چاہتا ہے، اور پھر جواب میں یہ اشعار لکھ کر ارسال فرمائے:

یا جاعل الدین له بازیا	یصطاد اموال المساکین
احتلت للدینا ولذاتها	بحیلة تذهب بالدین
فصرت مجنونا بها بعدما	کنت دواءً للمجانین
این روایا تک فی سردها	لترک ابواب السلاطین
ان قلت اکرهت فذا باطل	زل حمار العلم فی الطین

(۱) تہذیب التہذیب ج ا ص ۲۷۵۔

ترجمہ: اے دین کو غریبوں کے اموال کا شکار کرنے والے باز بنانے والے تونے دنیا اور اس کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا حیلہ اختیار کرلیا ہے جو دین کو تباہ کر کے رہے گا۔ پہلے تو تو پاگلوں کے لئے دوا کا حکم رکھتا تھا لیکن اب تو خود دنیا کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اب بادشاہوں کے دروازوں سے بے پرواہ ہو کر تیراوہ احادیث و روایات میں مشغول رہنا کہاں ہے؟ اگر تو یہ کہے کہ مجھ کو (عہدہ قضا کے قبول کرنے پر) مجبور کردیا گیا تو یہ عذر سراسر باطل ہے، اب تو بہر حال علم کا گدھا کیچڑ میں پھسل گیا ہے۔

ابن علیہ کے پاس یہ خط پہنچا تو آپ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آپ اسے پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ خط پڑھ لینے کے بعد آپ فوراً مجلس قضا سے اٹھے اور ہارون رشید کے پاس جا کر اپنا استعفیٰ پیش کرتے ہوئے فرمایا خدا کے لئے میرے بڑھاپے پر رحم فرمائے کیونکہ میں اب خطا پر زیادہ صبر نہیں کرسکتا۔ ہارون رشید نے کہا "معلوم ہوتا ہے اس مجنون (عبداللہ بن مبارک نے آپ کو بہکا دیا ہے، حضرت ابن علیہ بولے "بہکایا نہیں، بلکہ انہوں نے تو مجھ کو (ایک مصیبت عظمیٰ سے) نجات دلا دی ہے، اور میں تو دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس سے دستگاری عطا فرمائے۔ ہارون الرشید نے آپ کا استعفا منظور کر کے آپ کو خدمت سے سبکدوش کردیا، حضرت عبداللہ بن مبارک کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے۔ اور حسب سابق ایک تھیلی ابن علیہ کی خدمت میں بھیج دی۔ (۱)

زہد واتقاء:

عملی اعتبار سے بھی ان کا پایہ ہم عصروں میں بہت ممتاز تھا ان پر خشیتِ ربانی کا ہر وقت ایسا غلبہ رہتا تھا کہ وہ ہنستے بھی نہیں تھے ابن عمرو بن زرارہؒ کہتے ہیں "میں چودہ برس تک حضرت ابن علیہ کے ساتھ رہا ہوں۔ لیکن اس مدت میں ان کو کبھی ہنستے ہوئے اور سات سال تک انہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔" (۲)

احمد بن ابراہیمؒ بیان کرتے ہیں میں نے اپنے بعض دوستوں سے سنا ہے کہ "ابن علیہ بیس سال سے نہیں ہنسے۔" (۳)

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ (۲) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵۔ (۳) ایضاً۔

تلاوت قرآن:

انہیں تلاوت قرآن مجید کا بے حد شوق تھا ابن مدینیؒ نے ایک رات ان کے ساتھ بسر کی تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت ابن علیہ نے اسی شب میں ایک تہائی قرآن مجید کی تلاوت کی۔ (۱)

وہ کبھی کبھی نبیذ کا استعمال کرتے تھے بعض لوگوں کو ان کا یہ عمل احتیاط اور ورع کے خلاف نظر آتا تھا۔ لیکن حضرت وکیعؒ کے سامنے ایک مرتبہ اس کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا ''تم اگر کسی بصری شخص کو نبیذ پیتے دیکھو تو اسے متہم کر سکتے ہو۔ لیکن اگر کسی کوفی کو دیکھو تو اسے متہم نہ کرو سائل نے دریافت کیا'' یہ کیونکر؟ فرمایا'' اس لئے کہ کوفی نبیذ از راہ تدین پیتے ہیں اور اسی طرح اہل بصرہ اسے از راہ تدین ترک کرتے ہیں۔ (۲)

عبادت: وہ عبادت بھی بہت کرتے تھے۔ عفان کا بیان ہے کہ ''حضرت ابن علیہ کا شمار ان کے عہد شباب سے ہی بصرہ کے عبادت گزاروں میں ہوتا تھا۔'' (۳)

خلقِ قرآن کا فتنہ اور ابن علیہ:

بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن علیہ خلق قرآن کے قائل تھے اور اگر چہ ان کے کسی قول سے اس کی صراحت نہیں ملتی لیکن ان کے بعض ملفوظات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن ابن علیہؒ ہارون رشید کے بیٹے محمد امین کے پاس گئے تو امین نے آپ کو برا بھلا کہا، اور پھر پوچھا'' کیا آپ خلق قرآن کے قائل ہیں؟'' ابن علیہ نے اس پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا'' میں آپ پر قربان جاؤں، یہ ایک عالم کی لغزش ہے'' اس واقعہ کی شہرت نے ابن علیہ کے بعض خاص معتقدین کے دل میں بھی ان کی طرف سے تکدر پیدا کر دیا تھا۔

لیکن علامہ خطیب بغدادی اس واقعہ کی تردید میں لکھتے ہیں کہ ابن علیہؒ سے خلق قرآن کے قول کو منسوب کرنا ان پر سراسر بہتان وافترا ہے۔ عبدالصمد بن یزید مردویہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن علیہؒ سے خود سنا ہے فرماتے تھے ''القرآن کلام اللہ غیر مخلوق'' (۴) حافظ ذہبی کا رجحان بھی ادھر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں ابن علیہؒ سے تعبیر میں غلطی ہوگئی اور جو کچھ انہوں نے فرمایا، اس سے توبہ کر لی تھی۔ (۵)

وفات: جمعرات کے دن ۲۴ یا ۲۵ ذیقعدہ ۱۹۳ھ کو وفات پائی اور بغداد میں دفن ہوئے۔

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۷۔ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۸۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۹۔

(۴) تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵۔ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶۔

یحییٰ بن محمد بن صاعد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یحییٰ نام۔ابومحمد کنیت۔والد کا نام محمد تھا۔ابوجعفرالمنصور کے غلام تھے۔

علم وفضل:

۲۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔علم وفضل کا شوق شروع سے تھا۔چنانچہ ۲۳۹ھ میں جبکہ ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔انہوں نے حدیثیں لکھنی شروع کردی تھیں۔[1] اوراس شوق وذوق میں انہوں نے شام،عراق،مصراورحجاز کے طویل سفر کئے۔[2] یہی وجہ ہے کہ ان کے شیوخ واساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے جس میں سے چند نام یہ ہیں:

حسن بن عیسیٰ بن ماسرجس،محمد بن سلیمان لوینا۔یحییٰ بن سلیمان بن نھلۃ الخزاعی سوار بن عبداللہ العنبری،احمد بن منیع البغوی۔حسین بن الحسن المروزی،ابراہیم بن سعید الجوہری،ابو ہشام الرفاعی،یوسف بن موسیٰ القطان،محمد بن اسماعیل البخاری (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔

جلالتِ شان:

ان کی محنت اورطلب صادق ثمرآور ہوئی۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا شمار عظیم المرتبت حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔علامہ بغدادی فرماتے ہیں ''حضرت یحییٰ حدیث کے حافظ تھے۔انہوں نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا اوراس کی طلب میں سفر کئے ابن عماد الحنبلی انہیں ''**الحافظ الثقة الحجة**'' لکھتے ہیں۔

''ایں خانہ ہمہ آفتابست'' کے مطابق حضرت یحییٰ تین بھائی تھے۔ایک کا نام یوسف تھا جو سب سے بڑے تھے۔منجھلے بھائی کا نام احمد تھا۔حضرت یحییٰ سب سے چھوٹے تھے یہ تینوں بھائی علم وحدیث کا ذوق رکھتے تھے۔یوسف نے خلاد بن یحییٰ سے روایات کی ہیں اوراحمد نے ابوبکر وعثمان ابن ابی شیبۃ سے لیکن حضرت یحییٰ برادر خورد ہونے کے باوصف دونوں بھائیوں سے اعلم اوراثبت تھے۔'' [3]

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۳ص ۲۳۲۔ (۲) شذرات الذہب ج ۲ص ۲۸۰۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۱۴ص ۲۳۲۔

درایت:

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے حضرت یحییٰ کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے لیکن ان کی شہرت حفظ سے زیادہ درایت میں تھی۔ ابوعلی النیشاپوری کہتے ہیں۔ حضرت یحییٰ کے ہم عصروں میں تمام عراق میں کوئی ایسا نہیں تھا جو فہم کے لحاظ سے ان کے برابر ہو" پھر کہتے ہیں "اور فہم ہمارے نزدیک حفظ سے زیادہ اہم ہے"(۱) ابن الجعابی سے کسی نے پوچھا کیا آپ کے نزدیک ابن صاعد حافظ تھے" وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ ابومحمد کو حافظ تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ وہ صاحب درایت تھے" ابوبکر بن عبدان سے کسی نے پوچھا "حفظ و درایت میں فرق کیا ہے؟ بولے "**الدرایة فوق الحفظ**" درایت کا مرتبہ حفظ سے بڑا ہے۔(۲)

خالد بن عبدان الشیر ازی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن محمد صاعد محمد بن محمد الباغندی سے زیادہ حدیث جانتے تھے اور درایت میں کوئی شخص ان پر فوقیت نہیں رکھتا۔"(۳)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ کے حفظ حدیث سے متعلق بعض لوگوں کو شبہ تھا اور اس لئے وہ ان کا مختلف طریقوں سے امتحان لیتے تھے۔ لیکن امتحان میں ان لوگوں کو ناکامی ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک اچھی شکل و صورت والا شخص حضرت یحییٰ کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ کی ہی روایت کردہ بعض حدیثیں آپ کے سامنے پڑھنا چاہتا ہوں انہوں نے اجازت دے دی۔ لیکن اس شخص نے ان کی روایتوں کی بجائے ابوالقاسم البغوی کی روایتیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت یحییٰ بکمال توجہ سنتے رہے" قرأت کے اختتام پر اس شخص نے کہا "میں نے غلطی سے آپ کے سامنے اس جزء کی قرأت کر دی ہے یہ سب روایتیں تو ابوالقاسم البغوی کی تھیں۔ حضرت یحییٰ بولے "تم نے میرے سامنے جن روایتوں کی قرأت کی ہے۔ وہ سب انہی شیوخ کی زبانی جن سے تم نے سماع کیا ہے خود میری بھی سنی ہوئی ہیں" مزید توثیق کے لئے آپ اپنا صحیفہ نکال لائے اور ورق الٹ الٹ کر دکھاتے رہے کہ دیکھو یہ سب اس میں موجود ہیں اور انہی اسانید کے ساتھ۔(۴)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۲ص ۲۸۰۔ (۲) تاریخ بغدادی ج ۱۴ص ۲۳۳۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۳۰۵۔ (۴) تاریخ بغدادی ج ۱۴ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

فقہ:

حدیث کی طرح انہیں فقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ لیکن وہ حتی الوسع خود فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے ایک دفعہ آپ کے پاس ایک عورت آئی اور پوچھنے لگی اگر کنوئیں میں مرغی گر پڑے تو اس کا حکم کیا ہے؟ پانی پاک رہتا ہے یا ناپاک ہو جاتا ہے؟'' آپ نے فرمایا بھلا مرغی کنوئیں میں کس طرح گر سکتی ہے؟ عورت بولی کنوئیں کا منہ کھلا ہوا تھا'' آپ نے جواب دیا ''پھر تم نے کنوئیں کو ڈھانک کیوں نہیں رکھا تھا کہ اس میں کوئی چیز گرتی ہی نہیں'' ابوبکر الابھری اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد بیان کرتے ہیں کہ دراصل یحیٰ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے عورت کو ٹال دیا۔ لیکن علامہ بغدادی ابوبکر ابھری کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''یہ ابھری کا محض خیال باطل ہے۔ ورنہ یحیٰ ایک جلیل القدر عالم تھے سنن اور ان کے احکام کی ترتیب میں ان کی متعدد تصانیف ہیں جن سے ان کی فقہی مہارت کا ثبوت ملتا ہے رہا عورت کو جواب نہ دینا تو غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مسئلہ میں علماء باہم مختلف ہیں۔ اس لئے حضرت یحیٰ نے کسی ایک امام کی رائے نقل کر دینا ورع کے خلاف سمجھا۔ اور اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ خود منصب افتاء سنبھال کر اپنی طرف سے کوئی جواب دیں۔ (۱)

وفات:

ذوالقعدہ ۳۱۸ھ میں وفات پائی اور باب کوفہ میں دفن ہوئے۔

---

(۱) بغدادی ج ۱۴ ص ۲۳۲۔

ارباب کشف وکرامات اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ

اسلام میں علم وعمل دونوں کا ساتھ رہا ہے اس میں علمِ ظاہری اور علمِ باطنی کی تقسیم کوئی حقیقی تقسیم نہیں ہے۔ اس لئے جو اس عہد کے علماء تھے عمل کے اعتبار سے بھی وہ بناء عصر میں ممتاز ہوتے تھے۔ لیکن یہاں تک تابعین اور تبع تابعین وغیرہم کے زیرِ عنوان صرف انہیں اکابرِ امت کا ذکر کیا گیا ہے جن کا وصف غالب علم وفضل میں امتیاز تھا۔ اور اس بنا پر ان کا شمار محدثین وفقہاء کی صف میں ہوتا ہے۔ اب ہم یہاں چند ان بزرگوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اگرچہ علم و فضل کے لحاظ سے زیادہ نمایاں نہ تھے، لیکن ان کا شمار امتِ مسلمہ کے اکابرِ اولیاء اللہ میں ہوتا تھا۔ اور جو اپنے روحانی کمالات کے اعتبار سے اربابِ کشف وشہود سمجھے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بھی اگر استیعاب سے کام لیا جائے تو اس کثرت سے نام ملتے ہیں کہ ان کے حالات میں ایک مستقل ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ لیکن ہماری کتاب کی تنگ دامانی مجبور کرتی ہے کہ بطور مشتے نمونہ از خروارے۔ اس باب میں بھی صرف چند بزرگوں کا ہی ذکر کیا جائے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔

ابو یحییٰ مالک بن دینار البصری (۱) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

مالک نام، ابو یحییٰ کنیت۔ والد کا نام دینار تھا بصرہ کے رہنے والے اور بنو اسامہ بن لوی بن غالب کی ایک عورت کے غلام تھے۔ ان کے والد بجستان یا کابل کے قیدیوں میں سے تھے۔

علم وفضل:

انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ، احنف، شہر بن حوشب، حسن بصری، ابن سیرین، عکرمہ، عطا بن ابی رباح رحمہم اللہ سے روایت کی اور ان سے جن حضرات نے روایت کی ان میں ان کے بھائی عثمان، ابان بن یزید، حارث بن وجیہ، بسطام بن مسلم العوذی، سعید بن ابی عروبہ، عبداللہ بن شوذب وغیرہم شامل ہیں۔ امام نسائی اور ابن حبان نے ان کو ثقہ کہا ہے۔

ولایت وکرامت:

لیکن علم وفضل سے کہیں زیادہ ان کی شہرت بہ حیثیت ایک عظیم المرتبت ولی اللہ اور بزرگ دین کے ہے۔ چنانچہ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں "وہ بڑے سردار اور مشہور ولی تھے۔" علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں "وہ عالم اور زاہد اور کثیر الورع والتقویٰ تھے۔" امام نووی بھی ان کو الزاہد التابعی لکھتے ہیں۔

تقویٰ وطہارت:

ان کے زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کی کتابت کرتے اور اس سے اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے تھے۔ میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ جو شخص اپنے ہاتھ سے کام کرے وہ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں نیک بخت اور سعادت مند ہے۔"

---

(۱) یہ حالات حسب ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۴، ۱۵۔ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۰، ۸۱، ابن خلکان ج ۱ ص ۴۴۰ و ۴۴۱۔ صفۃ الصفوۃ ج ۳ ۱۱۳ از صفحہ ۱۹۷ تا ۲۰۹ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۷۳۔

ایک مرتبہ ایک مجلس وعظ میں تشریف رکھتے تھے۔اس میں واعظ نے ایک قصہ بیان کیا جسے سن کر لوگوں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔اس کے بعد بہت کافی مقدار میں کھانا آیا۔سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔حضرت مالک بن دینارؒ سے بھی کہا گیا کہ کھانا تناول فرمالیجئے۔آپ نے انکار کر دیا،اور فرمایا اس کھانے کے کھانے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو مجلس وعظ میں رو پڑے تھے،اور چونکہ میں نہیں رویا اس لئے مجھ کو حق بھی نہیں ہے۔

دنیا سے بے تعلقی:

جمال خداوندی نے جس خوش نصیب انسان کے دل کو اپنا آشیانہ بنالیا ہو،اس میں دنیا اور اہل دنیا کی محبت والفت کو تھوڑی سی جگہ بھی نہیں مل سکتی۔حضرت مالکؒ کا حال بھی یہی تھا، انہوں نے کھلے بندوں اعلان کر رکھا تھا کہ ''میرے گھر میں داخل ہو کر کوئی شخص اگر کوئی چیز لینا چاہے تو وہ بے تکلف لے سکتا ہے،وہ اس کے لئے حلال ہے،مجھ کو نہ اب قفل کی ضرورت ہے اور نہ کنجی کی۔'' آپ بسا اوقات مسجد میں سے کنکریاں اٹھا کر فرماتے ''کیا اچھا ہوتا اگر تمام دنیوی ضرورتوں کے لئے صرف یہ کنکریاں میرے لئے کافی ہوتیں اور میں کھانے پینے کی چیزوں سے مستغنی ہو کر ان پر ہی اکتفا کر سکتا کبھی کبھی آپ عالم جذب میں یہ بھی فرماتے کہ ''اگر میرے لئے ریت کا پھانکنا یا مٹی کا کھانا درست ہوتا تو میں اس پر ہی قناعت کر لیتا۔'' ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک ساتھی سے فرمائش کی کہ خالص دودھ اور روٹی لائے،اس نے فوراً تعمیل کی حضرت مالک نے دودھ روٹی پر ڈال دیا اور اسے ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کرنے لگے۔پھر زبان گرامی سے روٹی کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا''میں چالیس سال سے اب تک برابر اپنے نفس کو تجھ سے روکتا رہا ہوں اور خدا کا شکر ہے اس مدت میں اپنے عزم میں کامیاب رہا'' لیکن افسوس! آج تو میرے قریب آ گئی ہے اور چاہتی ہے کہ مجھ پر غالب آ جائے۔چل ہٹ دور ہو یہ فرما کر آپ نے روٹی ہٹادی اور اسے تناول نہیں فرمایا۔

علاوہ ازیں آپ بارہا فرماتے تھے''بدن جب بیمار ہوتا ہے تو اس وقت نہ کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے اور نہ پینا،نہ کوئی راحت راحت ہوتی ہے،اور نہ نیند کا مزہ حاصل ہوتا ہے۔بس یہی حال دل کا ہے۔اس میں دنیا کی محبت جڑ پکڑ لیتی ہے تو لاکھ وعظ کہے جائیں تو بھی کسی کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔'' آپ یہ بھی فرماتے رہتے تھے تم دنیا کے لئے جتنے غمگین ہو گے اسی قدر آخرت کا غم

دل سے کم ہو جائے گا اور تم آخرت کے لئے جتنا غم محسوس کرو گے اتنا ہی دنیا کا غم تمہارے دل سے کم ہو جائے گا۔

عبدالعزیز بن سلمانؒ کہتے ہیں ''میں نے ایک مرتبہ حضرت مالکؒ سے سنا فرما رہے تھے ''جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس کا انجام موت ہے، اور قبر اس کا ٹھکانہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس شخص کی آنکھیں دنیوی لذائذ سے کس طرح شادکام ہو سکتی ہیں اور اس دنیا میں اس کی زندگی کس طرح خوشگوار بن سکتی ہے۔ یہ فرما کر آپ پر رقت طاری ہو جاتی اور آپ زار زار رونے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے'' وہ اگر کسی شخص کو دنیوی آسائشوں اور نعمتوں پر مسرور دیکھتے تھے تو انہیں رنج اور افسوس ہوتا تھا اور فرماتے تھے ''خدا کی قسم! آخرت کا غم اور دنیا کی خوشی دونوں کسی ایک شخص کے دل میں جمع نہیں ہو سکتیں ابوالحسن البصریؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت مالک بن دینارؒ جیل خانہ کا معائنہ کرنے گئے وہاں انہوں نے ایک ایسا شخص دیکھا جو ٹیکس (خراج) کی رقم میں خیانت کرنے کے الزام میں محبوس تھا، اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس قیدی نے حضرت مالکؒ کو دیکھ کر کہا: ''حضرت! کیا آپ کو میری اس تکلیف پر رحم نہیں آتا؟'' اتنے میں حضرت مالکؒ نے اپنا سر اٹھایا تو انہیں کنڈی لٹکی ہوئی نظر آئی۔ پوچھا یہ کس کی ہے'' قیدی نے کہا میری ہے آپ نے اس کو نیچے اُتروا کر دیکھا تو معلوم ہوا اس میں (بھنے ہوئے) مرغ اور حلوے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے قیدی سے فرمایا ''میاں یہی تو وہ چیزیں ہیں جنہوں نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوائی ہیں تو پھر غم کس بات کا ہے؟'' آپ نے یہ فرمایا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

بصرہ کے بازاروں میں چلتے پھرتے آپ کو مرغوب چیزیں نظر آتیں تو گھر واپس آ کر اپنے نفس سے خطاب کر کے فرماتے تھے ''اے نفس تو خوش رہ کیونکہ میں نے یہ چیزیں تجھ پر حرام نہیں کی ہیں، بلکہ میں تجھ کو صرف اس لئے ان سے روکتا ہوں کہ تیری حرمت و عزت باقی رہے۔

وہ بسا اوقات یہ بھی فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو محبوب بناتا ہے دنیا میں سے اس کا حصہ کم کر دیتا ہے تا کہ وہ اس سے فارغ القلب ہو کر ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ اور اگر وہ کسی کو ناپسند کرتا ہے تو دنیا کے کسی مشغلہ کا طوق اس کی گردن میں ڈال کر فرماتا ہے ''چل ہٹ میرے سامنے سے دور ہو۔ اب میں تجھ کو سامنے نہ دیکھوں۔

دنیا سے اس درجہ بے تعلق رہنے کی وجہ سے وہ مال و متاع جہاں میں سے صرف چند چیزیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ میں ان کے گھر میں آگ لگ گئی۔ آپ اپنی چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ لوگوں نے کہا ''حضرت! گھر کی تو خبر لیجئے'' فرمایا ''گھر میں رکھا ہی کیا ہے، جو لوگ بھاری بھاری سامان رکھتے ہیں ان کے لئے ہلاکت ہے۔ ایک دفعہ آپ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے، سفر بحری تھا، کشتی گھاٹ کے قریب پہنچی تو ٹیکس وصول کرنے والا کشتی میں آیا اور کہا ''تم میں سے کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے'' حضرت مالک بن دینارؒ نے یہ سنا تو آپ نے اپنے کپڑے کاندھے پر ڈالے اور پھر ایک چھلانگ لگائی تو سیدھے زمین پر تھے۔ ٹیکس وصول کرنے والے نے پوچھا ''یہ کیا، آپ کشتی چھوڑ کر کیوں چلے آئے'' ارشاد ہوا ''میرے ساتھ کوئی چیز ہی نہ تھی'' وہ بولا ''اچھا تو جایئے'' حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں ''اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا کہ بس آخرت کا معاملہ بھی اسی طرح ہوگا۔''

ایک مرتبہ چند ارادتمندوں کی ایک جماعت آپ سے شرف زیارت حاصل کرنے کے لئے رات کے وقت مکان پر حاضر ہوئی، دیکھا کہ گھر میں چراغ ندارد ہے اور آپ ایک روٹی کو ہاتھ میں لئے ہوئے مل رہے ہیں۔ ان لوگوں نے پوچھا ''حضرت! کیا خوب چراغ بھی موجود نہیں ہے، اور روٹی کھانے کے لئے کوئی سالن بھی نہیں ہے؟'' فرمایا ''بس مجھ کو چھوڑ و بھی، خدا کی قسم میں تو ان چیزوں پر ہی نادم ہوں جو میرے پاس پہلے تھیں۔

خوف خدا:

تمام فضائل اعمال اور محاسن اخلاق کی جڑ اور بنیاد خوف خدا ہے۔ اس خاص وصف میں حضرت مالک بن دینارؒ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ کسی قاری نے آپ کے سامنے آیت ''اِذَا زُلْزِلَتِ الارض زلزالها'' تلاوت کی تو اسے سنتے ہی آپ پر لرزہ طاری ہوگیا اور زار و قطار رونے لگے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر تمام اہل مجلس بھی اپنے آپے سے باہر ہوگئے۔ اور انہوں نے بھی رونا پیٹنا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ قاری آخری آیت **''فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره''** پر پہنچا تو آپ کی حالت بالکل ہی دگرگوں ہوگئی اور آپ کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں آپ کو گھر پہنچایا گیا۔

عبداللہ بن مرزوق بیان کرتے ہیں' ایک روز حضرت مالک بن دینارؒ قبرستان میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک جنازہ دیکھا جسے دفن کیا جارہا تھا۔ آپ بھی قبر کے کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے اور جنازہ کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اپنے نفس سے مخاطب ہو کر یوں ارشاد فرمایا ''اے مالک! دیکھ لے، کل تجھ کو بھی یہیں آنا ہے اور یہاں قبر میں ٹیک لگانے کے لئے تجھے کوئی تکیہ بھی نہیں ملے گا'' آپ دیر تک بار بار یہی فرماتے رہے یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر قبر کی آغوش میں گر پڑے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے قبر سے باہر نکالا اور اسی حالت میں آپ کو گھر لے کر گئے۔

خوفِ خدا کی زیادتی کی وجہ سے خود تو کیا ہنستے دوسروں کو اگر ہنستے ہوئے دیکھتے تو ان کی عاقبت فراموشی پر آپ کو قلبی صدمہ اور رنج محسوس ہوتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو خندہ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا' اگر مجھ کو بصرہ کے تمام اموال اور ہار دے دیئے جائیں اور اس کے عوض مجھ سے ہنسنے کا مطالبہ کیا جائے تو میں اس وقت بھی اسے پسند نہ کروں گا کہ میرا دل ہنسنے کے لئے فارغ ہو سکے۔

ابو صالح مغیرہ بن ابی حبیبؒ حضرت مالک بن دینارؒ کے داماد تھے، ایک مرتبہ ان کو خیال ہوا کہ حضرت مالکؒ کا انتقال ہو جائے گا اور میں ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود ان کے خاص خاص اعمال سے بھی واقف نہیں ہوں گا۔ یہ تو بڑے افسوس کی بات ہوگی اس لئے آج رات کو چھپ کر دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ حضرت مالک گھر میں رات کے وقت تشریف لائے کھانا ان کی خدمت میں پیش کیا گیا وہ انہوں نے تناول فرمایا، پھر نماز پڑھنی شروع کی اسی حالت میں ان پر حد سے زیادہ رقت طاری ہو گئی۔ اور انہوں نے اپنی ڈاڑھی پکڑ کر کہنا شروع کیا ''اے خدا! قیامت کے دن جب تو اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو اس وقت مالک بن دینارؒ کے بڑھاپے کو دوزخ پر حرام کر لیجئے'' ابو صالح بیان کرتے ہیں حضرت مالک اسی جملہ کو بار بار کہتے جاتے تھے، یہاں تک کہ میری آنکھ لگ گئی کچھ دیر کے بعد میں بیدار ہوا تو دیکھا حضرت مالک اسی حالت میں کھڑے ہیں اور اسی جملہ کو بار بار دہراتے جاتے ہیں اور اب شدت جزع وفزع سے اس حالت میں اتنا اضافہ اور ہو گیا ہے کہ وہ ایک قدم آگے رکھتے ہیں اور ایک پیچھے۔ ابو صالح کہتے ہیں' طلوع فجر تک ان کی یہی حالت رہی۔

ایک دفعہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن بارش ہوتی نہیں تھی لوگ بے چینی سے بارش کا انتظار کررہے تھے۔ حضرت مالک نے یہ دیکھ کر فرمایا ''تم سب تو بارش کی آس لگائے بیٹھے ہو، لیکن مجھ کو خوف ہے کہ کہیں ان بادلوں سے پتھر نہ برسنے لگیں۔ اگر پتھر نہ برسیں تو سمجھو بڑی خیر ہوئی اور خدا نے بڑا فضل وکرم کیا۔''

علم بے عمل کی مذمت:

حضرت مالک بن دینارؒ کے ارشادات گرامی میں علم بے عمل کی مذمت میں متعدد عبرت انگیز مقولے ملتے ہیں، ایک موقع پر آپ فرماتے ہیں 'عالم جب اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو اس کا وعظ دلوں سے ایسا ہی پھسل جاتا ہے (یعنی کوئی اثر نہیں کرتا) جس طرح بارش کا قطرہ پتھر کی چٹان سے''ایک جگہ بے عمل قاریوں کی تمثیل میں آپ فرماتے ہیں۔

اس زمانہ کے قاریوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جیسے ایک جال بچھا رکھا ہو اور جال میں گیہوں کا کوئی دانہ اس میں ڈال دیا ہو۔ پھر کوئی چڑیا اڑ کر جال کے پاس آئے اور پوچھے ''اے جال تجھ کو زمین میں کس چیز نے غائب کردیا ہے'' جال جواب دیتا ہے ''تواضع نے'' پھر چڑیا پوچھتی ہے 'اچھا تو دبلا کیوں ہورہا ہے'' کہتا ہے زیادہ عبادت کرنے کی وجہ سے'' چڑیا سوال کرتی ہے 'اور تو نے یہ گیہوں کا دانہ کیوں ہلگا رکھا ہے'' جال کہتا ہے ''یہ روزہ داروں کے لئے ہے'' اب چڑیا اس کے چکمہ میں آ کر کہتی ہے ''بیشک تو بہت اچھا پڑوسی ہے'' اس گفتگو کے بعد مغرب کا وقت ہوتا ہے اور چڑیا روزہ افطار کرنے کے لئے جال کے پاس آتی ہے۔ اور جونہی وہ افطاری لینے کے لئے آگے بڑھتی ہے جال اس کا گلا گھونٹنے لگتا ہے۔ اب غریب چڑیا کہتی ہے 'اگر دنیا میں عبادت کرنے والے سب ایسے ہی ہوتے ہیں تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ عبادت گزار خیر اور بھلائی سے بالکل محروم ہیں۔''

ایک موقع پر آپ نے نہایت فصیح وبلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ لعلہ یذکر او یخشی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارِ فرار (بھاگ جانے کی جگہ) اور آخرت کو دار قرار (ٹھہرنے کی جگہ) بنایا ہے۔ پس اے لوگو تم اپنے مقر کے لئے مفر سے توشہ لیتے جاؤ اور قبل اس کے کہ تمہارے بدن دنیا سے نکلیں تم دنیا کو اپنے دلوں سے نکال باہر کرو، اور دیکھو تم خود اپنی پردہ داری اس ذات

مجتمع الصفات کے سامنے نہ کرو جو تمہارے تمام بھیدوں سے واقف ہے۔ تم اگرچہ دنیا میں زندگی بسر کرتے ہو لیکن تمہاری تخلیق اس دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا کے لئے کی گئی ہے۔ بس سمجھ لو دنیا کی مثال زہر کی سی ہے جو اسے جانتا ہے نہیں کھاتا اور جو نہیں پہچانتا وہ اسے کھالیتا ہے۔ یا یوں کہو دنیا ایک خوبصورت سانپ کی مثال ہے کہ طرح طرح کی دھریوں اور لکیروں کی وجہ سے حسین معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے اندر زہر پوشیدہ ہوتا ہے۔ عقلمند اس سے بچتے ہیں۔ لیکن بچے سانپ کی جلد پر مائل ہو کر اسے اپنے ہاتھ سے پکڑنے لگتے ہیں۔''

معرفتِ نفس:

معرفت نفس عرفانِ ایزدی کا زینہ ہے، اور معرفتِ نفس کی علامت یہ ہے کہ انسان کو کسی مدح سے مسرت ہو اور نہ کسی کی مذمت پر وہ رنج و قلق محسوس کرے۔ حضرت مالک بن دینارؒ کا یہی حال تھا۔ وہ فرماتے تھے ''جب سے میں نے لوگوں کو پہچانا، اس وقت سے میں نہ ان کی مدح پر خوش ہوتا ہوں اور نہ ان کی مذمت سے بددلی محسوس کرتا ہوں کیونکہ جو شخص مدح کرتا ہے وہ افراط سے کام لیتا ہے اور جو مذمت کرتا ہے وہ تفریط کرتا ہے۔

للّٰہیت اور خلوص:

ان کا کوئی کام ایسا نہیں ہوتا تھا جس سے وہ تقرب الی اللہ کی توقع نہ کرتے ہوں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا ''میں دیکھتا ہوں کہ تم میں سے ہر شخص ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے کا آرزومند رہتا ہے جو خوبصورت ہو۔ اور جس کو اس کے والدین نے کھلا پلا کر خوب فربہ اندام اور گداز بنا دیا ہو۔ یہ لڑکی اپنے جسمی موزونیت اور دلکشی کے باعث اس شخص کے دل پر پوری طرح قبضہ جما لیتی ہے اور وہ اس کا اطاعت گزار بن کر اس کی ہر قسم کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے ہمہ اوقات کمر بستہ رہتا ہے لیکن اس کے برخلاف وہ شخص کس قدر خوش نصیب ہے جو ایک کمزور اور یتیم لڑکی سے نکاح کرے اس کو کپڑے پہنائے تو اجر ملے اور اس کے لئے سامان زینت و آرائش مہیا کرے تو اس پر بھی اس کو اجر و ثواب ملے۔

امر بالمعروف:

جن آنکھوں میں جلال و جمال خداوندی بسا ہوا نہیں دنیا کے کسی امیر کبیر یا والی سلطنت و حاکم کی شان و شوکت ایک لمحہ کے لئے خیرہ نہیں کرسکتی۔ حضرت مالک بن دینارؒ نشۂ توحید سے ہر وقت مخمور رہتے تھے۔ انہیں کسی کی کوئی حرکت خلاف شریعت نظر آتی تھی تو اسے اس کے سامنے برملا کہہ گزرتے اور انجام و نتیجہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ کا گورنر آپ کے سامنے سے گزرا، دولت و حکومت کے نشہ میں اٹھلاتا اور اکڑتا ہوا حضرت مالک نے یہ دیکھ کر فوراً فرمایا ''اپنی اس طرز رفتار کو بدل دو'' حاکم بصرہ کے نوکر حضرت مالکؒ کی طرف لپکے کہ انہیں اس گستاخی کی سزا دیں لیکن گورنر نے نوکروں کو منع کر دیا۔ اور خود حضرت مالکؒ کی طرف رخ کر کے کہنے لگا ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پہچانتے نہیں ہیں'' آپ نے جواب دیا ''اور جناب! مجھ سے زیادہ آپ کو جاننے والا کون؟ تیرا آغاز ایک نسل پیدا کرنے والا نطفہ ہے اور تیرا انجام ایک بدبودار مردہ جسم ہے، اور آغاز و انجام کا درمیانی زمانہ تیرے کام کرنے کا زمانہ ہے، جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔'' گورنر نے یہ سن کر سر جھکا لیا اور اپنی راہ لی۔

وفات:

۱۲۷ھ میں وفات پائی۔ وفات کا واقعہ بھی نہایت عبرت انگیز ہے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک شخص نے اصرار کیا کہ خواب سنا دیجئے۔ آپ نے بیان کرنا شروع کیا۔ بیان کرتے کرتے انتہا درجہ کی رقت طاری ہوگئی، زار و قطار رونے لگے۔ منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کو گمان ہوا جگر پھٹ گیا ہے اسی عالم میں انہیں گھر پہنچایا گیا، کچھ دنوں تک بیمار رہے۔ دوست احباب اور عقیدت مند عیادت کے لئے آتے تھے۔ آخر کار اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔

مرتے وقت خدا کا خوف اس درجہ غالب تھا کہ وفات سے چند لمحے بیشتر فرمایا اگر مجھ کو بدعت طرازی کے جرم کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اپنے متعلقین کو ہدایت کرتا کہ مرنے کے بعد وہ میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈالیں اور میرے ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لے جا کر باندھ دیں۔ پھر اسی حالت میں مجھ کو دفن کر دیا جائے تاکہ میں قیامت کے دن خدا کے سامنے حاضر ہوں تو ایک بھگوڑے غلام کی طرح حاضر ہوں۔''

ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخی (۱) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام و نسب:

معروف نام، ابو محفوظ کنیت، والد کا نام فیروز یا فیروزان تھا۔ بغداد میں ایک محلّہ سے کرخ، وہاں کے باشندہ تھے اس لئے کرخی کہلاتے ہیں۔

عام حالات:

حضرت معروف کا شمار اگرچہ علماء اور محدثین میں نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بحرِ ناپیدا کنارِ روحانیت و معرفت کے ایسے کامیاب شناور تھے کہ ان کی اس صفت کے سامنے علمِ ظاہر کے کمال کی کمی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ ان کا شمار کبارِ اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ ان کی نظر حقیقت آشنا تھی مجاز کے حجابات راہ میں حائل نہیں ہو سکتے تھے ان کا علم قیاس و تخمین کی حد بندیوں سے بہت بلند، ایمان و یقین کی طمانیت بخشیوں سے صد آفتاب در کنار تھا۔ حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے غلام تھے۔

بچپن:

بچپن سے ہی ایسے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آگے چل کر زمانہ کی ایک نادر شخصیت بننے والے ہیں ان کے والدین عیسائی تھے اپنے دستور کے مطابق انہوں نے حضرت معروف کو ایک عیسائی معلم کے پاس پڑھنے کے لئے بٹھا دیا۔ ان کا استاد کہتا ''کہو خدا تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے'' لیکن فرماتے ''نہیں بلکہ وہ ایک ہی ہے''، معلم عیسائی تھا اور سخت متعصب ایک بچہ سے اپنے عقیدہ کے خلاف یہ جملہ کس طرح سن سکتا تھا، غضبناک ہو کر وہ انہیں سخت زد و کوب کرتا۔ کشمکش زیادہ بڑھی تو حضرت معروف اپنا گھر چھوڑ کر نکل بھاگے ماں باپ کو اور خصوصاً ماں کو بے حد محبت تھی۔ فرقتِ پسر ناقابل برداشت ہوئی تو دونوں نے

---

(۱) یہ سب حالات تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۴ اور تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۳ ص ۱۹۹ تا ص ۲۰۸ اور صفۃ الصفوۃ ج ۱۲ صفحہ ۱۷۹ تا صفحہ ۱۸۳ سے ماخوذ ہیں۔ علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت معروف کرخی کے حالات میں الگ ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

کہنا شروع کیا ''اے کاش معروف واپس تو آ جائے، ہم بھی اُسی کے دین کو اختیار کرلیں گے جسے وہ اختیار کر چکا ہے اور اس معاملہ میں اس کا اتباع کریں گے۔'' ''میاں'' معروف کئی سال تک وادئ غربت میں دشت پیمائی کرتے رہے۔ توفیق خداوندی نے ہاتھ پکڑا۔ تبلیغ اسلام کے جوش نے حوصلہ دلایا، گھر کی اصلاح کے جذبہ نے ہمت کو ابھارا پہلے خود حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے دست مبارک پر باقاعدہ مشرف باسلام ہوئے، پھر والدین کے گھر کا رخ کیا۔ دروازہ پر پہنچ کر کنڈی کھنکھٹائی اندر سے آواز آئی ''کون ہے؟'' انہوں نے جواب دیا ''میں ہوں معروف'' پوچھا گیا ''کس دین پر؟'' بولے ''علی الاسلام'' یہ سنتے ہی ماں باپ اپنے قول کے مطابق اسلام لے آئے۔ اس طرح یہ مکتب سے بھی بھاگا ہوا بچہ دو سنجیدہ اور عقیل و فہیم بوڑھوں کی ہدایت کا سبب بنا۔

خوفِ خدا:

ان پر خوفِ خدا کا غلبہ اس درجہ تھا، اور حق یہ ہے کہ بحکم رأس الحکمہ مخافة الله یہی تمام نیکیوں اور سعادتمندیوں کا سرچشمہ ہے کہ یحییٰ بن جعفر بیان کرتے ہیں ''میں نے ایک مرتبہ حضرت معروف کو دیکھا اذان دے رہے تھے۔ جب اشھد ان لا الہ الا اللہ کہا تو مارے دہشت اور خوف کے ان کی ڈاڑھی اور زلفوں کے بال کھڑے ہو گئے یہی وجہ تھی کہ وہ اذان دیتے اور اقامت بھی کہہ لیتے تھے۔ لیکن نماز پڑھانے کی جرأت کبھی نہیں کرتے تھے۔

دنیا سے بے رغبتی:

جس شخص کے دل میں خشیت ربانی نے استیلا پالیا ہو اس کی نظر میں دنیوی لذائذ و مرغوبات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت معروفؒ بھی دنیا سے بالکل بے تعلق رہتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ ان کی وفات ہونے لگی تو لوگوں نے اصرار کیا کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا ''میں مرجاؤں تو میری قمیص کا بھی صدقہ کر دینا میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو جس طرح یہاں برہنہ آیا تھا۔ اسی طرح یہاں سے بھی برہنہ ہو کر جاؤں۔'' سری السقطیؒ جو خود اکابر صوفیائے اسلام میں شامل ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت معروفؒ سے سوال کیا لوگ کب اللہ کی پوری اطاعت پر قادر ہو سکتے ہیں۔ ارشاد ہوا ''اس وقت جبکہ دنیا کی محبت ان کے دلوں سے خارج ہو جائے۔ اگر دنیا کی محبت سے ان کے دل فارغ نہیں ہیں تو ان کا ایک سجدہ بھی درست نہیں ہو سکتا'' وہ عمر کے ایک لمحہ کو

بھی ضائع دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے خود اس پر عامل تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ایک دفعہ ان کے پاس چند آدمیوں کی ایک جماعت آ کر بیٹھ گئی اور دیر تک بیٹھی رہی آخرکار آپ نے فرمایا ''کیا تم نہیں چاہتے کہ اب مجلس ختم کردو حالانکہ آفتاب جس رفتار سے چل رہا ہے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔''

استغراق فی التوحید:

کمال توحید یہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں صرف خدا کی طرف رجوع کرے۔اور اس کے ماسوا کسی اور سے اپنی کوئی حاجت متعلق نہ سمجھے۔حضرت معروفؒ ایک دفعہ کوفہ کے بازار سے گزر رہے تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ اس عہد کے مشہور واعظ ابن السماکؒ وعظ کہہ رہے ہیں یہ بھی سننے کھڑے ہوگئے۔اس وقت ابن السماک کہہ رہے تھے ''جو شخص اللہ سے بالکل اعراض کرتا ہے اللہ اس سے بالکل اعراض کرلیتا ہے۔اور جو شخص اللہ کی طرف اپنے دل سے متوجہ ہوتا ہے اللہ بھی اس کی جانب کامل التفات فرماتا ہے۔اور جو شخص کبھی کبھی اللہ کو یاد کرلیتا ہے اللہ بھی اسے کبھی کبھی یاد کرتا ہے'' حضرت معروفؒ کرخی کا بیان ہے ''میں اس وعظ سے بے انتہا متاثر ہوا اور میں نے آئندہ کے لئے عزم بالجزم کرلیا کہ اب اپنے مولیٰ حضرت علی بن موسیٰ الرضا کی خدمت کے علاوہ دنیا کی کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کروں گا اور ہمہ تن خدا کی طرف ہی متوجہ رہوں گا۔'' یہاں سے روانہ ہوکر میں حضرت علی بن موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو یہ پوری سرگزشت سنائی تو انہوں نے فرمایا ''اگر آپ نصیحت پذیر ہونا چاہیں تو یہی ایک نصیحت آپ کے لئے بہت کافی ہے'' واقعات سے ثابت ہے کہ حضرت معروف کی تمام زندگی اس اثر سے آخر دم تک روشن رہی اور وہ فنافی التوحید کے جام جاں نواز سے ایسے سرشار دمست ہوئے کہ غیر اللہ سے انہیں کوئی علاقہ ہی نہیں رہا۔

ایک شخص نے ان سے کسی نصیحت کی درخواست کی، آپ نے فرمایا ''اللہ پر توکل کرو۔ یہاں تک کہ وہ تمہارا جلیس وانیس بن جائے اور وہی تمہاری شکایتوں کا مرجع ہو اور تم موت کا ذکر زیادہ کرو جس کی وجہ سے تمہارا جلیس سوائے خدا کے کوئی اور ہو ہی نہ سکے اور ہاں یہ سمجھ لو کہ لوگ تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر وہ تم کو کوئی چیز دے سکتے ہیں اور نہ کسی چیز سے منع کر سکتے ہیں۔''

رحمتِ خداوندی پر بھروسہ:

اس فنافی التوحید کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ خدا کی رحمت کے تصور سے بار بار اپنے دل کو تسکین دیتے اور مایوسی وناامیدی کو غالب نہیں ہونے دیتے تھے وہ بسا اوقات علی الصباح اٹھ کر یہ شعر پڑھتے تھے:

ای شیء ترید منی الذنوب شغفت بی فلیس عنی تغیب

مایضر الذنوب لو اعتقتنی رحمة لی فقد علانی المشیب

ترجمہ: ان گناہوں نے آخر میرے متعلق ارادہ کس چیز کا کیا ہے یہ مجھ سے چمٹ گئے ہیں اور غائب نہیں ہوتے، اچھا اگر اللہ کی رحمت نے مجھ کو آزاد کر دیا تو اب جبکہ مجھ پر بڑھاپا غالب ہو گیا ہے، یہ گناہ مجھ کو کیا نقصان پہنچا سکیں گے۔

دعاء خیر:

دوسروں کو اگر برے کاموں میں مبتلا دیکھے تو ان کے حق میں دعا بد نہیں بلکہ ہمیشہ دعاء خیر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؒ بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے چند رنگین مزاج نوجوان ایک کشتی میں بیٹھے ہوئے گاتے بجاتے اور شراب کے جام چھلکاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یہ منظر اندوہگیں دیکھ کر آپ کے ساتھیوں نے کہا ''حضرت! آپ ملاحظہ نہیں فرماتے، یہ لوگ پانی میں اللہ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے حق میں دعا بد کیجئے'' حضرت معروف کرخی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا کی ''اے میرے معبود اے میرے آقا و مولا! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو ان کو جنت کی مسرتیں بھی اسی طرح عنایت فرما جس طرح تو نے ان کے لئے دنیا کی مسرتیں ارزاں کر رکھی ہیں۔'' آپ کے ساتھیوں نے کہا ''ہم نے تو آپ سے عرض کی تھی ان کم بختوں کے لئے دعا بد کیجئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ جب آخرت میں ان کے لئے سامان فرحت وانبساط مہیا کر دے گا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس نے دنیا میں ان کے گناہ معاف کر دیے ہیں اس سے ان غریبوں کا بھلا ہو جائے گا) اور تمہیں کوئی نقصان پہنچے گا نہیں''

عبادت کا اِخفاء:

شب و روز عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے لیکن اس کا اظہار نہ کرتے تھے اور حتی الوسع اسے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ واقعی طور پر صائم النہار اور قائم اللیل تھے۔ ان کے مرض وفات میں ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے پوچھا ''آپ اپنے روزوں کی نسبت مجھ سے کچھ بیان فرمائیے'' کہنے لگے حضرت عیسیٰؑ ایسا ایسا روزہ رکھتے تھے'' سائل بولا ''میں آپ کے روزہ سے متعلق سوال کرتا ہوں'' فرمایا ''حضرت داؤد اس طرح روزہ رکھتے تھے۔ پھر سائل نے وہی کہا کہ میں تو آپ کے روزوں کی نسبت پوچھ رہا ہوں۔ آپ نے جواب دیا ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اس طرح روزہ رکھتے تھے۔'' اس مرتبہ سائل نے پھر اسی سوال کا اعادہ کیا تو آپ نے فرمایا ''رہا میں! تو ہمیشہ روزہ سے رہتا تھا لیکن اگر کوئی شخص میری دعوت کرتا تو میں کھانا کھا لیتا تھا۔ اور یہ نہیں کہتا تھا کہ میں روزہ سے ہوں۔''

محمد بن منصور کی روایت ہے کہ میں نے ایک دن حضرت معروفؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دیکھا کہ ان کے چہرہ پر زخم کا کوئی نشان ہے، میں نے چاہا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کروں، لیکن ان کے رعب و جلال کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی۔ ان کے پاس ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو مجھ سے زیادہ جری تھا، اس سے نہ رہا گیا اور اس زخم کا سبب پوچھ ہی بیٹھا۔ حضرت معروفؒ نے بات کو ٹالنے کے لئے فرمایا ''بھائی تم اپنا کام کرو۔ اس نوع کے سوالات سے تم کو کیا فائدہ پہنچے گا۔'' اس نے دوبارہ پھر اصرار کیا۔ اس مرتبہ بھی حضرت معروفؒ نے وہی جواب دیا مگر جب تیسری مرتبہ اس نے سوال کیا اور زیادہ اصرار کے ساتھ تو اب آپ کو فرمانا پڑا ''میں گزشتہ رات بیت اللہ الحرام چلا گیا تھا جب بیر زمزم پر پانی پینے کے لئے حاضر ہوا تو وہاں میرا پاؤں پھسل گیا اور میرا چہرہ دروازہ سے ٹکرا گیا۔ یہ نشان اسی وجہ سے ہے۔''

اس واقعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معروف صاحب کرامت بزرگ تھے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے احوال و مزایا کا اخفاء بہت کرتے تھے۔

مقبولیت دُعاء:

وہ مستجاب الدعاء تھے ان کے زمانہ میں ایک شخص خلیل الصیاد نامی تھے۔ان کا بیٹا ایک دفعہ گھر سے نکل کر انبار پہنچ گیا۔ ماں بہت پریشان تھی۔ خلیل نے حضرت معروف کی خدمت میں حاضر ہوکر پورا ماجرا سنایا اور لڑکے کی واپسی کے لئے دعا کی درخواست پیش کی۔ آپ نے دعا کی ''اے اللہ! کوئی شبہ نہیں آسمان تیرا آسمان ہے اور زمین تیری زمین ہے، اور جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے وہ بھی تیرا ہے، تو اس لڑکے کو یہاں پہنچادے'' خلیل کہتے ہیں ''میں اس کے بعد باب الشام تک ہی آیا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ لڑکا کھڑا ہوا ہے۔''

رحمت خداوندی کی جستجو اور طلب:

ہمیشہ رحمت ایزدی کی طلب و جستجو میں سرگرم رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سقہ کے پاس سے گزر رہے تھے وہ کہہ رہا تھا ''اللہ اس پر رحم کرے جو اس پانی کو پی کر جائے'' حضرت معروف اس وقت روزہ سے تھے، لیکن یہ سن کر آگے بڑھے اور پانی پی کر فرمانے لگے کیا عجب ہے اللہ تعالی اس سقہ کی دعاء کو ہی قبول فرمالے۔''

شفقت علی الخلق:

اخلاقِ فاضلہ میں سے ایک بڑا خلق یہ ہے کہ انسان کے دل میں اپنے ہم جنسوں کے لئے جذبۂ محبت وانسیت ہو۔ اور وہ ان کے دکھ درد میں پورا شریک بنا رہے حضرت معروف کی ذات اس خلق عظیم سے بھی بہرہ وافر رکھتی تھی، حضرت سریؒ فرماتے تھے ''تم مجھ میں کو جو کچھ دیکھتے ہو وہ سب حضرت معروف کی برکات ہیں۔ میں ایک مرتبہ عید کی نماز سے واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں حضرت معروف مل گئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا تھا، پراگندہ مو، آشفتہ رو۔ میں نے پوچھا ''حضرت! یہ کون ہے؟ ارشاد ہوا سب بچے کھیل رہے تھے یہ غریب دلگرفتگی کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا میاں تم کیوں نہیں کھیلتے'' بچہ بولا میں یتیم ہوں یہ سن کر حضرت معروف نے بچہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لے آئے۔ وہ اس سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس کی دلجوئی کے لئے اخروٹ اور بادام کے مغز جمع کرتے تھے۔''

علم وفضل:

حضرت معروف کا شمار اگر چہ کبار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اور وہ زیادہ تر اسی حیثیت سے روشناس ہیں لیکن علم لدنی اور معرفت روحانی کے علاوہ وہ علم ظاہر میں بھی کم نہیں تھے علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ حضرت یحیٰی بن معین اور امام احمد بن حنبلؒ ان کے پاس آ کر (مسئلے مسائل یا احادیث) لکھتے تھے۔لیکن حق یہ ہے جس کا آئینۂ قلب جمال حقیقت کی ضیا باریوں سے عکس پذیر ہو رہا ہو اس کے لئے علوم رسمیہ وظاہریہ کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔اور اگر اس میں ان چیزوں کی کمی پائی بھی جائے تو اس کے کمالات معنوی و روحانی کے مقابلہ میں وہ چنداں قابل اعتنا نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کی مجلس میں حضرت معروف کا ذکر آیا۔ایک شخص بول اٹھا ''وہ تو کوتاہ علم ہیں'' امام احمد کو یہ سن کر تاب سکوت نہ رہی۔آپ نے فرمایا اے شخص خاموش رہ خدا تجھ کو معاف کرے حضرت معروف جن حقیقتوں سے آشنا ہیں کیا علم کا مقصد ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ایک دفعہ ان صاحبزادہ نے اپنے پدر بزرگوار سے پوچھا ''کیا حضرت معروف عالم بھی تھے؟ آپ نے ارشاد فرمایا ''ارے بیٹے! **کان مَعہٗ اساس العلم، خشیة اللّٰہ**'' ان کے پاس تو علم کی جڑ تھی یعنی خدا کا خوف۔

کرامات وفیاضی:

علامہ بغدادی نے ''کرامات معروف'' کا ایک مستقل عنوان قائم کر کے حضرت معروف کرخی کے چند حیرت انگیز واقعات نقل کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجہ کے فیاض، سیر چشم، ہمدرد خلائق، اور مصیبت زدوں کے مدد و معاون تھے۔ابو العباس المؤدب بیان کرتے ہیں کہ میرے پڑوس میں ایک ہاشمی رہتا تھا۔یہ غریب نہایت مفلوک الحال اور عسرت زدہ تھا، ایک دن اس کے گھر میں ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔بیوی نے تنگ آ کر کہا ''اس وقت میری جو کچھ حالت ہے تم پر اچھی طرح روشن ہے۔صبح کو کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔اور میری ناطاقتی حد سے زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ کھاؤں'' اس وقت رات زیادہ گزر چکی تھی توکل بخدا یہ غریب ہاشمی طلب رزق میں اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ایک بقال کے پاس آیا اس کو اپنی

داستان مصیبت سنائی اور بطور قرض کچھ چیزیں طلب کیں ہاشمی بقال کا پہلے سے مقروض تھا اس نے مزید قرض دینے سے انکار کر دیا یہاں سے مایوس و ناکام ہو کر ہاشمی غریب نے ایک دوسرے بقال کی دکان کا رخ کیا اس سے پہلے سے کچھ جان پہچان تھی لیکن یہاں بھی وہی صورت پیش آئی اس حسرت زدہ و ناکام کی سراسیمگی و پریشانی کی کوئی حد نہ رہی زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ نظر آتی تھی اور کوئی تدبیر اس فشارِ الم سے بچنے کی سمجھ میں نہ آتی تھی اسی عالم حیرت و بیخودی میں دریائے دجلہ کی طرف رخ کر دیا لب ساحل پہنچ کر سنا کہ ملاح بغداد کے مختلف محلوں کا نام لے لے کر پکار رہا ہے کہ کسی کو ان محلوں میں سے کسی محلّہ میں جانا ہو تو کشتی میں آ جائے۔ ہاشمی نے ملاح کو آواز دی۔ اس نے اپنی کشتی کنارے لگا دی۔ ملاح نے پوچھا ''کہاں جاؤ گے؟'' ہاشمی بولا مجھ کو پتہ نہیں ملاح کہنے لگا میں نے تم سے زیادہ عجیب و غریب کوئی شخص آج تک نہیں دیکھا۔ ایسے ناوقت میں تم کو اپنی کشتی پر بٹھا کر لے جا رہا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ کہاں جاؤ گے تم جواب دیتے ہو مجھے معلوم نہیں'' مظلومیت کے احساس نے دل و جگر کو محرومی و ناکامی کے دھوئیں سے دُخان زار بنا دیا آنکھیں پرنم ہو گئیں اور ہاشمی نے مجبور ہو کر ملاح کو بھی اپنی داستان غم کہہ سنائی۔ ملاح کا دل پسیج اٹھا اور اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا گھبراؤ نہیں میں تمہیں اصحاب الساج کے محلّہ میں پہنچائے دیتا ہوں وہاں امید ہے تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی۔ چنانچہ ملاح ہاشمی کو لے کر اصحاب الساج محلّہ کی ایک مسجد میں آیا جہاں حضرت معروف کرخی تشریف رکھتے تھے ہاشمی نے ملاح کی ہدایت کے بموجب وضو کیا، اور مسجد میں داخل ہو کر حضرت معروف کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ حضرت معروف اس وقت نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فراغت کے بعد وہ ہاشمی کی طرف متوجہ ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد آپ نے حال پوچھا اور یہاں ایسے وقت میں آنے کی وجہ دریافت کی۔ ہاشمی نے اپنا پورا واقعہ بیان کیا آپ نے یہ سن کر پھر اپنی نماز شروع کر دی، اتنے میں بادل آئے اور اس زور کی بارش برسی کہ جل تھل بھر گئے۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ بیچارے ہاشمی کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ بیوی کو مفلسانہ زچگی کے عالمِ بیکسی میں تنہا چھوڑ کر آیا تھا مقصد ابھی تک حاصل نہیں ہوا تھا کہ رات تیرہ و تار، مسافت بعید، اور بارش موسلا دھار۔ اب غریب کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ فقر و فاقہ کے ساتھ ہی سہی، اپنی بیوی کے پاس تو پہنچ جائے ہاشمی کا تو سن فکر و خیال فرط و غم و الم میں انہیں افکارِ پریشان کے تھپیڑوں سے کھیل رہا تھا کہ یکا یک مسجد کے دروازہ پر کسی سواری کی آہٹ محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد ہی دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، اور

حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا ''میں فلاں شخص کا بھیجا ہوا قاصد ہوں۔ وہ صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں ''میں اپنے بستر پر سو رہا تھا جسم پر فقط بنیان تھا، کہ ناگاہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے اوپر اللہ کی ایک بڑی نعمت دیکھی۔ اب میں اسی کے شکرانہ میں آپ کے پاس یہ پانچ سو دینار کی ایک تھیلی بھیج رہا ہوں، آپ اسے مستحقین میں تقسیم کر دیجئے'' حضرت معروفؒ نے قاصد سے فرمایا ''تم یہ تھیلی اس کو (ہاشمی کو) دے دو'' قاصد نے حکم کی تعمیل کی۔ ہاشمی نے خوش ہو کر یہ تھیلی کمر سے باندھی اور کیچڑ اور گارے میں گھستا چلتا پھرتا بڑی مشکل سے بقال کی دکان پر آیا اور اس سے شہد، شکر، شیرہ، چاول اور روغن لے کر گھر آیا یہاں بیوی شدت انتظار جاں بلب ہوگئی تھی ہاشمی کو دیکھتے ہی برا بھلا کہنے لگی۔ تب ہاشمی نے اپنی سرگذشت سنائی جس سے بیوی کی جان میں جان آئی دونوں نے مل کر حضرت معروف کرخی کو دعائیں دیں۔ ہاشمی نے ان دنانیر سے ایک جائیداد خرید کی، فقر و مصیبت کے دن ختم ہوئے۔ اور پہلے جس گھر میں فلاکت و افلاس کا دور دورہ تھا اب مسرت و شادمانی کا گہوارہ بن گیا۔''

اسی طرح ایک مرتبہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص حضرت معروف کرخیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا ''رات میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بچہ کی نگاہ آپ پر پڑے اور وہ میرے لئے سرمایۂ سعادت و برکت ہو۔ حضرت معروفؒ نے فرمایا ''تم سو مرتبہ ''ماشاء اللہ کان'' پڑھو۔ یہ شخص سو مرتبہ پڑھ چکا تو آپ نے پھر دوبارہ اس کو سو مرتبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ غرض یہ کہ اس طرح اس شخص نے پانچ سو مرتبہ یہ وظیفہ پڑھا اس دفعہ یہ وظیفہ تمام ہوا ہی تھا کہ خلیفہ ہارون رشید کی مشہور بیوی زبیدہ کا ایک نوکر پانچ سو درہم کی ایک تھیلی لئے ہوئے حاضر ہوا۔ اور ملکہ کی طرف سے سلام و پیام پہنچاتے ہوئے کہنے لگا آپ ان دراہم کو مستحقین میں تقسیم کر دیجئے حضرت معروف نے یہ تھیلی سب کی سب اس شخص کو دے دی اور فرمایا ''اگر تم یہ وظیفہ پانچ سو مرتبہ سے زیادہ پڑھتے تو تمہیں روپیہ بھی اس سے زیادہ ملتا۔

اسی سلسلہ میں ایک پر لطف و عجیب یہ واقعہ ہے کہ حضرت معروف کے خاندان میں کوئی تقریب شادی تھی۔ ان کے بھائی نے ان کو دکان پر بٹھا دیا تا کہ اس کی رکھوالی اور نگرانی کریں۔ یہاں سائلوں کا تانتا بندھ گیا، اور حضرت معروف کسی سائل کو رد کرنا جانتے نہیں تھے جو آیا اور اس نے جتنا مانگا وہ اس کے حوالہ کر دیتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دکان آٹے سے خالی ہوگئی۔ حضرت معروف کے بھائیوں نے پوچھا ''آٹے کو کیا ہوا؟'' آپ نے فرمایا بتاؤ آٹا کتنے کا تھا۔ وہ دیکھو اس

صندوق میں اس کی قیمت محفوظ ہے۔ حضرت معروف کے بھائیوں نے صندوق کھول کر دیکھا تو واقعی اس میں تمام آٹے کی قیمت جمع تھی۔

ایک یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے جو محمد بن منصور الطوسی کا خود بیان کیا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ''میں نے ایک مرتبہ روزہ رکھا اور عہد یہ کیا کہ سوائے مالِ طیب کے کسی اور چیز سے روزہ افطار نہیں کروں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پے در پے تین دن گزر گئے اور مجھ کو روزہ افطار کرنے کے لئے کوئی طیب چیز نہیں ملی۔ جب چوتھا دن ہوا تو میں نے دل میں عزم بالجزم کیا کہ آج شب کو کسی بزرگ کے ہاں جا کر جن کا کھانا سر بسر حلال وطیب ہو روزہ افطار کروں گا۔ چنانچہ میں حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہوا، انہیں سلام کیا اور پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔ آپ نمازِ مغرب ادا کرنے کے بعد مسجد سے باہر آئے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ''اے طوسی! تم اپنے بھائی کے پاس جاؤ اور شب کا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی کھاؤ'' طوسی کا بیان ہے ''میں نے اپنے دل میں کہا کہ چار دن تو ہو گئے مسلسل روزہ رکھتے ہوئے اور اب بھی پتہ نہیں کہ کھانا کس قسم کا کھانا پڑے گا۔ حضرت معروف کرخی سے میں نے عرض کیا ''حضرت! میرے پاس طعام شب ہے کہاں؟ لیکن آپ نے میرے کہنے پر کچھ توجہ نہیں کی اور پھر اسی بات کا اعادہ کیا۔ میں نے بھی اس کے جواب میں وہی کہا۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا تیسری بار پھر یہی گفتگو ہوئی تو حضرت معروف میرا جواب سن کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ''اچھا تم میرے پاس آؤ'' میں ضعف ونقاہت کی وجہ سے بے دم ہو رہا تھا، بہ مشکل اٹھا اور حضرت کرخی کے بائیں جانب جا کر بیٹھ گیا۔ حضرت معروف نے میرا داہنا ہاتھ پکڑا اور اس کو اپنے بائیں ہاتھ کی آستین میں داخل کر دیا۔ مجھ کو آستین میں ایک سفر جل ملا جس پر دانت سے کاٹنے کے نشانات تھے۔ میں نے اسے کھایا تو اس کا ذائقہ عجیب وغریب تھا۔ میں نے آج تک اس طرح کا کوئی میوہ نہیں کھایا۔ اور اس میوہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اسے کھا کر میں پانی سے مستغنی ہو گیا۔''

ہر دلعزیزی:

حضرت معروفؒ اپنے باطنی وروحانی کمالات کی وجہ سے اس درجہ ہر دلعزیز تھے کہ لوگ اپنے بچوں کا نام ان کے نام پر رکھتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ شرفِ ہمنامی سے برکت حاصل کریں۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ کی خدمت میں بغداد کا ایک وفد حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے

پوچھا ''کہاں سے آئے ہو'' انہوں نے جواب دیا ''بغداد سے'' بغداد کا نام سن کر آپ نے دریافت کیا ''تمہارے عالم اجل کا کیا حال ہے؟'' اس وفد نے پوچھا ''وہ کون؟'' حضرت سفیان نے فرمایا ''ابو محفوظ معروف'' بغدادیوں نے کہا ''وہ بخیریت ہیں'' حضرت سفیان نے ارشاد فرمایا ''جب تک وہ بغداد میں رہیں گے اہل بغداد بخیریت رہیں گے۔''

وفات:

۲۰۰ھ یا ۲۰۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ بغداد میں ان کا مزار پرانوار بہت مشہور ہے، لوگ اس سے برکت وسعادت حاصل کرتے ہیں۔ ابراہیم الحربی کا بیان ہے ''معروف کی قبر ایک آزمودہ تریاق ہے۔''

ابو بشر صالح بن بشیر المری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

صالح نام، ابو بشیر کنیت، والد کا نام بشیر تھا جو عربی الاصل تھے۔ لیکن اس کی ماں خراسانی تھیں اور نام میمونہ تھا۔ صالح بنو مرہ بن الحارث کی ایک عورت کے مملوک غلام تھے ان کی مالکہ نہایت نیک بخت اور ستودہ صفات خاتون تھیں۔ صالح کو بچپن میں ہی تعلیم کے لئے ایک کندی شخص کے مکتب میں داخل کر دیا تھا۔ وہاں ایک دن صالح کی مکتب کے کسی بچہ سے لڑائی ہوگئی۔ بچہ کے باپ کو اس وقت کی خبر ہوئی تو غصہ میں بھرا ہوا مکتب میں آیا صالح کے بال پکڑ کر زدوکوب کیا اور گالی دیتے ہوئے کہا 'اے غلام، خبیث، صالح کو اتنا مارا کہ ان کی پیشانی سے خون بہنے لگا یہ روتے ہوئے اپنی مالکہ کے پاس آئے اور ساری داستان کہہ سنائی۔ مالکہ کو ان کی حالت زار پر رحم آ گیا اور اس نے ان کو اور ان کے بھائی کو دونوں کو آزاد کر دیا۔

تحصیل علم:

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، صالح بچپن میں ہی تعلیم کے لئے ایک مکتب میں بٹھا دیئے گئے تھے یہاں اس زمانہ کے دستور کے مطابق انہوں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی پھر بڑے بڑے

---

(۲) تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۰۷۔

محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے حدیث کا سماع کیا چنانچہ انہوں نے جن بزرگوں سے روایت کی ہے ان میں یہ حضرات بھی ہیں: حسن بصری، ابن سیرین، قتادہ، ہشام بن حسان، سعید الجریری، ابوعمران الجونی، سلیمان التیمی، لیکن حق یہ ہے کہ حدیث ان کا خاص فن نہیں تھا۔ اور نہ یہ اس اعتبار سے اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ امام بخاری اور امام ابن عدی ان کو منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ اور ابن حبان نے انہیں ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ (۱)

زہد واتقاء:

ان کا اصل زیور اور طغرائے امتیاز زہد واتقاء، خشیۂ ربانی اور وعظ گوئی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ حدیث میں ثقات محدثین کا مرتبۂ عظمیٰ حاصل نہیں کر سکے۔ ابن حبان کا بیان ہے "صالح بن بشیر المری بصرہ کے بڑے عبادت گزار اور مشہور قاریوں میں سے تھے اور یہ وہی ہیں جن کو صالح بن بشیر الناجی کہا جاتا ہے۔ ان کی آواز میں بڑا درد تھا اور ان کی قرأت بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ ان پر خیر وصلاح کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ حفظ حدیث میں پختگی حاصل کرنے سے بھی تغافل کرتے تھے۔ اور حسنؒ اور ثابت البنبانیؒ اور اسی نوع کے دوسرے اصحاب سے محض وہم کی بنا پر روایتیں نقل کر دیتے تھے۔ اسی بنا پر ابو اسحاق الحربی نے کہا ہے "اگر صالح بن بشیر کسی روایت کو بیان کرتے وقت ارسال کریں یعنی اصل راوی کا نام نہ بتائیں تو ممکن ہے انہوں نے صحیح حدیث بیان کی ہو، ورنہ اسناد نقل کریں تو ان سے بچنا چاہئے۔" (۲)

خوفِ خدا:

ان پر خوف خدا کا بے حد غلبہ تھا۔ عفان کا بیان ہے "**کان شدید الخوف من الله کثیر البکاء**" (۳) ایک مرتبہ انہوں نے خود بیان کیا "رونے کے بہت سے اسباب ہیں ان میں سے ایک سبب اپنے گناہوں کا خیال اور ان میں غور وفکر ہے اگر نفس اس غور وفکر سے ہی گناہوں سے باز آ جائے تو سبحان اللہ ورنہ پھر تم اس کو روزِ محشر کی یاد دلاؤ۔ دوسرا سبب قیامت کے شدائد ومحن کا تصور ہے۔ اگر نفس اسی سے نصیحت پذیر ہو جائے تو خیر ورنہ پھر تم یاد کرو اس وقت کیا حالت ہوگی جبکہ تم کو دوزخ کے طبقات میں الٹ پلٹ ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۸۲ و ۳۸۳۔ (۲) تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۳۰۸۔ (۳) صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۲۶۶۔

حضرت صالح نے اتنا ہی کہا تھا کہ ان پر رقت طاری ہوگئی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور بے ہوش ہوگئے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر مسجد کے گوشوں میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی چیخ اٹھے اور مسجد کا صحن ایک عرصۂ آہ وبکا بن گیا۔'' (۱)

وعظ گوئی:

چونکہ وہ خود بڑے صاحب باطن اور اہل دل تھے اور ہر وقت خدا کی عظمت وجلالت کے تصور سے ان پر کیفیت خوف وفزع طاری رہتی تھی اس لئے ان کے وعظ میں بھی بڑا اثر ہوتا تھا۔ منہ سے جو بات نکلتی تھی سامعین کے دل پر تیر وسناں کا کام کرتی تھی حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی بیان کرتے ہیں ''میں کبھی کبھی حضرت سفیانؒ کے سامنے صالح کا ذکر کرتا تھا تو کہتے تھے ''ہاں صالح ایک اچھے قصہ گو ہیں'' اور کچھ اس انداز سے کہتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ میں اور وہ دونوں علی الصباح بیدار ہوکر کسی ضرورت سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے چلتے چلتے ہمارا گزر اس مسجد سے ہوا جس میں صالح فجر کی نماز کے بعد وعظ بیان کرتے تھے۔ میں نے حضرت سفیانؒ سے کہا ''آیئے اس مسجد میں نماز پڑھ لیں'' وہ راضی ہوگئے، ہم دونوں نے مسجد میں نماز ادا کی نماز سے فراغت کے بعد حضرت صالح کا وعظ سننے کے لئے لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ ہم اپنی جگہ سے کھڑے بھی نہیں ہوسکتے تھے اتنے میں حضرت صالح تشریف لائے اور وعظ شروع کیا وہ وعظ کیا تھا بلا کے اثر اور درد میں ڈوبا ہوا تھا اسے سن کر حضرت سفیان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، بے قابو ہوکر رونے لگے۔ جب مجلس وعظ برخاست ہوگئی تو میں نے حضرت سفیانؒ سے پوچھا ''اب آپ صالح کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟ بولے ''یہ تو قصہ گو نہیں بلکہ قوم کے نذیر یعنی قوم کو ڈرانے والے ہیں۔'' (۲)

عفان بن مسلم بیان کرتے ہیں ''ہم لوگ حضرت صالح کی مجلس وعظ میں شریک ہوکر ان کا وعظ سنتے تھے۔ تو وہ اپنے حزن وغم اور فرطِ گریہ وبکاء کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا وہ انتہائی خوف زدہ ہیں ان کا گریہ اس غم رسیدہ ماں کے گریہ کی طرح ہوتا تھا جو اپنے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کے لئے دنیا میں اکیلی چھوڑ دی گئی ہو۔'' (۳)

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۳۶۵۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۳۰۸۔

امر بالمعروف:

حضرت صالحؒ حق کہنے اور امر بالمعروف میں نہایت جری اور بیباک تھے۔ بڑے سے بڑے بادشاہ یا امیر کی سطوت وشوکت انہیں اعلانِ حق سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، ان کے عہد کا خلیفۂ وقت مہدی ان کی بڑی توقیر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ مہدی کی دعوت پر شاہی محل میں تشریف لائے تو سواری پر سوار تھے مہدی نے آپ کو دیکھتے ہی اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو جو ولی عہد تھے حکم دیا 'تم دونوں کھڑے ہو جاؤ اور آگے بڑھ کر اپنے چچا (صالح المری) کو سواری سے اتارو' دونوں بیٹوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ حضرت صالحؒ کے قریب پہنچے تو حضرت صالح اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور دل میں کہنے لگے ''اے صالح! اگر تو نے یہ تمام اعمال خیر وصلاح اسی دن کے لئے کئے تھے تو یقیناً تو ہلاک و برباد ہو گیا۔''

حضرت صالحؒ، مہدی کی اس غیر معمولی توقیر و تعظیم سے ذرا متاثر نہ تھے۔ اور کلمۂ حق و خیر کہنے میں کبھی پس و پیش نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ مہدی کے پاس تشریف لے گئے جبکہ وہ بغداد کے محلّہ رصافہ میں قیام پذیر تھا۔ آپ نے اس کے سامنے پہنچتے ہی کہنا شروع کیا۔

''اے امیر المومنین! میں آج جو کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں آپ اسے ذرا صبر و تحمل سے سنئے۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک بہتر وہی شخص ہے جو سخت سے سخت نصیحت کی بات سن کر بھی چین بجبیں نہ ہو۔ اور پھر جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرف قرابت رکھتا ہو اس کے لئے تو اور بھی سزاوار ہے کہ وہ اخلاق نبوی کا حامل ہو اور آپ کے مسلک پر چلے، اور اس پر طرفہ یہ ہے کہ خدا نے آپ کو علم کی سمجھ اور حجت کی روشنی کی ایک ایسی میراث عطا فرمائی ہے جس کے بعد آپ کے لئے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پس یاد رکھئے آپ جب کبھی ایسی حجت کا دعویٰ کریں یا کسی ایسے شبہ میں مبتلا ہو جائیں جس کے مقابلہ میں اللہ کی برہان صحیح نہ ہو اور اس کے ساتھ تطبیق نہ پا سکے۔ تو آپ کے تجاہل علمی کے بقدر اللہ کی ناراضگی آپ پر نازل ہوگی اور آپ جان لیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فریقِ مخالف ہوں گے اس شخص کے جو آپ کی امت میں ہونے کے باوجود آپ کی مخالفت کرے اور شریعت محمدیہ میں قطع و برید سے کام لے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شخص کے خصم ہوں بس سمجھ لو کہ اللہ بھی اس کا خصم (فریق مخالف) ہوگا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخاصمت کی تاب لا سکتے ہو تو اس کے لئے ایسے دلائل و براہین کا انتظام کر لو جو تم کو

نجات دلا سکیں۔اور ہلاکتوں سے محفوظ رکھ سکیں۔اور یادرکھو سب سے زیادہ بد بخت وہ انسان ہے جو اپنی خواہشات کا کشتہ ہو اور اس نے ان خواہشات کی تکمیل تقریب الی اللہ کے بہانہ سے کی ہو۔ اس کے برخلاف قیامت کے دن اس شخص کا قدم بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما رہے گا جو کتاب اللہ اور سنت رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمسک میں سب سے زیادہ قوی اور مستعد ثابت ہوگا۔ آپ جیسا بلند مرتبت بادشاہ اگر کسی معصیت کا ارتکاب کرے تو کوئی شخص اس کو منع کرنے والا نہیں ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ کی برائیوں کو بھی اچھائی بنا کر پیش کیا جائے گا۔اور جو خیانت شعار علماء ہیں وہ آپ کے افعال نازیبا کے استحسان کے دلائل بیان کریں گے اور یہ وہ زبردست جال ہے جس کے ذریعہ دنیا آپ ایسے لوگوں کا شکار کر لیتی ہے۔'' آخر میں آپ نے فرمایا ''اے امیر المومنین آپ میری نصیحتوں کو برداشت کیجئے، میں نے آپ کے بیان کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔''

مہدی پر حضرت صالحؒ کی اس پر موعظت ونصیحت تقریر کا بے حد اثر ہوا اور وہ رونے لگا۔مہدی نے اس وعظ کو سننے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس کو لکھوا کر سرکاری دفتروں میں محفوظ کرا دیا۔''(۱)

حضرت صالحؒ وعظ ونصیحت میں اس درجہ انہماک رکھتے تھے کہ وہ کسی موقع پر بھی اس سے تساہل نہیں برتتے تھے۔ایک مرتبہ آپ کے کسی ملاقاتی یا دوست کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ آپ اس کے پاس تعزیت کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر فرمایا ''اگر اس مصیبت (مرگ پسر) نے آپ کے نفس میں کوئی عبرت اور بیداری پیدا نہیں کی ہے تو سمجھ لیجئے آپ کے نفس کی مصیبت بیٹے کی موت کی مصیبت سے زیادہ ہے، پس اسی کو رونا چاہئے۔'' (۲)

بغداد میں ورود اور درس حدیث:

حضرت صالح، بصرہ کے رہنے والے تھے وہیں انہوں نے نشو ونما پائی۔اور علم حاصل کیا۔مہدی نے ان کی شہرت سنی تو انہیں بغداد بلا لیا جہاں انہوں نے حدیث کا درس دیا۔ (۳)

---

(۱) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۳۰۶۔ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۲۲۶۔ (۳) تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۳۱۰۔

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

ثوبان نام ابو الفیض کنیت، ذوالنون لقب، والد کا نام ابراہیم تھا جو اسحاق بن محمد الانصاری کے غلام تھے۔ (۱) ان کے چار بیٹے تھے۔ ذوالنون، ذوالکفل عبدالباری، ہمیع، حضرت ذوالنونؒ کی پیدائش اخمیم میں ہوئی جو مصر کا ایک گاؤں ہے یہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار ہے۔ (۲)

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار اکابرامت میں ہوتا ہے۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

"کان اوحد وقته علما وورعا وحالا وادباوهو معدود فی جملة من روی المؤطاء عن الامام مالک رضی الله عنه."

ترجمہ: "حضرت ذوالنون علم، تقویٰ، حال اور ادب کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے یگانہ روزگار فرد تھے اور ان کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے خود امام مالکؒ سے مؤطا کی روایت کی ہے۔" (۳)

علمِ حدیث:

انہوں نے امام مالک بن انسؒ، لیث بن سعدؒ اور ابن لہیعہؒ سے حدیثیں روایت کی ہیں اور خود ان سے جنیدؒ اور دوسرے حضرات نے روایات نقل کی ہیں۔ (۴)

لیکن حضرت ذوالنونؒ اس سرمایۂ سعادت سے بہرہ اندوز تھے جو قوت بازو اور زور ہمت وجستجو سے نہیں بلکہ خدائے بخشندہ کے لطف خاص سے کسی کسی خوش قسمت انسان کو حاصل ہوجاتا ہے۔ وہ معرفت وسلوک کے اس مقامِ بلند کے طائر سدرہ پرواز تھے جہاں حجابات ظاہری ایک قلم مرتفع ہوکر شاہد کو جلوۂ مشہود سے ناظر کو تجلیاتِ منظور سے اور چشمِ شوق آگیں کو حقیقت

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۷۷۔ (۲) نفحات الانس ص ۳۳۔

(۳) ابن خلکان ج اص ۱۰۱۔ (۴) حسن المحاضرہ ج اص ۲۱۸۔

مقصود و مطلوب سے ہمکنار کردیتے ہیں۔ ان کا قلب تجلیات وانوار الٰہی کا آئینہ اور ان کی آنکھیں جمالِ حقیقی کی مسلسل ضوفشانیوں سے روشن و منور تھیں جو شخص حقیقت لم یزل سے بلا واسطہ شادکام ہو رہا ہو، اس کو عالمِ مجاز کی رسم و راہ کا کیا خیال رہ سکتا ہے اور جس کو مطلوبِ حقیقی سے بے حجاب و بے نقاب شرف تخاطب و ہم کلامی حاصل ہو۔ وہ کب کسی قاصد و مردِ درمیانہ کی منت پیغام رسانی کا ممنون ہوسکتا ہے اربابِ ظاہر قیاس وتخمین کے اشاروں سے جس حقیقتِ مستور کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ اپنی چشم باطن و بصیرت سے اسے خود اپنے دل کی گہرائیوں میں دیکھ لیتا ہے۔ لوگ واسطہ در واسطہ روایت کے ذریعہ جس متن کی عبارت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے اذعان و یقین کی لوح پر اس کے تمام نقوش صاف صاف پڑھ لیتا ہے قفسِ ناسوت کے اسیران بلا پر عالم روح کے حقائق و اسرار کو کتنا ہی کھول کھول کر بیان کیا جائے تردد و تذبذب اور احتمال و شک کی خام پنداریاں پھر بھی ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن عالمِ لاہوت کا طائرِ برق پرواز اپنی ایک جست میں ہی اذعان و تیقن کے دائمی اطمینان و سکون سے سعادت اندوز ہو جاتا ہے پھر اسے لفظوں کی نہیں معنی کی، پیرایۂ بیان و اظہار کی نہیں اصل منشا و مطلب کی جستجو ہوتی ہے اور وہ اسی پر حصر کر کے راویوں کی عدالت و ثقاہت فن کے اصول جرح و تعدیل، اور الفاظ کی تعین و تشخیص سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اس کے جسم و جان کو محنت و عمل کا آتشکدہ بنا دینے کے لئے صرف محبوب کی ایک جنبش لب کافی ہے۔ وہ کبھی پیام حبیب پر ایمان لانے کے لئے اس کا کھوج نہیں لگاتا کہ یہ پیام اس تک کس کے ذریعہ پہنچا ہے اور وہ ثقہ ہے یا نہیں وہ مقصود حقیقی کے انداز کلام، طور گفتگو، اور اس کے آئین خطاب سے پورے طور پر آشنا ہوتے ہیں اسی لئے راوی کی ثقاہت و عدم ثقاہت سے قطع نظر وہ نفس کلام کو سن کر ہی معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کلام کس زبانِ حق ترجمان سے صادر ہوا ہے ولی را ولی می شناسد مشہور مقولہ ہے حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں حضرت ذوالنون مصری کی شان میں فرماتے ہیں:

> ''آن پیشوائے اہل ملامت، آں شمع جمع قیامت آن برہان موہبت و تجرید، آں سلطان معرفت و توحید آں حجت الفقر فخری ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ از ملوک طریقت بود سالک راہ بلاد ملامت بود اسرار توحید نظرے عظیم دقیق داشت و روشنی کامل و ریاضات و کرامات وافر۔''(۱)

---

(۱) تذکرۃ اولیاء ص ۸۷۔

اہل فن اورارباب جرح وتعدیل اپنے مقررہ اصول وضوابط کے ماتحت حدیث کے باب میں ان کے اعتبار واستناد سے متعلق کلام کرتے کوئی کہتا ہے "روی عنه من مالک احادیث فی اسانیدها نظر" کسی کا ارشاد ہے" ذوالنون اگر حدیثیں بیان کریں تو ان کی اسناد کو دیکھوا گر وہ درست ہو تو انہیں قبول کرلو۔"(۱) اوراس میں شبہ نہیں انہیں اس طرح کا کلام کرنے کا حق بھی ہے، کیونکہ یہ عالم عالم اسباب اور دنیا دنیاءِ قوانین ہے اگر ایسا نہ کیا جائے اور محض کشف وشہود کو حجت و برہان سمجھ لیا جائے تو عالم کا نظم ونظام مختل ہو جائے لیکن جس شخص کا قلب انوار و تجلیات ایزدی کا مہبط ہو اس کو اور اپنے اطمینان کے لئے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں جو اہل نظر ہوتے ہیں وہ ان گدڑی میں چھپے ہوئے لعل و جواہر کو ایک ہی نظر میں پہچان لیتے ہیں اور اس کی وقعت وعزت کرتے ہیں ابن جلاء کا بیان ہے:"میں نے چھ سو شیوخ سے ملاقات کی ہے لیکن مجھ کو ان میں چار جیسا کوئی نہیں ملا۔ انہیں چار بزرگوں میں سے ایک ذوالنون بھی ہیں۔"(۲)

ذوالنون کے لقب کی وجہ:

ان کے لقب ذوالنونؒ کی وجہ ان کا ایک عجیب وغریب واقعۂ کرامات ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ذوالنونؒ ایک مرتبہ کشتی میں سفر کر رہے تھے ان کا ہم سفر ایک بہت بڑا سوداگر بھی تھا جو کئی قسم کے قیمتی جواہرات اور کثیر مقدار میں سونا اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ اتفاق سے سوداگر کے یہ تمام جواہرات چوری چلے گئے کشتی میں حضرت ذوالنون کی مانند کوئی دوسرا غریب تھا نہیں۔ اس لئے کشتی کے لوگوں نے انہیں ملزم قرار دیا اور ان کو اذیت پہنچانے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت ذوالنون نے یہ دیکھ کر آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اٹھائے اور التجا کی" اے خدا جو حقیقت حال ہے تو اسے خوب جانتا ہے" ان کا یہ کہنا تھا کہ کئی مچھلیوں نے دریا سے سر نکالے۔ ان میں سے ہر ایک کے منہ میں ایک ایک موتی تھا، حضرت ذوالنون نے یہ موتی ان مچھلیوں سے لے لئے اور سوداگر کے حوالہ کر دیئے۔ اس عجیب وغریب واقعہ کو دیکھ کر کشتی کے تمام مسافر حیران رہ گئے، اور فوراً سب نے آپ کے قدموں پر گر کر آپ سے معافی طلب کی۔ عربی زبان میں 'نون' مچھلی کو کہتے ہیں اس بنا پر لوگ حضرت ذوالنون کو ذوالنون یعنی مچھلی والا کہنے لگے"۔(۳)

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۳۔ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۷۔ (۳) تذکرۃ الاولیاء باب سیزدہم ص ۷۹۔

استغراق فی التوحید:

حضرت ذوالنونؒ پر ہمہ وقت ایک عجیب محویت واستغراق فی التوحید کی کیفیت طاری رہتی تھی۔وہ کائنات عالم کو بہ نگاہِ عبرت دیکھتے۔اور پھر خدا کی ذات وصفات میں محو ہو جاتے تھے۔ یہی استغراق ان کے لئے وجہ سکون وطمانیت تھا جس کے بعد انہیں دنیا ومافیہا سے مکمل استغناء حاصل ہوگیا تھا۔ایک مرتبہ آپ دریا کے کنارے رات کے وقت تشریف لے گئے وہاں آسمان اور پانی کو دیکھ کر فرمانے لگے ''سبحان اللہ! اے آسمان اور اے پانی۔تم دونوں کی شان کس قدر عظیم وجلیل ہے نہیں بلکہ تم دونوں کو پیدا کرنے والا کس قدر عظیم الشان ہے۔وہ یقیناً تم دونوں سے بہت زیادہ رفیع المرتبت ہے جب رات زیادہ تاریک ہوگئی تو آپ نے یہ اشعار پڑھنے شروع کر دیئے:

اطلبوا لا نفسكم — مثل ما وجدت انا
قد وجدت لی سكنا — ليس فی هواه عنا
ان بعدت قربنی — او قربت منه دنا

ترجمہ:''تم بھی اپنے لئے ایسا ہی (ایک محبوب) تلاش کرلو جیسا میں نے پایا ہے میں نے اپنے لئے ایک سکون کا مامن پالیا ہے جس کی محبت میں کوئی مشقت نہیں ہے اگر میں اس سے دور ہوں تو وہ مجھ کو قریب کر لیتا ہے اور اگر میں اس سے قریب ہوں تو وہ اور نزدیک آجاتا ہے۔''(۱)

کیفیت جذب وحال:

وہ کیفیت جذب وحال سے ہمیشہ سرشار رہتے تھے، جب بغداد پہنچے تو صوفیاء کی جماعت کثیر نے ان کا شاندار استقبال کیا ان کے ساتھ ایک قوال بھی تھا لوگوں نے پوچھا ''حضرت! آپ کی اجازت ہو تو قوال کچھ سنائے۔'' آپ نے اجازت دے دی۔قوال نے یہ شعر پڑھے۔

صغير هواک عذبنی — فكيف به اذا احتنكا
وانت جمعت من قلبی — هوئ قد كان مشتركا
اما ترثی المكتئب — اذا ضحک الخلی بكا

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۷

ترجمہ: ''تیری تھوڑی سی محبت نے ہی مجھ کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔ پس کیا حال ہوگا جبکہ یہ شدید ہوگی (اے محبوبہ) جو محبت مشترک اور کئی لوگوں میں تقسیم تھی۔ تو نے اس کو میرے دل سے سمیٹ لیا ہے۔ کیا تجھے اس غمزدہ انسان پر رحم نہیں آتا جو اس وقت بھی روتا رہتا ہے جبکہ عشق سے نا آشنا ہنستا ہے۔''

حضرت ذوالنونؒ یہ اشعار سنتے ہی کھڑے ہوگئے۔ پھر منہ کے بل زمین پر گر پڑے خون آپ کے جسم سے بہہ رہا تھا لیکن یہ عجب بات ہے کہ زمین پر اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے بعد حاضرین مجلس میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور وجد کرنے لگا۔ حضرت ذوالنون نے پڑھا ''الذی یراک حین تقوم'' یہ سنتے ہی وہ شخص فوراً بیٹھ گیا۔ (۱)

آپ کے بھائی ذوالکفل کا بیان ہے ''ایک مرتبہ حضرت ذوالنونؒ کا ایک غلام بغداد میں کسی قوال کے پاس جا پہنچا۔ قوال اس وقت کچھ گا رہا تھا۔ حضرت ذوالنونؒ کی صحبت میں رہتے رہتے آپ کا غلام بھی صاحب وجد حال ہوگیا تھا۔ غلام نے جو یہ اشعار سنے اس پر عجیب ایک کیفیت بے خودی و سرشاری طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں اس نے ایک زور کی چیخ ماری۔ پھر جو دیکھا گیا تو وہ جسد بے روح تھا۔ حضرت ذوالنون کو اس واقعہ کی خبر ہوئی آپ نے قوال کو طلب فرمایا، اور انہیں اشعار کے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی، تعمیل ارشاد میں کیا دیر ہوسکتی تھی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان اشعار کے اثر سے چیخ تو نکلی حضرت ذوالنونؒ کے زبان مبارک سے لیکن قوال پر یہ اثر ہوا کہ اس کا طائر روح قفس جسم سے فوراً پرواز کر گیا حضرت ذوالنون نے فرمایا ''النفس بالنفس والجروح قصاص.''

گریہ وزاری اور عبرت پذیری:

جو اہل اللہ ہوتے ہیں۔ گردشِ دولاب پر بھی رقص کرنے لگتے ہیں اور بعض بہت معمولی معمولی چیزوں سے عبرت پذیر ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت ذوالنون کہیں تشریف لے جارہے تھے راستہ میں ایک عورت ملی۔ اس نے آپ سے پوچھا ''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ فرمایا ''میں پردیسی مسافر ہوں'' عورت بولی ''افسوس کیا اللہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی

(۱) تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۷

غربت زدہ لوگ پائے جاتے ہیں وہ تو پردیسیوں کا مونس اور ضعیفوں کا مددگار ہے'' حضرت ذوالنون عورت کی زبان سے یہ حکیمانہ فقرہ سن کر رونے لگے۔ عورت نے پوچھا ''آپ کیوں روتے ہیں؟'' فرمایا ''میری بیماری جس نے ناسور کا حکم اختیار کرلیا تھا۔ اس کی جلد ہی دوامل گئی۔ عورت نے کہا ''اگر آپ اپنے اس قول سے سچے ہیں تو پھر روئے کیوں؟ ارشاد ہوا تو کیا سچا آدمی روتا نہیں ہے۔ وہ بولی ''نہیں'' آپ نے پوچھا '' یہ کس طرح؟ عورت نے جواب دیا '' یہ اس لئے کہ رونے سے دل کو راحت ملتی ہے۔ اور گریہ بکا قلب کے لئے ایک مامن کا حکم رکھتا ہے، دل کا راز مخفی رکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ انسان آہ وزاری کو نہاں خانہ قلب میں چھپائے رکھے آنسو بہانے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور دل کی یہ سبکساری عقلمندوں کے نزدیک کمزوری ہے حضرت ذوالنون عورت کی اس گفتگو کو سن کر حیران رہ گئے۔ عورت نے پوچھا '' آپ کا یہ کیا حال ہے؟'' فرمایا '' مجھے آپ کے کلام پر تعجب ہوتا ہے۔'' پھر حضرت ذوالنونؒ نے سوال کیا '' مجھ کو کوئی ایسی بات بتائیے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو نفع دے'' عورت بولی '' تو کیا اب تک آپ کو جو فوائد ایک حکیم کے ذریعہ حاصل ہو چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے آپ زوائد سے مستغنی نہیں ہوئے؟ فرمایا 'نہیں میں زوائد سے مستغنی نہیں ہوں'' عورت نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں' اچھا اپنے رب سے محبت کیجئے اور اس کا اشتیاق رکھئے۔ کیونکہ ایک دن آئے گا جبکہ خدا اپنی کرسی کرامت پر اپنے اولیاء اور احباء کے لئے جلوہ فگن ہوگا اور ان کو اپنی محبت کا ایک ایسا پیالہ عطا فرمائے گا کہ اس کے بعد ان کو تشنگی محسوس ہی نہیں ہوگی حضرت ذوالنون یہ سن کر پھر زار وقطار رونے لگے۔ اس کے بعد عورت نے ایک فقرہ کہا اور حضرت ذوالنون کو اسی حالت میں چھوڑ کر روانہ ہوگئی۔ (۱)

دربار خلافت میں قدر ومنزلت:

حضرت ذوالنون کی ان عجیب وغریب کیفیات کو دیکھ کر پہلے پہل تو لوگوں نے ان پر طرح طرح کے شکوک وشبہات کئے۔ یہاں تک کہ ان پر الحاد و زندقہ کے الزامات لگائے گئے۔ متوکل علی اللہ جو اس زمانہ میں خلیفہ تھا اس نے بھی اسی طرح کے اعتراضات سے متاثر ہو کر ان کو قید خانہ میں بند کر دیا۔ ان کے تقویٰ وطہارت کا یہ عالم تھا کہ جیل خانہ کا محافظ ایک مرتبہ چوری سے حضرت ذوالنون کے لئے عمدہ کھانا تیار کرا کے لے آیا۔ اور خدمت سامی میں پیش کر کے درخواست کی آپ اس کو تناول فرمالیں لیکن آپ نے اس کے تناول فرمانے سے انکار کر دیا۔ (۲)

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ج ۸ ص ۳۹۴۔ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰۷۔

متوکل علی اللہ کو جلد معلوم ہو گیا کہ اس نے حضرت ذوالنون ایسے باکمال و خدارسیدہ بزرگ کو محبوس کر کے کس شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس نے ان کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ رہا کر دیا۔ متوکل کا اس زمانہ میں قیام سرمن رای میں تھا۔ وہیں اس نے حضرت ذوالنون کو طلب کیا۔ کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد آپ بغداد چلے آئے۔ اور پھر یہاں سے مصر تشریف لے گئے۔ (۱)

متوکل اب آپ کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ علامہ خطیب بغدادی نقل کرتے ہیں "**وکان المتوکل مولعا به یفضله علی العباد والزهاد**" لیکن حضرت ذوالنون شوکت شاہی سے ذرا مرعوب نہ ہوتے تھے۔ متوکل کے سوالات کے جوابات آزادی اور جرأت و جسارت سے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ متوکل نے دریافت کیا "اے ابوالفیض! آپ اولیاء کے صفات بیان فرمائیے" ارشاد ہوا "اے امیر المومنین! یہ وہ قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے بلند نور کا لباس پہنا دیا ہے اور جن کو اپنی کرامت کی چادروں سے رونق و زینت عطا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر مسرت کے تاج رکھے ہیں اور اپنی مخلوق کے دلوں میں ان کی محبت پھیلا دی ہے۔ پھر اس کے بعد خدا نے ان کو دنیا میں اس شان سے بھیجا کہ ان کے دلوں میں غیب کے ذخیرے جمع تھے اور ان کے دل وصال محبوب کی تمنا میں سرگردان، اور ان کی آنکھیں جلال ربانی کے مشاہدہ میں غرق و محو تھیں پھر اپنے احسانات میں چھپا لینے کے بعد ان اولیاء کو علاج اور مرض دونوں کی معرفت و تشخیص کی قوت مرحمت فرمائی اور ان کے شاگردوں کو ارباب تقویٰ و ورع بنایا اور ان کے لئے اس بات کی ضمانت کی کہ جب یہ دعا کریں گے اسے شرف قبول عطا فرمایا جائے گا۔" (۲)

ایک مرتبہ متوکل علی اللہ نے آپ سے درخواست کی "میرے لئے کوئی دعا لکھ دیجئے۔ اور قاضی یحییٰ بن اکثم کو اس بات پر مامور کیا کہ حضرت ذوالنون جو کچھ بتائیں وہ لکھتے جائیں آپ نے یہ دعا لکھوائی۔ اس دعا کا لطف چونکہ عربی زبان میں زیادہ ہے اس لئے ہم اصل دعا نقل کرتے ہیں۔ پھر اس کا ترجمہ کریں گے۔

"رب اقمنی فی اهل ولا یتک مقام رجاء الزیادة من محبتک واجعلنی ولها بذکرک فی ذکرک وفی روح بحالج اسمائک لاسمک وهب لی قدما اعادل بها

---

(۱) تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۲۹۶۔ (۲) ایضاً۔

بفضلک اقدام من لم یزل عن طاعتک واحقق بها ارتیاحاً
فی القرب منک واحف بها جولا فی الشغل بک،
ماحییت وما بقیت رب العلمین انک رؤوف رحیم. اللھم
بک اعوذ والوذواؤ مل البلغة الی طاعتک والمثویٰ
الصالح من مرضاتک وانت ولی قدیر۔"

ترجمہ: "اے رب تو مجھ کو اپنے اہل ولایت میں ایک ایسے مقام پر فائز کر جہاں میں تیری محبت کی زیادتی کی امید کرسکوں اور مجھ کو اپنے ذکر کی وجہ سے اپنے ذکر کا دیوانہ بنادے کہ تیرے ہی ذکر میں مجھ کو امن وچین اور راحت نصیب ہو۔ اور اپنے اسماء حسنیٰ کے باغیچوں میں لے جا کر مجھ کو اپنے نام کی لذت عطا فرما۔ اور مجھ کو ایسے قدم عطا فرما کہ تیری اطاعت سے منحرف نہ ہونے والوں کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جما کھڑا رہوں اور میں تیرے قرب کی وجہ سے ایک لذت خاص محسوس کروں۔ اور میں ہمیشہ تیری یاد اور تیرے ذکر میں ہی سرگرداں رہوں اے رب العالمین جب تک میں زندہ رہوں، میری یہی حالت رہے۔" تو بہت بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اے اللہ میں تیری ہی پناہ چاہتا ہوں تیری طاعت تک پہنچنے کی امید کرتا ہوں اور تیری رضامندی کے درست ٹھکانے کی توقع کرتا ہوں۔ تو ولی وقدیر ہے۔"

حضرت ذوالنون یہیں تک پہنچے تھے کہ یحییٰ بن اکثم نے کہا "اے ابوالفیض یہ ہی کافی ہے" آپ نے جواب دیا "اگر اللہ نے خیر کا ارادہ کیا تو ہاں بیشک متوکل ایسے شخص کے لئے یہی بہت ہے۔ آپ نے فرمایا اور یحییٰ بن اکثم کو الوداع کہہ کر تشریف لے آئے۔"

معرفت وسلوک میں ان کا مقام رفیع:

حضرت ذوالنون معرفت وسلوک کے جس مقام رفیع پر متمکن تھے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ شیخ الاسلام ابواسماعیل عبداللہ بن محمد الانصاری فرماتے ہیں:

"حضرت ذوالنون ان لوگوں میں نہیں ہیں کہ ان کو کرامات سے آراستہ کیا

جائے یا مقام و حال کے مقامات سے ان کی تعریف کریں۔ وقت تو ان کے ہاتھ میں پورے طور پر درماندہ ومسخر تھا۔ وہ وقت کے امام، زمانہ کے یگانہ، اور اس گروہ (اولیاء اللہ) کے سردار تھے۔ اور سب کو ان کے ساتھ نسبت واضافت ہے، ان سے پہلے بھی بڑے بڑے مشائخ گزرے ہیں لیکن اس لحاظ سے وہ سب سے پہلے آدمی ہیں کہ جو باتیں اب تک اشاروں میں کہی جاتی تھیں وہ انہوں نے صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیں۔'' (۱)

حضرت ذوالنون اپنے مقامات کی نسبت خود ایک موقع پر بیان فرماتے ہیں:

''میں نے تین سفر کئے اور تین علم حاصل کئے۔ پہلے سفر میں میں نے وہ علم حاصل کیا جس کو خاص و عام دونوں نے قبول کیا۔ دوسرے سفر میں میں نے وہ علم حاصل کیا جس کو خاص نے تو قبول کرلیا لیکن عوام اسے قبول نہ کر سکے۔ رہا تیسرا سفر یا تو اس میں میں نے ایسا علم حاصل کیا جس کو نہ خاص نے قبول کیا اور نہ عام نے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے اور میں تنہا رہ گیا مجھ کو سب نے ہی چھوڑ دیا۔''

شیخ الاسلام ابو اسماعیل الہروی حضرت ذوالنونؒ کے اس جملہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ آپ کا پہلا علم تو یہ تھا جس کو عام خاص دونوں نے قبول کیا۔ دوسرا علم توکل اور معاملت ومحبت تھا جس کو خاص نے ہی قبول کیا، عام نے نہیں، تیسرا علم حقیقت تھا جو مخلوق کے علم وعقل کے دائرہ سے باہر تھا۔ اس بنا پر لوگ اس کو سمجھ نہ سکے اور الٹے ان کے مخالف ہو گئے۔ ان مخالفوں کا یہ انکار حضرت ذوالنونؒ کی وفات تک برابر جاری رہا۔ (۲)

فصاحت:

حضرت ذوالنونؒ نہایت فصیح گفتار تھے۔ جب اپنی زبان حق ترجمان سے وعظ شروع کرتے تھے تو سخت سے سخت مخالف کا دل بھی موم ہو جاتا تھا۔ متوکل علی اللہ کی ناراضگی کا واقعہ اوپر گزر چکا ہے۔ اسی سلسلہ میں ابن العماد الحنبلیؒ لکھتے ہیں: ''متوکل علی اللہ کے پاس جب پے بہ پے

(۱) نفحات الانس مولانا عبدالرحمٰن جامی ص ۳۳۔ (۲) نفحات الانس ص ۳۴۔

حضرت ذوالنونؒ کے خلاف شکایتیں پہنچیں اور ان کو زندقہ الحاد کی تہمتوں سے متہمکیا گیا تو اس نے انہیں ''سر من رای'' میں طلب کیا لیکن حضرت ذوالنون نے متوکل کے سامنے پہنچتے ہی ایسا پر درد واثر وعظ کہا کہ متوکل بے ساختہ رونے لگا۔ اور حضرت ذوالنون کو عزت و کرامت کے ساتھ لوٹا دیا۔'' (۱)

حکیمانہ مقولے:

ان کے حکیمانہ مقولے بے شمار ہیں۔ سب کو نقل کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ذیل میں چند منتخب مقولے درج کر دینا کافی ہوگا۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو عقل کی خلعت سے بڑھ کر کوئی دوسری خلعت نہیں دی۔ اور اسی طرح علم سے زیادہ خوبصورت کوئی ہار عطا نہیں فرمایا، اللہ کی عطا کی ہوئی زینتوں میں سے سب سے بہتر زینت بردباری ہے اور ان تمام چیزوں کا کمال تقویٰ (۲) ہے۔

ایک مرتبہ یوں ارشاد فرمایا ''جسم بیمار ہوتا ہے تو درد و کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دلوں کا روگ گناہ ہیں۔ جس طرح جسم کی بیماری کے وقت کھانا لذیذ نہیں معلوم ہوتا اسی طرح دل گناہگار ہو تو اسے عبادت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی'' ایک دفعہ آپ نے کہا جو شخص نعمتوں کی قدر نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں نامعلوم طریقوں سے سلب کر لیتا ہے۔'' (۳)

ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا ''حضرت! میں آپ سے رخصت ہونے والا ہوں مجھ کو از راہ کرم کئی ایسی وصیت کیجئے کہ وہ میرے کام آتی رہے،'' آپ نے فرمایا بس یہ خیال رکھنا کہ کہیں لوگوں کے عیوب کی چھان بین تم کو خود اپنے عیوب کو دیکھنے سے غافل نہ رکھے۔ یقین کرو کہ تمہیں لوگوں کا نگراں بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے'' پھر فرمایا ''اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جو ان سب سے زیادہ عقلمند ہو۔ اور ایک انسان کی غایت عقلمندی اور تواضع کی علامت یہ ہے کہ کوئی شخص اس کو کوئی بات بتائے تو وہ اس کو غور و خوض سے سنے، اگر چہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہو۔ اور جب کوئی حق بات اس کے روبرو کی جائے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے۔ اگر چہ یہ حق بات کہنے والا مرتبہ میں اس سے کم ہی ہو، اور اگر اس سے کسی خطا کا صدور ہو جائے تو وہ اس کا اعتراف بے چون و چرا کرے۔'' (۴)

---

(۱) شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰۸۔ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۸، ۲۸۹

(۳) ایضاً ص ۲۸۸۔ (۴) ایضاً ص ۲۸۹، ۲۹۰۔

ایک دن آپ نے فرمایا ''انسان پر فساد چھ چیزوں سے آتا ہے'':

۱۔ آخرت کا عمل کرتے وقت نیت کا کمزور ہونا۔

۲۔ اپنے تن بدن کو شیطان کے گرد رکھ دینا۔

۳۔ موت کے نزدیک ہونے کے باوجود حرص و ہوس کی درازی۔

۴۔ مخلوق کی رضامندی کو خدا کی رضامندی پر ترجیح دینا۔

۵۔ خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ترک کر دینا۔

۶۔ بزرگوں کی لغزشوں کو اپنے لئے حجت بنانا اور ان کے ہنروں کو دفن کر دینا۔

ایک مرتبہ فرمایا ''زندگی کا طلب انہیں باہمت لوگوں کے ساتھ ہے جن کے دل تقویٰ اور پرہیزگاری پر مائل ہیں اور جن کو ذکر مولیٰ سے نشاط وانبساط حاصل ہوتا ہے'' ایک دفعہ ارشاد ہوا ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرو جو تمہارے بدل جانے سے خود متغیر نہ ہوں'' اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں دوستوں کی صحبت کا صحیح لطف حاصل ہو تو ایسی صحبت اختیار کرو جیسی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصاحبت کی تھی کہ دین اور دنیا دونوں میں کسی ایک بات پر بھی مخالفت نہیں ہوئی یقین ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر کا صاحب ہوگا۔

ایک دعا میں آپ نے فرمایا 'خدا کی محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اخلاق وافعال میں اور اوامر وسنن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو حبیب خدا ہیں ان کا تابع اور پیرو ہو' فرمایا 'خدا کے ساتھ صحبت نہ رکھو مگر موافقت کے ساتھ مخلوق کے ساتھ تمہاری مصاحبت محض مناصحت کی راہ سے ہونی چاہئے۔'' ایک جگہ فرمایا ''میں نے اس طبیب سے زیادہ جاہل نہیں دیکھا جو سرمستی کے وقت مستوں کا علاج کرے۔ مراد یہ تھی کہ جو لوگ دنیوی لذتوں میں مست ہیں ان کو وعظ و نصیحت کرنا بالکل بے کار ہے۔ مست کے لئے کوئی دوا اس وقت موثر ہو سکتی ہے جبکہ وہ ہشیار ہو اس وقت اس کا علاج توبہ سے کرنا چاہئے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے پوچھا حضرت عارف کس کو کہتے ہیں؟ فرمایا: ''عارف عام لوگوں میں سے ہوتا ہے مگر ان سے الگ بھی'' عارف کو چاہئے کہ خائف ہو یعنی اللہ کا خوف کرتا رہے نہ یہ کہ وہ واصف ہو یعنی یہ کہ وہ اپنی معرفت شناسی کا حال بیان کرتا پھرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء'' اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔

پھر فرمایا عارف کو ایک ہی حالت پر برقرار رہنا زیبا نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر تو عالم غیب سے ہر ساعت ایک نئی حالت کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صاحب حالات کہلاتا ہے، نہ صاحب حالت'' ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا'' معرفت تین قسم کی ہوتی ہے، ایک معرفت توحید، یہ عام مومنوں کو حاصل ہوتی ہے، دوسری معرفت حجت و بیان، یہ قسم حکماء بلغاء اور علماء کے لئے مخصوص ہے۔ تیسری قسم معرفت صفات وحدانیت ہے جو صرف اہل اللہ اور ارباب کشف وشہود کو حاصل ہوتی ہے'' پھر اسی معرفت کے حاصل کرنے میں کسب وسعی کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ جب حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کی چشم بصیرت وا کر دیتے ہیں تو یہ معرفت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ (۱)

یوسف بن الحسن بیان کرتے ہیں'' ایک مرتبہ میں نے حضرت ذوالنون سے سنا فرما رہے تھے صالحین کی صحبت سے زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور دنیا کی تمام بھلائیاں ایک ایسے دوست میں جمع ہیں جو تم کو اس وقت بھی یاد کرے جبکہ تم نے اس کو بھلا دیا ہو اور اگر تم اس کو یاد کرو وہ تمہاری اعانت وامداد کرے۔'' (۲)

وفات:

دوشنبہ ۲ ذیقعدہ ۲۴۶ھ کو بمقام جیزہ انتقال ہوا۔

---

(۱) یہ مقولے تذکرۃ الاولیاء ص ۸۵، ۸۶ سے ماخوذ ہیں۔ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۸۔

علماء شعر وادب

ابودلامۃ زند بن الجون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

زند نام ابودلامتہ کنیت، بعضوں نے نام زید بتایا ہے مگر یہ غلط ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلکان اور خطیب بغدادی دونوں زند لکھتے ہیں، بنواسد کا غلام تھا ابن خلکان میں ہے "انہ کان اسودا عبدا حبشاً" (1) علامہ بغدادی نے اصمعی کا یہ قول نقل کیا ہے ابودلامۃ حبشی غلام مگر نہایت فصیح زبان تھا۔" (2) ایک عربی النسل نے ابودلامۃ کے نسب پر طعن کرتے ہوئے کہا ہے:

الا ابلغ لدیک ابا دلامۃ — فلست من الکرام ولا کرامۃ
اذا لبس العمامۃ کان قردًا — وخنزیراً اذا وضع العمامۃ

ترجمہ: "ارے ذرا ابودلامۃ کو تم یہ پیغام تو پہنچا دو کہ تو نہ شریف آدمیوں کی نسل سے ہے اور نہ حسباً تو شریف ہے ابودلامۃ عمامہ سر پر رکھ لیتا ہے تو بندر بن جاتا ہے اور اسے اتار دیتا ہے تو سور بن جاتا ہے۔"

غلامی سے آزادی:

بعد میں اس کے آقا نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ ابوجعفر المنصور نے اس کی حاضر جوابی اور طلاقت لسانی سے متاثر ہو کر اسے اپنا مصاحب بنا لیا مگر معلوم ہوتا ہے ابودلامۃ نے ابوجعفر کی شاہانہ معیت وصحبت میں بھی اپنے آقا کو فراموش نہیں کیا تھا، چنانچہ ابودلامۃ نے منصور سے درخواست کی کہ وہ اس کے آقا کو بھی اپنے حلقہ مصاحبین میں شامل کرے۔ منصور نے ابودلامۃ کے پاس خاطر سے اس درخواست کو منظور تو کر لیا لیکن آئندہ کے لئے اس نوع کی سفارش سے باز رہنے کی سخت تاکید کرتے ہوئے کہا کہ پھر دوبارہ اگر ایسی حرکت کی تو قتل کر دیا جائے گا۔" (3)

---

(1) ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۰۔ (2) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۴۸۸۔ (3) تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۴۸۹۔

فضل وکمال:

ابو دلامۃ کا شمار عہد بنی عباس کے باکمال شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت، جزالت شعر، بدیہہ گوئی اور رندانہ مضامین کے بیان کرنے میں اپنے ہمعصر شعراء میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ علامہ بغدادی فرماتے ہیں۔

''وہ فطری شاعر تھا۔ اس کے نوادر بہت ہیں۔ فی البدیہ اشعار کہنے میں اسے ملکہ خاص حاصل تھا تمام فنون میں اس کے اور دوسرے شاعروں میں چوٹیں رہتی تھیں، شراب کے ذکر و وصف میں یگانہ تھا۔ اسی طرح باغوں کا سماں باندھنے اوران کے منظر بیان کرنے میں اس کا ہمسر نہیں ہوسکتا تھا۔'' (۱)

بدیہہ گوئی:

ابو دلامۃ کو بدیہہ گوئی میں خاص کمال حاصل تھا۔ ایک مرتبہ خلیفہ مہدی اور علی بن سلیمان دونوں شکار کے لئے گئے۔ ابو دلامۃ ان کے ہمراہ تھا۔ دوران شکار میں مہدی نے ایک ہرن پر تیر چلایا اور کامیاب رہا۔ لیکن علی بن سلیمان نے بھی ایک ہرن کونشانہ بنایا تو اس کا تیر خطا کر کے ایک کتے کے جالگا۔ اور وہ وہیں مر کے رہ گیا اس پر مہدی کو بڑی ہنسی آئی اس نے ابودلامۃ سے موقع کے مناسب شعر کہنے کی فرمائش کی۔ وابودلامۃ نے برجستہ کہا۔

قدرمی المھدی ظبیا　　شک بالسھم فوادہ

وعلی بن سلیما　　ن رمیٰ کلباً فصادہ

فھنیئاً لکما کل　　امرئ یاکل زادہ

ترجمہ:''مہدی نے ایک ہرن پر تیر چلایا اور تیر سے اس کا دل پھاڑ ڈالا اور علی بن سلیمان نے ایک کتے کے تیر مارا اور اس کا شکار کرلیا۔ پس تم دونوں کو مبارک ہو ہر شخص اپنا اپنا توشہ کھاتا ہے۔''

مہدی اس سے بڑا خوش ہوا اور ابودلامۃ کو تیس ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔

ایک مرتبہ ایک گدھے پر ایک عورت میں اور ایک مرد میں جھگڑا ہوگیا۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ

---

(۱) تاریخ بغدادی ج۸ص۴۸۹۔

کی عدالت میں معاملہ پیش ہوا، عورت نے اپنی طرف سے ابو دلامۃ کو اور اس کے ساتھ ایک اور شخص کو گواہی میں پیش کر دیا۔ ابن ابی لیلیٰ نے قاعدہ و قانون کے مطابق ابو دلامۃ کے شریک شہادت شخص کی تعدیل کی۔ یعنی اس کے معتبر گواہ ہونے کا ثبوت مانگا جو بہم پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد ابو دلامۃ کی باری تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ قاضی اس کی عدالت پر بحث کرے قاضی کے پاس جا کر یہ شعر پڑھے۔

ان الناس غطونی تغطیتُ عنهم — وان بحثوا عنی ففیهم مباحث

وان حضروا بئری حضرت بئارهم — لیعلم قومی کیف تلک النبائب

ترجمہ: ''اگر لوگوں نے میرے ساتھ پردہ پوشی کا معاملہ کیا تو میں بھی ان کے ساتھ پردہ پوشی کا معاملہ کروں گا اور اگر انہوں نے میرے ساتھ چھان بین کا سلوک کیا (تو میں بھی ایسا ہی کروں گا) کیونکہ ان کے اندر بھی قیل وقال کی بہت گنجائش ہے۔ اگر انہوں نے میرا کنواں کھودا تو میں ان کے کنوئیں کھودوں گا تا کہ میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ کنوئیں کھودنے کا کام کیسا ہوتا ہے۔''

ابن ابی لیلیٰ نے یہ شعر سن کر کہا ''ابو دلامۃ! ہم نے تیری شہادت معتبر مان لی ہے۔ اس کے بعد اس نے مدعیہ سے پوچھا تیرے گدھے کی قیمت کیا تھی؟ وہ بولی ''چار سو'' ابن ابی لیلیٰ نے اسے چار سو درہم دے کر رخصت کر دیا۔

ایک دفعہ خلیفہ منصور نے ابو دلامۃ سے کہا کہ تم کو ظہر اور عصر کی نماز پابندی سے جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔ دیکھو اس کے خلاف نہ ہو، ابو دلامۃ نے برجستہ کہا:

یکلفنی الاولیٰ جمیعًا وعصرها — ومالی وللا ولی ومالی وللعصر

وماضره. والله یغفر ذنبه — لو ان ذنوب العلمین علیٰ ظهری

ترجمہ: ''خلیفہ محمد کو ظہر اور عصر کی نماز با جماعت پڑھنے کی تکلیف دیتا ہے حالانکہ ظہر اور عصر کی نماز کا معاملہ صرف میری ذات سے متعلق ہے اللہ خلیفہ کی مغفرت فرمائے۔ اگر تمام عالم کے گناہ بھی میری پشت پر لاد دیے جائیں تو اس میں خلیفہ کا کیا نقصان ہوگا۔''

حاضر جوابی:

بدیہہ گوئی کی طرح ابو دلامۃ کو حاضر جوابی میں بھی بڑا کمال تھا۔ اور خلفاء ابو العباس السفاح ابو جعفر المنصور اور ابو عبداللہ المہدی سے اس کو اس درجہ اختصاص تھا کہ وہ حاضر جوابی میں کوئی مرعوبیت محسوس نہیں کرتا تھا۔

حمادہ بنت عیسیٰ خلیفہ منصور کی بیوی تھی اس کی وفات ہوئی تو منصور کو طبعی طور پر بہت رنج ہوا۔ جنازہ سے پہلے قبرستان پہنچ گیا۔ اور وہاں حمادہ کی قبر پر بیٹھ کر جنازے کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت ابو دلامۃ بھی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ منصور کی نظر ابو دلامۃ پر پڑی تو اس نے قبر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "**ما اعددت لهذا لمصرع**" تو نے اس بچھڑنے کی جگہ کے لئے کیا چیز تیار کی ہے؟ ابو دلامۃ نے فوراً کہا، حمادہ بنت عیسیٰ کو، منصور اس جواب پر بہت ہنسا اور اس کے ساتھ تمام حاضرین بھی ہنس پڑے۔

ایک دفعہ منصور نے ابو دلامۃ کو حکم دیا کہ تم فوج کے ساتھ عبداللہ بن علی سے جنگ کرنے جاؤ'' ابو دلامۃ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے کہا ''امیر المومنین! میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ مجھ کو لڑائی پر نہ بھیجیں کیونکہ اس سے پہلے میں نو لشکروں میں شریک ہو چکا ہوں اور وہ سب کے سب شکست کھا گئے'' منصور کو اتنی ہنسی آئی کہ ضبط نہ ہو سکا اور ابو دلامۃ کو جنگی خدمت سے معاف کر دیا۔''(۱)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا کہ روح بن حاتم المہلبی بصرہ کا گورنر تھا۔ یہ خراسان کی جنگ پر گیا تو ابو دلامۃ بھی ہمرکاب تھا۔ جنگ کے اثنا میں دشمن کی صف سے ایک بہادر نکلا۔ اس طرف سے کئی جنگ آزما اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے لیکن اس نے ان سب کو قتل کر دیا۔ اب گورنر بصرہ نے ابو دلامۃ سے فرمائش کی کہ اسے آگے بڑھ کر اس بہادر کا مقابلہ کرنا چاہئے، ابو دلامۃ نے معذرت کی لیکن اس کے انکار پر روح بن حاتم کا اصرار بڑھتا رہا تو ابو دلامۃ نے یہ شعر پڑھے۔

انی اعوذ بروحٍ ان یقدمنی	الی القتال فیخزیٰ بی بنو اسد
ان المهلب حب الموت اورثكم	ولم ارث اناحب الموت من احد
انِ الدنوا الی الاعداء اعلمه	مما یفرق بین الروح والجسد

---

(۱) یہ سب واقعات تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۴۸۹، ۴۹۰ سے ماخوذ ہیں۔

ترجمہ: ''میں روح سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو جنگ میں نہ بھیجے ورنہ میری وجہ سے بنو اسد رسوا ہو جائیں گے۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ مہلب نے موت کی محبت تم کو ورثہ میں دی ہے لیکن میں نے یہ محبت کسی سے ورثہ میں نہیں پائی ہے، اور دشمنوں سے قریب ہونا میں جانتا ہوں ان چیزوں میں سے ہے جو روح اور جسم کے درمیان تفریق پیدا کر دیتی ہے۔''

روح ان اشعار کو سننے کے بعد بھی نہیں پسیجا اور اس نے قسم دے کر کہا کہ نہیں تم کو بہر حال جنگ میں شریک ہونا پڑے گا۔ روح نے مزید برآں کہا کہ اگر تم خلیفہ کی طرف سے جنگ نہیں کرتے تو وظیفہ شاہی کس بات کا پاتے ہو؟ ابودلامۃ نے جواب دیا ''میں وظیفہ اس بات کا پاتا ہوں کہ سلطان کی طرف سے مدافعت کروں۔ اس بات کا نہیں کہ اس بہادر کے مقابلہ میں آ کر مقتولین سے جاملوں'' غرض یہ کہ ابودلامۃ نے اپنی حاضر جوابی سے ہر چند گورنر کو قائل معقول کرنا چاہا مگر اس کی ایک شنوائی نہیں ہوئی۔ اور ابودلامۃ کو چاروناچار گھوڑے پر بیٹھ، تلوار لگا۔ اور ناشتہ باندھ مقابلہ میں جانا پڑا۔ لیکن اس نے وہاں پہنچ کر قتل وقتال کے بجائے بہادر دشمن کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اسے خود روح کے پاس ایک طالب امن کی حیثیت سے لے آیا جس کا ثمرہ یہ ہوا کہ خراسانی لشکر شکست کھا گیا اور روح کو کامیابی ہوئی۔ (۱)

خلفاء سے راہ ورسم:

ابودلامۃ اگر چہ غلام تھا، اور غلام بھی حبشی لیکن اپنے فضل وکمال، شاعری حاضر جوابی، اور بدیہہ گوئی کی وجہ سے خلفاء کے دربار میں بڑی وقعت حاصل تھی اور وہ اس کی دلجوئی و دلدہی کا بڑا خیال رکھتے تھے ایک مرتبہ شراب پینے کے جرم میں ابوجعفر منصور نے اس کو قید کرادیا۔ اور قید کرایا بھی تو کہاں؟ مرغیوں کے بند ہونے کی جگہ میں تاکہ وہ اپنے نفس کو حقیر وذلیل سمجھے۔ ابودلامۃ کو نشا اتر جانے کے بعد ہوش آیا اور اس نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں دیکھا تو چند اشعار کا ایک قطعہ لکھ کر محافظ قید خانہ کے حوالہ کیا اور کچھ دینے دلانے کا وعدہ کر کے اس کے ذریعہ وہ قطعہ خلیفہ تک پہنچادیا۔ اس قطعہ کے آخر میں کہتا ہے۔

---

(۱) یہ واقعہ بڑی تفصیل سے ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۰، ۱۹۱ میں لکھا ہے۔ لیکن ہم نے طوالت کے ڈر سے اس کی غیر ضروری تفصیلات قلم انداز کر دی ہیں۔

قد کانت تحدثنی ذنوبی بانی من عذابک غیر ناج
علی انی وان لاقیت شراً بخیرک بعد ذاک الشرراج

ترجمہ: ''مجھ سے میرے گناہ بیان کرتے تھے کہ میں تیرے عذاب سے نجات نہ پاسکوں گا، مگر اس کے باوجود کہ تیری طرف سے آئی ہوئی مصیبت دیکھی ہے میں اس کے بعد تجھ سے خیر کی امید کرتا ہوں۔''

امیر المومنین نے یہ اشعار دیکھے تو خود ابودلامۃ کو بلا کر یہ اشعار اس کی زبان سے سنے اور ہنسے اور پھر اس کو رہا کر دیا۔

حسن طلب:

عام درباری شاعروں کی طرح ابودلامۃ بھی حسن طلب میں کمال رکھتا تھا اور خلفاء قدردان تھے۔ اس لئے اس کو کبھی اپنی طلب میں ناکامی نہیں ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ ابودلامۃ کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ اس رات کی صبح کو ہی خلیفہ منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی لڑکی کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ منصور ؒ نے پوچھا ''نام کیا تجویز کیا ہے؟'' بولا ''ام دلامۃ'' خلیفہ نے کہا ''اس سے کیا مراد ہے؟'' جواب دیا ''تاکہ امیر المومنین اس کی وجہ سے میری امداد کریں۔ خلیفہ نے پھر سوال کیا ''کیا تم نے اس لڑکی سے متعلق کچھ اشعار کہے ہیں ابودلامۃ نے کہا ''جی ہاں'' اور پھر خلیفہ کی خواہش پر یہ اشعار سنائے:

فما ولد تک ام عیسیٰ ولم یکفلک لقمان الحکیم
ولکن قد تضمک ام سوء الی لباتھا واب لیئم

ترجمہ: ''اے بچی تجھ کو نہ تو حضرت مریم نے جنا ہے اور نہ تیری کفالت لقمان حکیم نے کی ہے لیکن تجھ کو ایک بری ماں اپنے سینہ سے لگاتی ہے اور تیرا باپ لئیم غیر شریف ہے۔''

ابوجعفر منصور کو یہ اشعار سن کر بے ساختہ ہنسی آئی۔ پھر ابودلامۃ نے چیتھڑوں سے سلا ہوا ایک تھیلا نکالا، خلیفہ نے پوچھا ''یہ کیا ہے؟'' ابودلامۃ بولا ''جو کچھ آپ مجھ کو عنایت فرمائیں گے میں اس میں رکھ لوں گا خلیفہ نے حکم دیا کہ یہ تھیلا دراہم سے پر کر دیا جائے۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ ا میں دو ہزار درہم سما گئے ہیں۔

ایک دفعہ ابودلامۃ خلیفہ مہدی کے پاس گیا، اور ایک کتے کی فرمائش کی۔ پھر بولا کہ اس کے لئے ایک نوکر کی ضرورت ہے جو شکار میں کتے کو لے کر چلے۔ مہدی نے ایک غلام بھی دلوا دیا۔ پھر ابودلامۃ نے کہا ''ایک سواری بھی چاہئے جس پر لاد کر شکار لایا جائے۔ خلیفہ نے اسے بھی منظور کر لیا اور ایک سواری دے دی۔ اس کے بعد ابودلامۃ بولا ''سرکار! ایک باندی بھی درکار ہے جو شکار کا گوشت پکائے، مہدی نے اس فرمائش کو بھی پورا کر دیا۔ اب اس نے کہا ''امیر المومنین! کوئی ایسا سہارا بھی چاہئے جس کی وجہ سے میں ان سب چیزوں کے اخراجات برداشت کر سکوں امیر المومنین نے اس کے جواب میں سو جریب آباد زمین اور سو جریب غیر آباد زمین دے دی'' عربی میں غیر آباد زمین کو غامر کہتے ہیں۔ خلیفہ کی زبان سے غامر کا لفظ نکلا تو ابودلامۃ نے پوچھا ''یہ غامر زمین کونسی ہوتی ہے۔ مہدی نے کہا ''یہ وہ خراب زمین ہے جس میں کوئی چیز اگی نہ ہو'' ابو دلامۃ کی جرأت و بے تکلفی دیکھئے کہتا ہے ''تو پھر اے امیر المومنین بنو اسد کی زمینوں میں سے پانسو جریب غیر آباد (غامر) زمین میں نے آپ کو دی'' اس کے بعد خلیفہ نے پوچھا ''کیا اب بھی تمہارے دل میں کوئی حاجت رہ گئی ہے'' ابودلامۃ نے کہا ''جی ہاں'' خلیفہ نے پوچھا وہ کیا ہے! ابو دلامۃ بولا وہ یہ کہ میں آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دوں آپ مجھے اس کی اجازت دے دیجئے مہدی نے کہا ''ایسا ہونا تو ناممکن ہے'' ابودلامۃ نے کہا ''آپ نے میری ایسی کوئی حاجت رد نہیں کی جس کا رد ہو جانا اس حاجت (دست بوسی) کے رد ہونے سے زیادہ آسان ہو۔ یعنی یہ میری سب سے بڑی حاجت تھی جس کا منظور نہ ہونا مجھ کو بہت شاق ہے۔

خلفاء کی مسامحت اور قدر دانی نے ابودلامۃ کو اس درجہ بے باک اور گستاخ کر دیا تھا کہ بعض اوقات وہ زر طلبی کے لئے خلیفہ اور اس کی حرم کے ساتھ رکیک قسم کا مذاق کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابودلامۃ خلیفہ مہدی کے پاس آیا اور غمگین صورت بنا کر کہنے لگا ''امیر المومنین! ام دلامۃ (ابودلامۃ کی بیوی) کا انتقال ہو گیا اور اب میرا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں رہا مہدی نے انا للہ کہا اور ابودلامہ کو دس ہزار درہم دینے کا حکم دیا کہ تم اس رقم سے ایک باندی خرید لو گھر کے کاموں میں تمہاری مدد کرے'' ادھر ابودلامۃ نے خود یہ حرکت کی اور ادھر ام دلامہ کو مہدی کی بیوی خیزراں کے پاس بھیجا جس نے جاتے ہی خیزراں سے کہا کہ ابودلامۃ کا انتقال ہو گیا۔ اور میں بغیر سہارے کے رہ گئی'' خیزراں کو ابودلامۃ کی خبر موت سے بڑا رنج ہوا اور اس نے ام دلامۃ کو ایک ہزار درہم دینے کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ کے بعد مہدی محل میں گیا تو اس کے چہرہ پر حزن والم

کے آثار دیکھ کر خیزراں نے دریافت کیا امیر المومنین کیا بات ہے؟ جو آپ ملول نظر آتے ہیں خلیفہ بولا ام دلامۃ کا انتقال ہو گیا، خیزراں نے کہا ''نہیں بلکہ ابو دلامۃ کا انتقال ہوا ہے۔ اب مہدی کو شبہ ہوا کہ اس کے اور خیزراں کے ساتھ کیا چال چلی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ صرف یہ کہہ کر دونوں میاں بیوی نے ہم کو دھوکا دیا ہے، چپ ہو گیا۔

ایک عجیب لطیفہ:

ابو دلامۃ اپنی جرأت اور بے باکی سے فائدہ اٹھا کر بعض اوقات مذاق میں کلمۂ حق بھی کہہ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ابو دلامۃ کئی روز تک ابو جعفر منصور کے دربار میں حاضر نہیں ہوا، پھر وہ آیا تو خلیفہ نے تاکید کر دی کہ وہ محل شاہی میں روز حاضر ہو اور ساتھ ہی مسجد میں جا کر نماز باجماعت میں شرکت کرے اور ایک شخص کو اس کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔ اس کے بعد ابو جعفر کا وزیر ابو ایوب المرزبانی ابو دلامۃ کے پاس سے گزرا تو اس نے وزیر کو ایک سربمہر لفافہ دیا اور اس سے خلیفہ تک اس کو پہنچا دینے کی درخواست کی۔ لفافہ میں چند اشعار کا ایک قطعہ تھا جس میں لکھا تھا کہ مجھ سے نماز باجماعت کی پابندی نہیں ہو سکتی۔ منصور کو یہ رقعہ پڑھ کر ہنسی آئی اور اس نے ابو دلامۃ کو بلا کر کہا کہ تم خود اس قطعہ کو پڑھ کر سناؤ۔ ابو دلامۃ جانتا تھا کہ اگر اس نے خود اس قطعہ کو پڑھ کر سنایا تو چونکہ اس میں نماز باجماعت کے ترک کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے خلیفہ اس پر حد جاری کر دے گا۔ اس خیال سے ابو دلامۃ نے کہا ''میں اس قطعہ کو اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا ہوں۔ آپ خود ہی پڑھ لیجئے۔'' ابو جعفر منصور بولا ''اگر تم اس قطعہ کو پڑھ دیتے تو میں تمہیں ضرور پٹواتا۔'' ابو دلامۃ نے کہا ''کیا خوب درآنحالیکہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "یقولون مالا یفعلون" یہ لوگ وہ بات کہتے ہیں جسے خود نہیں کرتے'' یعنی جب آپ خود مسجد میں پانچ وقت حاضر ہو کر نماز جماعت سے ادا نہیں کرتے تو پھر مجھ سے کیوں اصرار کرتے ہیں کہ میں ایسا کروں'' ابو دلامۃ کی زبان سے یہ بات سن کر خلیفہ منصور کو کسی قسم کی ناگواری نہیں ہوئی بلکہ اسے ہنسی آ گئی اور ابو دلامۃ کی حاضر جوابی پر خوش ہو کر اس نے اس کو انعام دلایا۔

ایک دفعہ منصور نے کسی ضرورت سے چند گھروں کے ڈھا دینے کا حکم دیا ان میں ابو دلامۃ کا گھر بھی شامل تھا۔ ابو دلامۃ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے یہ شعر لکھ کر خلیفہ کی خدمت میں روانہ کئے۔

یا ابن عم النبی دعوۃ شیخ — قد دناھدم دارہ وبوارہ

لکم الارض کلھا فاعیروا — عبدکم ما احتری علیہ جدارہ

ترجمہ: ”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم تو اس بڈھے کی فریاد سن جس کا گھر گرنے کے قریب ہے اور اس کی ہلاکت و بربادی نزدیک ہے، تمہارے لئے تو ساری ہی زمین ہے، پس تم اپنے غلام کو عاریت کے طور پر اتنی زمین دے دو کہ اس پر اس کی دیوار قائم ہو سکے۔“

منصور نے یہ سن کر حکم دیا کہ ابودلامۃ کو اس گھر کے بدلے میں دوسرا گھر دے دیا جائے خلفاء کی قدردانی کی وجہ سے حکومت کے اعمال واعیان بھی ابودلامۃ کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اسکے ساتھ حسن سلوک کرتے رہتے تھے۔ ایک بار ابودلامۃ پر دو ہزار کے قریب دراہم کا قرضہ ہو گیا۔ قرض خواہ ایک اعرابی تھا۔ اس نے سختی کے ساتھ اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا تو ابودلامۃ سخت پریشان ہوا اور اس نے سعید ابن دعلج کے نام جو بصرہ کا حاکم تھا ایک منظوم خط لکھ کر بغداد سے اپنے چچا زاد بھائی کے ذریعہ اس کے پاس بھجوا دیا، ابن دعلج نے فوراً ابودلامۃ کی خواہش کے مطابق مطلوبہ رقم اس کے پاس بھیج دی۔ (1)

ایک دفعہ مہدی رئی سے بغداد واپس آیا تو ابودلامۃ سلام وتہنیت کی غرض سے حاضر ہوا۔ خلیفہ نے اس کی مزاج پرسی کی۔ اس پر اس نے یہ شعر سنائے:

انی حلفت لئن رایتک سالما یقریٰ العراق وانت ذوو فر
لتصلین علیٰ النبی محمد ولتملأن دراهما حجری

ترجمہ: ”میں نے اس بات کی قسم کھا رکھی تھی کہ اگر میں نے آپ کو عراق کے علاقوں میں صحیح وسالم دیکھ لیا حالانکہ آپ مسرور ومطمئن ہوں، تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ وسلام بھیجیں گے اور میری گود کو دراہم سے پر کردیں گے۔“

مہدی نے (غالباً بر سبیل مزاج) کہا ”تمہاری پہلی قسم تو ٹھیک ہے، مگر دوسری نہیں“ ابودلامۃ بولا اللہ مجھ کو آپ پر قربان کردے، یہ دو ایسے کلمے ہیں جن میں تفریق نہیں ہو سکتی مہدی نے حکم دیا کہ ابودلامۃ کی گود دراہم سے پر کردی جائے۔

وفات:

۱۶۱ھ میں انتقال ہوا، بعض کا خیال ہے کہ ابودلامۃ ہارون رشید کے تخت نشین خلافت ہونے یعنی ۱۷۰ھ تک زندہ رہا۔ لیکن پہلی روایت ہی صحیح ہے۔

---

(1) یہ سب واقعات ابن خلکان اور تاریخ بغدادی سے ماخوذ ہیں۔

احمد بن محمد بن عبدربہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

احمد نام، ابوعمر کنیت، قرطبہ کا رہنے والا تھا، اس لئے قرطبی کہلاتا ہے۔ اس کا جدِ اعلیٰ سالم ہشام بن عبدالرحمٰن جو اندلس کے بنواُمیہ میں سے ہے۔ غلام تھا۔ ۱۰ رمضان ۲۴۶ھ میں ولادت ہوئی۔

علم وفضل:

ابن عبدربہ کا شمار فاضل علماء اسلام میں ہوتا ہے۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''کان من العلماء المکثرین من المحفوظات والاطلاع علی اخبار الناس'' وہ ان علماء میں سے تھا جن کی محفوظات کا ذخیرہ بہت وسیع ہو۔ اور جن کو اخبار وروایات کا علم بہت زیادہ ہو۔ (۱) حمیدی کا بیان ہے ''وابوعمر من اهل العلم والادب والشعر''۔ (۲)

شاعری اورادب:

ابن عبدرہ کو عربی نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت تھی، نظم میں اسے تغزل اور قصیدہ دونوں میں کمال حاصل تھا۔ غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عشق ومحبت کے مضامین سادہ انداز بیان کے ساتھ اس طرح ادا کئے جائیں کہ ان میں انسان کے حقیقی جذباتِ محبت کا عکس نظر آئے اور اس میں شاعرانہ مبالغہ پردازی سے زیادہ واقعیت کا رنگ نمایاں ہوا ابن عبدربہ کے غزلیہ اشعار میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ مثال کے لئے اشعار ذیل دیکھئے:

ودعتنی بزفرة واعتناق — ثم نادت متیٰ یکون التلاق

وبدت لی فاشرق الصبح منها — بین تلک الجیوب والاطواق

یاسقیم الجفون من غیرسقم — بین عینیک مصرع العشاق

ان یوم الفراق افظع یوم — لیتنی مت قبل یوم الفراق

---

(۱) ابن خلکان ج ا ص ۳۲۔ (۲) معجم الادباء ج ۴ ص ۲۱۳۔

ترجمہ: ''میری محبوبہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے اور گلے ملتے ہوئے مجھ کو الوداع کہا، پھر اس نے (بھرائی ہوئی آواز سے) کہا ''اب کب ملاقات ہوگی؟''

وہ میرے سامنے آئی تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس کے گریبان اور ہار کے درمیان صبح کی پو پھٹ رہی ہے، یعنی اس کی گردن کا نچلا حصہ جو قمیص کے کالر سے باہر نکلا ہوا تھا صبح کی طرح چمک رہا تھا۔

(میں نے کہا) اے بغیر بیماری کے بیمار پلکوں والی محبوبہ تیری دونوں آنکھوں کے درمیان ہی تو عاشقوں کی قتل گاہ ہے کوئی شبہ نہیں فراق کا دن سب سے زیادہ سخت اور کڑا دن ہے، اے کاش، میں جدائی کے دن سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔

رمز شناسان بلاغت جانتے ہیں۔ پہلے شعر میں ''ثم'' کا لفظ کس درجہ برمحل اور معنی خیز ہے۔ثم عربی زبان میں تراخی کے لئے آتا ہے،تو شاعر نے یہ کہہ کر اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محبوبہ نے پہلے پہل فرط اضطراب سے معانقہ کیا اور ٹھنڈے سانس بھرتی رہی پھر اس کو جب ذرا سکون ہوا اور وہ چلنے لگی تو اس نے پوچھا اب کب ملاقات ہوگی، پھر یہ بھی دیکھے کہ اگر بجائے ''نادت'' کے شاعر ''قالت'' کہتا تو شعر میں وہ خوبی پیدا نہ ہوتی جو ''نادت'' کے لفظ سے پیدا ہوگئی ہے۔اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فرط اضطراب کی وجہ سے محبوبہ کی آواز تھر گئی تھی اور اس لئے اگرچہ وہ پاس ہی کھڑی ہوئی تھی لیکن اضطراری طور پر آواز اس کے حلق سے اس طرح نکل رہی تھی کہ گویا وہ کسی کو آواز دے رہی ہے۔

ایک دفعہ ابن عبدربہ کے کسی محبوب ترین دوست نے سفر کرنے کا ارادہ کیا اور روانگی کے لئے صبح کا وقت مقرر بھی کر دیا لیکن اتفاق سے صبح کو زور سے بارش ہونے لگی، جس کی وجہ سے دوست کو روانگی کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔اس پر ابن عبدربہ نے چند اشعار لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا وہ اشعار یہ ہیں:

هلا ابتكرت لبين انت متبكر   هيهات يابى عليك الله القدر

مازلت حذار البين ملتهفا   حتى رثالى فيك الريح والمطر

يابرده من حيا مزن على كبد   نيرانها بغليل الشوق تستعر

اليت الا ارى شمسا ولا قمرا   حتى اراك فانت الشمس والقمر

ترجمہ: ''تم نے جدا ہو جانے میں جلدی کیوں نہیں کی۔ تم تو جلدی کرنے والے تھے ہاں بس رہنے بھی دو، اللہ اور تقدیر تو دونوں تمہیں جانے سے روکنے والے تھے (پھر تم کس طرح جلد رخصت ہو سکتے تھے۔)

میں حسرت زدگی کے ساتھ جدائی کے ڈر سے برابر روتا رہا یہاں تک کہ تمہارے معاملہ میں ہواؤں اور بارش کو بھی میرے حال زار پر ترس آ گیا۔

سبحان اللہ! بارش کی اس ہلکی پھوار کا کیا کہنا جس نے تپش شوق سے مشتعل ہونے والی آگ میں جلتے ہوئے جگر کو ٹھنڈا کر دیا۔

میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک تمہیں نہیں دیکھ لوں گا سورج اور چاند کو نہیں دیکھوں گا، کیونکہ (دراصل) میرے آفتاب و ماہتاب تو تم ہی ہو۔

پہلے شعر میں شاعر نے جس محبت آمیز طنز کے پیرایہ میں دوست کے سفر نہ کر سکنے پر اپنی خوشی کا اظہار نہایت بلیغ انداز میں کیا ہے حق یہ ہے کہ اس کی داد نہیں دی جا سکتی اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو جانے کی بڑی جلدی کر رہے تھے لیکن چلے نہیں گئے! اور ہاں جاتے کس طرح؟ قدرت تو تمہارے نہ جانے کا اٹل فیصلہ کر چکی تھی۔

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عبدربہ کی نگہِ حقیقت آشنا سے انسانی جذبات و حسیات کا مخفی سے مخفی گوشہ بھی پوشیدہ نہ تھا پھر اسکی قدرت کلام کا یہ عالم ہے کہ معنوی احساسات کو اس انداز سے نظم کرتا ہے کہ وہ پیکر محسوسات میں جلوہ نما ہو کر سننے والوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہی شاعری منتہائے کمال ہے۔

غزلیہ اشعار کے علاوہ ابن عبدربہ نے بعض قصائد بھی کہے ہیں جو منذر بن محمد ابن عبدالرحمٰن بن الحکم کی مدح میں ہیں منذر اُندلس کے حکمرانِ بنو امیہ میں سے تھا ان میں سے ایک قصیدہ میں کہتا ہوں۔

بالمنذر بن محمد   شرف بلاد الاندلس

فالطیر فیها ساکن   والوحش فیها قَدْ اَنَسْ

ترجمہ: ''اندلس کے شہر منذر بن محمد کے دم سے شرف اندوز ہو گئے پرندے ان شہروں میں ساکن ہیں اور وحشی جانور ان میں مانوس ہیں۔''

ایک ہم عصر شاعر الابادی التونسی نے اس پر معارضہ کر کے اس بحر اور قافیہ میں ایک

قصیدہ لکھا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ربع لزینب قد درس　　　واعتاض من نطق خرس

ترجمہ: ''زینب کا گھر مٹ گیا اور گویائی کے عوض اس کو گنگ ملا۔''

متنبّی کا اعتراف:

ابن عبدربہ کے کمالِ شاعری کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی کا مشہور شاعر ابو الطیب متنبّی جو اپنی سخن سنجی کے سامنے بڑے سے بڑے کامل الفن شاعر کو نظر میں نہیں لاتا تھا، وہ بھی ابن عبدربہ کی فصاحت و بلاغت شعر کا صدق دل سے معترف تھا اور اندلس کا کوئی شخص اس سے ملتا تو وہ فرمائش کر کے ابن عبدربہ کا کلام سنتا تھا ایک مرتبہ خطیب ابوالولید بن عسال حج سے واپس ہوتے ہوئے مصر میں ٹھہرے تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر مسجد عمرو بن العاص میں متنبّی سے بھی ملاقات کی۔ دونوں میں دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ اسی اثناء میں متنبّی نے خطیب ابوالولید سے کہا ''کیا آپ مجھ کو اندلس کے ملیح الکلام شاعر (ابن عبدربہ) کے کچھ شعر سنائیں گے؟ انہوں نے کہا ''ضرور'' اور پھر یہ شعر سنائے:

یالؤلواً یسبی العقول انیقاً　　　ورشا بتقطیع القلوب رفیقًا

ما ان رأیت ولا سمعت بمثله　　　ورداً یعود من الجناء عقیقًا

واذا نظرت الٰی محاسن وجهه　　　ابصرت وجهک فی سناه غریقا

یامن تقطع خصره من رَدِفهٖ　　　ما بال قلبک لایکون رقیقًا

ترجمہ: ''اے صاف وشفا موتی جو عقلوں کو گرفتار کر لیتا ہے اور نہ سنا جو ہاتھ میں لیتے ہی عقیق بن جاتا ہے۔ اے مخاطب اگر تو اس کے چہرے کی خوبیوں کو دیکھے تو تجھ کو اپنا چہرہ اس کے چہرے کی چمک اور رونق میں ڈوبا ہوا نظر آئے گا۔

اے وہ جس کی کمر بہت ہی نازک ہے...... تیرے دل کو کیا ہو گیا کہ وہ نرم نہیں ہوتا۔''

خطیب یہ اشعار سنا چکے تو متنبی نے ان کو مکرر پڑھنے کی فرمائش کی پھر فرط مسرت و کیف سے تالیاں بجائیں اور عالم تصور میں ابن عبدربہ کو مخاطب کر کے کہا اے ابن عبدربہ تیرے سامنے تو

عراق کے شعراء بھی زانو بستہ ہو کر آئیں گے''اس زمانہ میں عراق کو شعر و شاعری میں مرکز کا مرتبہ حاصل تھا۔ [۱]

کلام پر عجمیت کا اثر:

ابن عبدربہ جس عہد کا شاعر تھا اس عہد میں عجمیوں اور بالخصوص ایرانیوں کے ساتھ معاشرتی اختلاط رکھنے کے باعث عربی شاعری میں طرز واجبات اور مبالغہ پردازی کے اعتبار سے عجمیت کا کافی اثر پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ متنبی کے کلام میں بھی عجمی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ابن عبدربہ بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس کے مجموعۂ کلام میں غور کیا جائے تو اس کی مثالیں کثرت سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے قطعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا معشوق مونث کے بجائے کوئی مذکر ہے جو ایرانی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے۔

یاذا الذی خط الجمال بخده　　　خطین هاجا لوعة وبلابلا

ماصح عندی ان لحظک صارم　　　حتی للبست بعارضیک حمائلاً

یہ اشعار محض تمثیلاً نقل کئے گئے ہیں۔ [۲]

محصات:

ابن عبدربہ کا ابتدائی کلام حسن وعشق کے رموز اور محبت والفت کے اسرار پر مشتمل تھا لیکن آخر عمر میں اس نے اس طرح کے اشعار لکھنے سے توبہ کر لی تھی۔ اور عاشقانہ اشعار کے بجائے زہد، دنیا کی بے ثباتی، اور عبرت ونصیحت کے مضامین نظم کرتا تھا، اور تلافی مافات کے لئے اس نے جدت یہ کی تھی کہ پہلے اس نے جو اشعار عاشقانہ کہے تھے اخر عمر میں اس نے انہی اشعار میں انہیں اعایض وقوافی پر چند زہدیہ اشعار کا اضافہ کر دیا جن کی وجہ سے پوری غزل یا قطعہ عاشقانہ ہونے کے بجائے واعظانہ ہو گیا اور اس نوع کے قطعات کا نام محصا ترکھا، مثلاً و پر اس کی ایک غزل کے چند شعر گزر چکے ہیں جس کے شروع میں کہتا ہے:

هلا ابتكرت لبين انت بتكر

توبہ کر لینے کے بعد ان عاشقانہ اشعار پر اس نے ان چند نصیحت آمیز اشعار کا اضافہ کیا۔

---

(۱) معجم الادباء ج ۴ ص ۲۲۲، ۲۲۳۔ (۲) واہیات ہونے کی وجہ سے ان کا ترجمہ ترک کر دیا گیا۔

یا قادرا لیس یعفو حین یقتدر ما ذالذی بعد شیب الراس تنتظر
عاین بقلبک ان العین غافلة عن الحقیقة واعلم انها سقر
سوداء تزفر من غیظ اذاسعرت للظالمین فما تبقی ولا تذر
لولم یکن لک غیر الموت موعظة لکان فیه عن اللذات مزدجر

ترجمہ: ''اے وہ قدرت رکھنے والے شخص جو انتقام کی قدرت رکھنے کی حالت میں معاف ہی نہیں کرتا، اب تو بڑھاپے کے بعد کس چیز کا انتظار کررہا ہے۔

تو اپنے دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر، کیونکہ یہ چشم ظاہر تو حقیقت سے بے خبر ہے اور تو سمجھ لے کہ یہ دنیا دوزخ ہے جو سیاہ فام ہے اور جو غصہ کے مارے پھنکاریں مار رہی ہے اس دوزخ کو جب ظالموں کے لئے گرم کردیا جائے گا تو یہ کسی ایک چیز پر نہ رحم کھائے گی اور نہ اس کو باقی رہنے دے گی۔

اگر تیرے لئے موت کے سوا اور بھی نصیحت و پند نہ ہو تو یہی لذتوں سے روکنے کے لئے تجھ کو کافی ہے۔''

ابن عبدربہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو عبرت ونصیحت کے اشعار اس میں کثرت سے پائے جاتے ہیں جس میں اس نے دنیا کی بے ثباتی اور اس زندگی کے بے حقیقی اور ناپائیداری کا بہت موثر الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے۔

الا انما الدنیا غضارہ ایکة اذا اخضر منها جانب جف جانب
هی الدارما الأمال الافجائع علیها ولا اللذات الامصائب
وکم اسخنت بالامس عینا قریرة وقرت عیون دمعها الأن ساکب
فلا تکتحل عینیک منها بعبرة علی ذاهب منها فانک ذاهب

ترجمہ: ''ہاں سن لو کہ دنیا کی مثال درخت جھاؤ کی سرسبزی وشادابی کی سی ہے کہ جب اس کی ایک جانب سبز ہوتی ہے تو دوسری جانب خشک ہو جاتی ہے۔

یہ دنیا ایک ایسا گھر ہے جس کی آرزو میں محض پریشانیاں ہیں اور جس کی لذتیں صرف مصیبتیں ہیں۔

اس دنیا نے کل کتنی ٹھنڈی آنکھوں کو (رنج وغم سے) گرم کردیا اور کتنی ٹھنڈی آنکھیں ہیں جن کے آنسو اب بہہ رہے ہیں پس اگر کوئی اس دنیا سے چلا گیا ہے تو اس کے غم سے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا سرمہ مت لگا، کیونکہ تو خود بھی جانے والا ہی ہے۔''

العقد الفرید:

اس میں شبہ نہیں جیسا کہ مذکورۂ بالا منتخب اشعار سے واضح ہوتا ہے ابن عبدربہ عربی کا بہت باکمال شاعر تھا، لیکن اس کی شہرت زیادہ تر نظم کے بجائے نثر میں ہے۔ نثر میں اس کی مشہور اور ضخیم کتاب ''العقد الفرید'' عربی لٹریچر میں ایک نہایت بلند و وقیع مرتبہ رکھتی ہے صاحب بن عباد جو خود عربی زبان کا بلند پایہ انشا پرداز اور ادیب تھا اس نے اس کتاب کا سماع کیا تو از راہ اشتیاق و قدردانی اس کا ایک نسخہ حاصل کرکے اپنے کتب خانہ میں رکھا اور یہ الفاظ کہے ''ھذہ بضاعتنا ردت الینا'' یہ تو ہماری ہی پونجی تھی جو لوٹا کر ہم کو دیدی گئی ہے۔[1]

اس کتاب نے ابن عبدربہ کو شہرت و عظمت کے آسمان کا مہر منیر بنادیا اور ہر طرف اس کی علمیت و قابلیت، وسعت معلومات، زور انشا، اور فصاحت و بلاغت کے چرچے ہونے لگے۔ حمیدی کے الفاظ یہ ہیں ''ابوعمر کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا، دیانت اور پاکیزہ نفسی کے باوصف ادب میں اس کو ریاست و شہرت حاصل تھی لیل و نہار اس کے موافق تھے۔ علم کی ولایتوں میں اس کے نام کا سکہ چلتا تھا، وہ علم و ادب میں غیر معمولی کمال رکھنے کے باعث ہی گمنامی کے بعد سردار، اور فقر کے بعد صاحب ثروت اور مالدار ہوا فضیلت و ہنر میں اس کا عام چرچا تھا۔[2]

جرجی زیدان کی رائے ہے کہ العقد الفرید عربی ادب کی بہت اہم کتاب ہے اور وہ ایک خزانہ کا حکم رکھتی ہے۔[3] اس کتاب میں ان تمام علوم کا تذکرہ ہے جو ابن عبدربہ کے عہد میں رائج تھے۔ چنانچہ طب، موسیقی، اخبار و انساب، نعت، امثال، شعر و عروض، اور علم معانی و بیان سب ہی کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے بعض ابواب و فصول میں ایسی تاریخی چیزوں کا بھی

---

(۱) معجم الادباء، ج ۲ص ۲۱۴، ۲۱۵۔ (۲) ایضاً ص ۲۱۵۔ (۳) آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ص ۱۷۲۔

تفصیلی تذکرہ ہے جو اس بسط و تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے کسی کتاب میں نہیں لکھی گئی تھیں۔ مثلاً زیاد بن ابی سفیان، حجاج بن محمد بن یوسف الثقفی، اور خوارج، اور ان کے مختلف طبقات کا ذکر، عرب کے ایام کا تذکرہ بھی اسی تفصیل کے ساتھ ہے اس کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید، حدیث، تورات اور انجیل کے علاوہ اصمعی، ابوعبیدہ، جاحظ، ابن قتیبہ اور ابن الکلبی کی بھی تمام تصنیفات ابن عبدربہ کی پیش نظر تھیں۔ پھر ابن عبدربہ نے صرف عربی تصنیفات سے فائدہ نہیں بلکہ یونانی، ہندی، فارسی زبانوں سے جن کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا، ان کا بھی کافی مطالعہ کیا تھا۔ یہ کتاب مصر سے تین اور چار جلدوں میں کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

وفات:

کئی سال تک فالج کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۸ جمادی الاولیٰ ۳۲۸ھ کو تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور قرطبہ کے مقبرہ بنو العباس میں تدفین ہوئی۔

ابوعبداللہ یاقوت الحموی (۱) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یاقوت نام، ابوعبداللہ بن کنیت، نسلاً رومی تھا اور بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لقب شہاب الدین تھا۔

ولادت:

روم کے شہر حماۃ میں ۵۷۴ھ یا ۵۷۵ھ میں ولادت ہوئی۔

غلامی اور آزادی:

یاقوت کو بچپن میں ہی گرفتار ہو کر غلام بنالیا گیا اور فروخت کر دیا گیا۔ بغداد کے ایک بڑے تاجر نے جس کا نام عسکر بن ابی نصر الحموی تھا خرید لیا۔ عسکر لکھنا پڑھنا اور تجارتی حساب جانتا نہیں تھا۔

---

(۱) معجم الادباء کے طابع و ناشر نے کتاب کے شروع میں یاقوت الحموی کے جو حالات و سوانح لکھے ہیں وہ سب تاریخ ابن خلکان ج ۲ از ص ۲۱۰ تا ص ۲۱۴ اور شذرات الذہب ج ۵ از ص ۱۰۵ تا ۱۰۶ سے ماخوذ ہیں۔ یاقوت کے حالات کے لئے ہمارا ماخذ بھی یہی دونوں کتابیں ہیں۔

اس لئے اس نے یاقوت کو کاروبار میں مدد دینے کے لئے لکھنے پڑھنے کا کام مقرر کر دیا۔ یاقوت نے زیادہ عمر ہو جانے پر نحو اور لغت کی تعلیم حاصل کی اور ابؔ عسکر نے یاقوت کو تجارتی سفروں پر لگا دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یاقوت کو کیش اور عمان آنا جانا پڑتا تھا اور پھر وہ شام واپس آجاتا تھا۔ بہت دنوں تک یاقوت یہ کام انجام دیتا رہا لیکن سوئے اتفاق سے آقا اور غلام دونوں میں کسی بات پر ان بن ہوگئی اور آقا نے تنگ آکر غلام کو آزاد کر دیا۔ یہ واقعہ ۵۹۶ھ کا ہے۔

علمی مطالعہ:

آزاد ہونے کے بعد یاقوت نے کتابت کر کے معاش پیدا کرنی شروع کی جس میں اس کو بہت سی عمدہ اور مفید کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا کچھ مدت کے بعد جب عسکر کا غصہ فرو ہو گیا تو اس نے یاقوت کو پھر اپنے پاس بلا لیا اور اس کو کچھ دے دلا کر کیش کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیج دیا یاقوت اس سفر سے واپس آیا تو یہاں عسکر کا انتقال ہو چکا تھا۔ یاقوت نے کیش کے سفر میں جو کچھ نفع حاصل کیا تھا، اس کا ایک قلیل حصہ اپنے پاس رکھا اور اس کے علاوہ جو کچھ بچا وہ سب اپنے آقا کی بیوی اور اس کی اولاد کے سپرد کر دیا جس سے یہ سب لوگ راضی ہو گئے یاقوت کو جو کچھ ملا تھا اس کو اس نے راس المال بنا کر تجارت شروع کر دی اور اس تجارت میں کتابوں کو بھی شامل کر لیا۔

خارجی عقیدہ:

اس زمانہ میں یاقوت کی نظر سے چند خارجی عقائد و خیالات کی کتابیں گزریں جن سے یاقوت بہت زیادہ اثر پذیر ہوا۔ ۶۱۳ھ میں اس نے دمشق کے ایک بازار میں دکان کھول لی، اور یہیں اس کو ایک بغدادی سے مناظرہ کا اتفاق ہوا۔ اس مناظرہ میں یاقوت کی زبان سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں بعض نہایت ناشائستہ الفاظ نکل گئے۔ مسلمان ان الفاظ کو کب برداشت کر سکتے تھے ایک گروہ نے اس پر حملہ کر دیا اور اتنا زدوکوب کیا کہ وہ مرتے مرتے بچا، لیکن اب دمشق میں اس کا قیام دشوار ہو گیا۔ اور وہ یہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلا۔

دمشق کے حاکم کو یاقوت کی بدزبانی کا علم ہوا تو اس نے اس کے تعاقب میں اپنے گماشتے روانہ کر دیئے، لیکن یاقوت ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا، وہ دمشق سے فرار ہو کر حلب آیا۔ اور پھر یہاں سے جمادی الاخریٰ ۶۱۳ھ میں وہ موصل پہنچا، یہاں سے اربل اور اربل

سے خراسان میں داخل ہوا، خراسان پہنچ کر اس نے اپنا تجارتی کاروبار شروع کر دیا اور ایک مدت تک مرو میں قیام پذیر رہا۔ آخر کار اس کو یہاں سے بھی منتقل ہونا پڑا اور وہ نسا ہوتا ہوا خوارزم پہنچا۔ یہاں اس کو تاتاریوں کے حملے کی خبر ملی، جس نے اس کے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے۔

اب وہ پریشان ہو کر پھر موصل آیا۔ دوران سفر میں اس کو لباس وطعام کی تنگی نے بہت دل شکستہ کیا ایک مدت مدید تک موصل میں قیام کرنے کے بعد وہ سنجار آیا۔ اور پھر یہاں سے وہ حلب چلا گیا۔ جہاں آخری لمحۂ زندگی تک وہ مقیم رہا۔ مرو کے دوران قیام میں یاقوت نے اپنی کتاب معجم البلدان کے لئے بہت کچھ مواد فراہم کر لیا تھا لیکن اس کی تکمیل وزیر جمال الدین القفطی کی مدد سے حلب میں ہوئی۔

یاقوت کی قدر و منزلت:

حلب کے وزیر جمال الدین القفطی کو یاقوت سے بڑی ارادت تھی اور وہ یاقوت کے علمی او ادبی کمالات کی بڑی قدر کرتا تھا چنانچہ یاقوت نے وزیر کے نام موصل سے ایک طویل خط لکھا تھا جس کو علامہ ابن خلکان نے از اوّل تا آخر نقل کیا ہے اس خط میں یاقوت نے تاتاریوں کے ڈر سے موصل بھاگ آنے اور دوران سفر میں اس کو جو جو مشکلات پیش آئی ہیں ان سب کو بڑی تفصیل سے اور نہایت موثر پیرایہ میں قلمبند کیا ہے اس خط میں مرو کی علمی وادبی سہولتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

تصنیفات:

یاقوت نے چند در چند پریشان حالیوں اور شہر بشہر مارے مارے پھرتے رہنے کے باوجود کئی ضخیم کتابیں تصنیف کیں جن کی وجہ سے بقاء دوام کی لوح پر اس کا نام جلی حروف میں کندہ ہے۔ کتابوں کے نام اور ان کی کیفیت حسب ذیل ہے:

(۱) ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب۔ یہ کتاب عام طور سے **معجم الادبا یا طبقات الادباء** کے نام سے معروف ہے۔ کشف الظنون اور ابن خلکان میں اس کا نام "**ارشاد الالباء الی معرفۃ الادباء**" لکھا ہے۔ اس میں نحویوں۔ علماء لغت وقرأت، علماء اخبر وانساب اور ارباب نثر وانشاء کے اور جنہوں نے ادب میں تصنیفات کی ہیں ان سب کے حالات ہیں۔ یہ

کتاب پہلے پروفیسر مارگولیوتھ (D.S Margoliouth) استاذ عربی آکسفورڈ یونیورسٹی کے اہتمام سے سات اجزاء میں گب میموریل کی طرف سے شائع کی گئی تھی مگر اس میں متعدد نقائص رہ گئے تھے اب دوبارہ مزید اضافوں اور نہایت اہتمام کے ساتھ ڈاکٹر احمد فرید رفاعی کے زیر نگرانی مصر سے بیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) ''المشترک وضعا والمفترد صقعًا'' یہ کتاب شہروں کے حالات میں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یاقوت نے یہ کتاب اپنی تصنیف معجم البلدان سے ہی اخذ کر کے حروف کی ترتیب کے اعتبار سے لکھی ہے۔ پروفیسر سٹنفلڈ کے اہتمام سے ۱۸۴۶ء میں ۴۰۷ صفحات پر شائع ہوئی۔

(۳) ''معجم البلدان'' یہ جغرافیہ کی مشہور کتاب ہے جس میں شہروں، دیہاتوں ویرانوں آبادیوں کے جغرافیائی حالات ووقائع نہایت تفصیل وتحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ یاقوت اس کتاب کی تصنیف سے ماہ صفر ۶۲۱ھ میں حلب میں فارغ ہوا تھا اور اس کو جمال الدین القفطی وزیر حلب کے کتب خانہ کے لئے نذر کر دیا تھا پہلے یہ کتاب چھ اجزاء میں وسٹنفلڈ کے زیر اہتمام لیپزگ سے شائع ہوئی تھی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ چھٹے جز میں شہروں کے قبیلوں اور عورتوں اور مردوں کے ناموں کی فہرست ہے جو بارہ ہزار سے زیادہ ناموں پر مشتمل ہے۔اس کے بعد دوسری مرتبہ یہ کتاب دس اجزاء میں سید امین الخانجی کے زیر اہتمام مصر سے شائع ہوئی ہے۔اس میں ایک ذیل بھی ہے جو دو جلدوں میں ہے، جس کا نام ''منجم العمران فی المستدرک علی المعجم البلدان'' ہے جس میں صاحب ذیل نے موجودہ زمانہ کے مشہور مقامات، نیز یورپ و امریکہ کے ملکوں اور شہروں کے حالات درج کر دیئے ہیں اور اپنی معلومات کی بنیاد جدید علماء جغرافیہ کے بیانات وتحقیقات پر رکھی ہے۔[1]

ان کتابوں کے علاوہ علامہ ابن خلکان نے یاقوت کی کئی اور کتابوں کے بھی نام لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب المبدء والمآل فی التاریخ. (۲) کتاب الدول.
(۳) مجموع کلام ابی علی الفارسی. (۴) عنوانا کتابا الاغانی.
(۵) المقتضب فی النسب. (۶) کتاب اخبار المتنبی.

---

(۱) معجم المطبوعات ج ۱۰ ص ۱۹۴۲۔

یاقوت کے علمی کارناموں پر مختصر تبصرہ:

یاقوت کے عمیق ذوقِ مطالعہ اور اس کے تبحرِ فن کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ اس کو کسی ایک مقام پر بھی اطمینان سے ٹھہرنے کا موقع نہیں ملتا تاہم اس نے اپنا مطالعہ برابر جاری رکھا۔ اس کی دو ضخیم کتابیں ''معجم الادباء'' اور ''معجم البلدان'' ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ان کو دیکھ کر یہ بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ یاقوت غیر معمولی قوت انشآء، وسعت علم، اور مہارت ادبیات کا مالک تھا۔ یاقوت کو صرف مرو میں کسی قدر اطمینان سے قیام کا موقع ملا تھا۔ اس نے ان لمحات فرصت کو ضائع نہیں جانے دیا۔ اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا چنانچہ وہ خود کہتا ہے:

> ''میں نے مرو کے قیام کے زمانہ میں علوم و آداب کی، اور ارباب فہم و خرد کی ایسی کتابیں پائیں جنہوں نے مجھ کو بال بچوں اور وطن کی یاد سے، اور اپنے دوستوں اور ہر قسم کی راحت و آسائش کے خیال سے بے پروا کر دیا۔ یہاں مجھ کو گویا میری دولت گمشدہ مل گئی اور میں نے اپنا مقصد دیرینہ حاصل کر لیا، میں ایک حریص اور للچائے ہوئے انسان کی طرح ان کتابوں کے مطالعہ پر متوجہ ہو گیا۔ میں ان کتابوں کی چراگاہوں میں لطف اندوز ہوتا پھرتا تھا اور اس لطف و راحت سے بہرہ ور ہوتا تھا۔'' (۱)

معجم الادباء کے شروع میں یاقوت نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ شعراء و ادباء کے حالات میں مجھ سے پہلے بھی متعدد علماء ادب و انشاء نے کتابیں لکھی ہیں، مگر وہ سب ناتمام ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس خوبی سے یاقوت علماء و ادباء کے حالات اور ان کے نمونہائے کلام بیان کرتا ہے اس طرح اس سے پہلے کسی اور مصنف نے بیان نہیں کئے۔ چنانچہ آج بھی علماء ادب و انشاء کے حالات میں سب سے بڑا ذریعہ معلومات یہی کتاب ہے۔ پھر اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یاقوت نے محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو کچھ لکھا ہے بکمال تحقیق اور غایت ژرف نگاہی سے لکھا ہے۔ ایک ایک ادیب کے حالات کی تحقیق میں اس نے شہر بشہر پھر کر سیکڑوں لوگوں سے ملاقات کی ہے اور پھر اس کا سنہ پیدائش و وفات اور دوسرے احوال، وسوانح جامعیت سے قلمبند کئے ہیں۔ وہ مقدمہ میں خود کہتا ہے:

---

(۱) ابن خلکان، ج۲، ص۴۲۔

''میں نے اس کتاب میں علماء نحو ولغت، علماء انساب، مشہور قراء، علماء تاریخ واخبار، مورخین، مشہور نساخ، معروف انشا پرداز، ارباب تصنیف وتالیف ان سب کے حالات اختصار وایجاز کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں اور میں نے تاریخہائے پیدائش ووفات اوران کی تصانیف کے ذکر میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان چیزوں کے ساتھ میں نے ان ادباء کے پسندیدہ احوال، ان کے نسب نامے اوران کے اشعار بھی لکھے ہیں، وہ ادباء جن سے میں نے خود ملاقات کی ہے، یا جن سے ملاقات کرنے والوں سے مجھ کو ملاقات کا موقع ملا ہے ان کے احوال اور حقائق اخبار تو میں نے اس طرح قلمبند کئے ہیں کہ اس کے بعد آپ کو کسی اور چیز کے معلوم کرنے کا شوق ہی باقی نہیں رہے گا۔ رہے وہ ادباء وفضلاء جن کا عہد میرے عہد سے پہلے گزر چکا ہے تو ان کے حالات کی تحقیق میں میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے شہر بشہر اور ملک بملک کے سفروں میں لوگوں سے مل کر جو تحقیق وتفتیش کر سکتا تھا میں نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ایسے اصحاب سے متعلق معلومات کے اخذ کرنے میں میں نے مستند علماء کی کتابوں پر اعتماد کیا ہے۔'' (۱)

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یاقوت نے اس کتاب میں کسی خاص عہد اور کسی خاص ملک کے ادباء کا ہی نہیں بلکہ بصرہ کوفہ، بغداد، خراسان، حجاز، یمن مصر شام اور مغربی ممالک ان سب کے اور ہر زمانہ کے علماء وادباء کا تذکرہ کیا ہے۔

یاقوت نے چونکہ اس کتاب کو نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا تھا۔ اس لئے وہ اسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ چند افاضل کی جماعت اس کے پاس آئی اور درخواست کی کہ اپنی کتاب کے نسخے لکھوا دیجئے۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ یاقوت نے اس واقعہ کو ایک نظم میں نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے آخر شعر میں کہتا ہے:

وامنعها الجهال فهي حبيبة   جرىٰ حبها مجرىٰ دمى فى مفاصل

ترجمہ: ''میں اس کو جاہلوں سے باز رکھتا ہوں کیونکہ یہ مجھے اس قدر محبوب ہے کہ اس کی محبت خون کی طرح میرے بدن کے جوڑوں میں جاری وساری ہے۔''

---

(۱) مقدمہ معجم الادباء ص ۴۹۔

ایک اور نظم میں اس کتاب کے ساتھ اپنی غیر معمولی محبت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

ولو انني انصفته في محبتي | لجلدته جلدي وصندقته عظمي
عزيز على فضلي بالا اطيعه | على بدله للطائفين على العلم
ولو انني استطيع من فرط حبه | لما زال من كفي ولا غاب من كمي

ترجمہ: ''اگر میں اس کتاب کی محبت میں انصاف سے کام لیتا تو اپنی جلد کو اس کی جلد اور اپنی ہڈیوں کو اس کا صندوق بنا دیتا، کتاب مجھ کو اپنے فضل کے باوجود اس درجہ عزیز ہے کہ میں طلبائے علوم کے لئے اس کو خرچ کر ہی نہیں سکتا، اس کتاب کی فرطِ محبت کی وجہ سے اگر میں استطاعت رکھتا ہوتا تو یہ کبھی میرے ہاتھ اور میری آستین سے غائب نہیں ہوتی۔''

اس کتاب میں جن حضرات کے حالات لکھے گئے ہیں ان کی تعداد ایک ہزار پچاس کے قریب ہے۔

دوسری اہم کتاب معجم البلدان ہے۔ مصنف کو اس کے لکھنے کا خیال ایک عجیب واقعہ کی بناء پر پیدا ہوا جس کو خود اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ۶۱۵ھ میں جبکہ یاقوت مرو میں قیام پذیر تھا، ایک دن شہید فخر الدین کی مجلس میں شریک تھا کہ وہاں کسی شخص نے لفظ ''حُبَاشه'' کی نسبت سوال کیا (یہ لفظ ایک حدیث میں آیا ہے اور عہد جاہلیت عرب میں جو بازار لگتے تھے ان میں سے ایک بازار کا نام ہے) یاقوت نے جواب دیا، یہ لفظ ''حباشه'' کے معنی جمع کرنے کے آتے ہیں، اس لئے فُعَالَةٌ کے وزن پر ''حُبَاشه'' بضم الحاء کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں مختلف قبیلے اکٹھے ہو گئے ہوں لیکن ایک محدث جو اس وقت وہاں موجود تھے انہوں نے یاقوت کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس پر ہی مصر رہے کہ یہ لفظ حَباشه ہے حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں تھی۔ اب یاقوت کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ غرائب احادیث اور دواوین لغات سے اپنے دعوے کی کوئی سند پیش کرے۔ مرو میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، یاقوت نے تلاش شروع کر دی اور آخر کار محنت بسیار کے بعد اسے اپنے دعوے کی قوی دلیل مل گئی۔ اس معاملہ میں یاقوت کو کامیابی تو حاصل ہو گئی لیکن اسی وقت سے اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ عوام تو عوام علماء تک کو ایک

ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جس میں دنیا کا جغرافیہ مع شہروں، دیہاتوں قصبوں اور پہاڑوں وغیرہ کے ناموں کی تصحیح کو صحیح صحیح بیان کیا گیا ہو چنانچہ یہ کتاب بھی معجم الادباء کی طرح حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے اس میں پہلے مصنف لفظ کا صحیح تلفظ بتاتا ہے پھر اس کا جائے وقوع اور دوسری ضروری جغرافیائی معلومات بہم پہنچاتا ہے اور موقع بموقع اس مقام کی مناسبت سے اشعار نقل کر کے ایک خشک علمی موضوع کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

یاقوت نے معجم البلدان کے شروع میں بھی ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں جغرافیہ کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں لکھتا ہے کہ عالم خواہ کسی مرتبہ اور درجہ کا ہو اس کو جغرافیہ کا جاننا از بس ضروری ہے۔ تمثیلاً یاقوت نے اپنے زمانہ کے ایک نامور ادیب کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے مقامات حریری کی شرح بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھی ہے، اور جن کے ادیب کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس ادبی مہارت کے باوجود انہوں نے اپنی شرح میں ایسی جغرافیائی غلطیاں کی ہیں جن کے باعث ان کا اصل کمال بھی چھپ گیا اور خود ارباب فن کے لئے سامان تمسخر بن کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً مقامہ کرجیہ میں شارح فاضل لکھتا ہے کہ کرج ہمدان اور آزربیجان کے درمیان ایک شہر ہے حالانکہ یہ غلط ہے، بلکہ وہ ہمدان اور اصفہان کے درمیان ہے۔ اسی طرح تبریزیہ مقامہ میں شارح نے لکھا ہے کہ تبریز عواصم شام سے ہے اور اس میں اور بنج میں بیس فرسنگ کا فاصلہ ہے شارح کا یہ لکھنا بھی غلط ہے کہ تبریز تو بہت مشہور شہر ہے اور ہمارے زمانہ میں وہ آزربیجان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے غرض یہ ہے شارح مقامات نے اپنی جلالت علم وادب کے باوجود جغرافیہ دانی کے میدان میں قدم قدم پر ایسی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

یاقوت نے اس کتاب کو بھی انتہائی امکانی تحقیق اور سعی کاوش سے مرتب کیا ہے "معجم العمران" کے فاضل مرتب سید محمد امین الخانجی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ گزشتہ سالوں اور دنوں کے کسی شخص کی نسبت غلطی سے محفوظ رہنے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف ابوعبداللہ یاقوت الحموی الرومی کی ذات ہے۔[1]

وفات:

پہلے معلوم ہو چکا ہے یاقوت آخر میں حلب میں فروکش ہو گیا تھا۔ یہیں اس کو فرشتہ اجل کا پیغام پہنچا، اتوار کے دن ۲۰ رمضان ۹۲۶ھ کو وفات پائی۔ وفات سے قبل یاقوت نے اپنا کتب خانہ بغداد کی مسجد الزیدی کے لئے وقف کر کے اس کی کتابیں تاریخ ابن اثیر کے مشہور فاضل مصنف شیخ عزالدین ابوالحسن علی بن الاثیر کے سپرد کر دی تھیں۔ زندگی میں تو یاقوت کی کچھ ایسی زیادہ قدر نہیں ہوئی البتہ وفات کے بعد لوگ اس کے فضل و ادب کا ذکر کر کے اس کا ماتم کرتے تھے اور اس کی ثناء کے گیت گاتے تھے۔

---

(۱) خطبۃ الکتاب معجم البلدان ج ۹۔

ابوالدّر یاقوت بن عبداللہ الرومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نام ونسب:

یاقوت نام، ابوالدر کنیت، والد کا نام عبداللہ تھا لقب مہذب الدین تھا، نسلاً رومی تھا لیکن سن شعور وتمیز کو پہنچنے کے بعد اس نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا تھا۔ چنانچہ ابن ذہبی نے کتاب الذیل میں اس کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جن کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ابومنصور الجیلی کا غلام تھا۔

پیدائش اور تعلیم:

بغداد میں پیدا ہوا اور یہیں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہو کر پہلے قرآن مجید حفظ کیا، خط کی مشق کی اور علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی، عربی ادب سے اس کو قلبی لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس کو نہایت محنت وشوق سے حاصل کر کے اس میں اتنا کمال بہم پہنچایا کہ آج اس کا شمار عربی کے بہترین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔

شاعری:

علامہ ابن خلکان اس کی نسبت لکھتے ہیں "یاقوت نے اشعار کثرت سے کہے ہیں اس کے اشعار زیادہ تر حسن وعشق کے رموز، اور محبت والفت کے واردات قلبی پر مشتمل ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں یہ اشعار عراق، اور بلاد شرق وشام میں بہت رائج ہیں۔ اور شام کے فقہاء تک انہیں کثرت سے پڑھتے ہیں۔

یاقوت کی خصوصیت زبان کی سلاست، انداز بیان کی دلکشی اور بے ساختگی ہے وہ بعض پیش پا افتادہ مضامین کو اس خوبی اور جدت ادا سے بیان کرتا ہے کہ سننے والے پر ایک عجیب کیفیت سکر طاری ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک نظم میں کہتا ہے:

ان غاض دمعک فالا حباب قدبانوا　　فکل ماتدعی زورٌ وبھتان

وکیف تأنس اوتنسٰی خیالھم　　وتدخلا منھم رَبُعٌ واوطان

لا اوحش اللہ من قوم ناوُافنای　　عن النواظر اقمارٌ واعضان

ساروا فسارفوادی اثرظعنھم　　وبان جیش اصطباری ساعۃ بانوا

ترجمہ: ''جتنے دوست تھے سب چلے بھی گئے۔اب اگر تیرے آنسو خشک
ہو جائیں تو تیرے تمام دعوے سراسر جھوٹے اور گپ ہیں۔
تو کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے یا کس طرح ان احباب کے خیال کو
بھول سکتا ہے جبکہ ان سے مکانات اور وطن دونوں خالی ہو گئے۔
خدا اس جماعت سے متوحش نہ کرے جو ہم سے دور ہوگئی اور جس کے دور
ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا کتنے ہی چاند اور لچکتی ہوئی ڈالیاں
نظروں سے اوجھل ہوگئی ہیں۔
جب وہ چلے تو دل ان کے پیچھے پیچھے سے چل پڑا اور جس گھڑی وہ جدا
ہوئے میرے صبر کا لشکر بھی مجھ سے جدا ہو گیا۔''

یاقوت صاحب دیوان شاعر تھا علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''مجھ کو ۶۶۷ھ میں دمشق کے قیام میں یاقوت کے دیوان کے دو نسخے ملے تھے۔ یہ دیوان زیادہ ضخیم نہیں ہے۔

وفات:

یاقوت کی وفات کا واقعہ عجیب قسم کا ہے اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی کہ بدھ کے دن بتاریخ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۶۲۲ھ کو اسے ایک مکان میں مردہ پایا گیا۔ [۱]

---

(۱) یہ سب حالات ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۸، ۲۰۹ سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

* خطبات بہاولپور
* پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
* محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت پاک)
* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی و جانشینی
* دنیا کا قدیم ترین مجموعۂ حدیث (صحیفہ ہمام بن منبہ)
* نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (اوّل، دوم)
* ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کی بہترین تحریریں

* رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم — سید سلیمان ندویؒ
* تعلیم الاسلام — حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ
* رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولاتِ شب و روز — امام احمد بن شعیب النسائیؒ
* اللہ تعالیٰ کے اندازِ بخشش — علامہ ابن ابی الدنیاؒ / مترجم: زاہد محمود قاسمی
* خاموشی کی فضیلت اور زبان کی حفاظت — علامہ ابن ابی الدنیاؒ / مترجم: زاہد محمود قاسمی
* بخشش کی راہیں — علامہ ابن ابی الدنیاؒ / مترجم: زاہد محمود قاسمی
* دُعا: مؤمن کا ہتھیار — زاہد محمود قاسمی
* فضائلِ اعمال — شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ
* اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم — ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ
* تحفۂ خواتین — مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہریؒ
* ہدایت کے چراغ — خواجہ عبدالحی فاروقی، علامہ زاہد محمود قاسمی

SHAKHSIAT Rs.390
000003 019344
Ghulaman e Islam

اسلام - تاریخ

بیکن بُکس

* غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 042-37320030
* گلگشت، ملتان فون: 061-6520790, 6520791

info@beaconbooks.com.pk
www.beaconbooks.com.pk

BEACON BOOKS